عورتوں کے امتیازی مسائل و قوانین

حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ

عورتوں کے
امتیازی مسائل و قوانین
حکمتیں اور فوائد

سعودی عرب (ہیڈ آفس)

پوسٹ بکس: 22743 الرّیاض: 11416 سعودی عرب

فون: 4033962-4043432 1 00966 فیکس: 4021659

E-mail: *darussalam@awalnet.net.sa*

Website: *www.dar-us-salam.com*

---

❶ طریق مکہ۔ العلیا۔ الرّیاض فون: 4614483 1 00966 فیکس: 4644945

❷ شارع الاربعین۔ الملز۔ الرّیاض فون: 4735220 فیکس: 4735221

❸ جدّہ فون: 6879254 2 00966 فیکس: 6336270

❹ الخُبر فون: 8692900 3 00966 فیکس: 8691551

شارجہ فون: 5632623 6 00971 فیکس: 5632624

پاکستان (ہیڈ آفس و مرکزی شوروم)

❶ 36- لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ، لاہور

فون: 7110081-7111023-7232400-7240024 42 0092

فیکس: 7354072 **E-mail:** *darussalampk@hotmail.com*

❷ غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور فون: 7120054 فیکس: 7320703

❸ اُردو بازار گوجرانوالا فون: 741613-431-0092 فیکس: 741614

لندن فون: 5202666 208 0044 فیکس: 5217645 208

امریکہ ❶ ہیوسٹن فون: 7220419 713 001 فیکس: 7220431

❷ نیو یارک فون: 6255925 718 001 فیکس: 6251511

عورتوں کے امتیازی مسائل و قوانین

حکمتیں اور فوائد

حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ

دار السلام
کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
ریاض • جدہ • شارجہ • لاہور
لندن • ہیوسٹن • نیویارک
دار السلام DARUSSALAM

فہرست مضامین

عرضِ ناشر

کسی معاشرے اور تمدن کی محکم اساس ازدواجی تعلقات کے حسن اور کمال پر منحصر ہے۔ اسلام اس بنیاد کو ان تعلیمات کی روشنی میں پیش کرتا ہے' جو کتاب و سُنّت کے پاکیزہ اور مستند ماخذ سے ملتی ہیں۔ یہی باعث ہے کہ اسلامی تہذیب میں عورت کو ایک خاص شرف اور عزت کا درجہ عطا کیا گیا ہے۔ اس کی پیدائش پر اس کی تربیت کا ایک خاص نصاب اور نظام ہے' جو ان پر اس کے لیے عفت و عصمت کے ساتھ نکاح جیسی تقریب کے حوالے سے ایک دوسرے خاندان کی تشکیل کی ذمے داری عاید ہوتی ہے۔ ماں کی حیثیت سے وہ ایک صحت مند اور حیا دار نسل کو اسلامی معاشرے کے سپرد کرتی ہے۔ بخلاف اس کے مغربی تہذیب اور معاشرے میں عورت کا ماضی اور حال ابھی تک ایک مظلومیت کی تصویر پیش کرتا ہے۔ وہاں بچیوں اور طالبات کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے' آزادہ روی کے ساتھ میل ملاپ کے کیا نتائج مرتب ہو رہے ہیں' نیز فرنگی مدنیت کے دوسرے اوضاع و اطوار میں کیا کیا فساد رونما ہے' ان سب حقائق سے خود اہل مغرب پردہ اٹھا رہے ہیں اور ان اطلاعات کا ایک کمزور اور قلیل حصہ ذرائع ابلاغ کے ذریعے سے ہم تک منتقل ہوتا ہے' جسے پڑھ یا سن کر ایک درد مند مسلمان فقط یہی کہہ سکتا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

اسلام نے عورت کو ایک ایسا مقام دیا ہے اور اس کے لیے حقوق و رعایات کا ایسا سامان فراہم کیا ہے کہ جس کی مثال تاریخ کے اوراق بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ بالخصوص وراثت کے احکام میں تو مردوں کے حصے کا تعین کرنے کے لیے عورت کے حصے کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ اگر شریعت کے مجموعی مزاج کو پیش نظر رکھا جائے تو وراثت میں بیٹے کی نسبت بیٹی کو نصف حصہ ملنے کا قطعی جواز سامنے آ جاتا ہے۔ اس کا اندازہ محض اس بات سے لگائیے کہ گھر کی

معاشی ذمہ داریاں' اہل خانہ کی خوراک و پوشاک' بچوں کی تعلیم و تربیت' ان کا صحت و معالجہ نیز ان کے شادی و نکاح کے معاملات عورت کے نہیں مرد کے ذمے ہیں۔ جس سے مرد کی جائداد تو مسلسل کم ہوتی رہے گی مگر عورت کا حصہ نہ صرف برقرار رہے گا بلکہ بعض حالات میں اس کی حقیقی منفعت مرد کے حصے سے بڑھ جائے گی۔ ذرا سوچئے تو سہی اگر وہ بیٹی ہے تو اس کی کفالت والدین کے ذمے ہے' اگر بیوی ہے تو اس کی کفالت شوہر کی ذمہ داری ہے اور اگر ماں ہے تو اولاد اس کے لیے سامان راحت فراہم کرے گی' اگر بہن ہے تو بھائی اس کی نگہداشت اور ضروریات کے خواہاں ہوں گے۔ یوں عورت زندگی کے کسی درجے میں اور عمر کی کسی سطح پر کسی درجے کی معاشی یا معاشرتی پریشانی کا شکار نہیں ہوتی۔ حفاظت و عافیت کا یہ حصار' اسلام کے علاوہ کوئی دوسری تہذیب فراہم نہیں کرتی۔

بدقسمتی سے بعض اسلامی ممالک میں بعض علاقوں کے علاقائی رسوم و رواج کو اسلامی تہذیب و معاشرت کی اقدار و روایات سمجھ لیا گیا ہے' حالانکہ شریعت سے متصادم یہ روایات سراسر جہالت پر مبنی ہیں۔ اگر حقیقی اسلام کو سمجھا جائے اور شریعت کے ضوابط کو پیش نظر رکھا جائے تو معاشرتی زندگی میں جو حقوق اسلام عورت کو عطا کرتا ہے' وہ کسی دوسری تہذیب میں ممکن نہیں۔ مرد کے طلاق کے حق کے مقابلے میں عورت کو خلع کا حق عطا کرنا' عدل کی بہترین صورت ہے۔ شادی کے موقع پر عورت کے لیے مہر کی ادائیگی حسن سلوک کا بہترین عمل ہے۔ شادی پر ولیمے کی تقریب کا انعقاد' اس کے استقبال کا بہترین نقشہ ہے۔ پھر قرآن مجید نے ان دونوں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس قرار دے کر ان کی سماجی حیثیت کا تعین کر دیا ہے۔

آج دنیا میں حقوق نسواں کے نام پر بڑی بڑی تحریکیں اٹھائی جا رہی ہیں مگر عورت سے بڑھ کر کوئی مظلوم نہیں۔ اسلام نے عورت کے لیے جو حدودِ کار قائم کی ہیں۔ ان میں عزت اور عافیت کا انتظام ہے۔ اس نے عبادت' وراثت' نکاح اور شہادت جیسے موضوعات پر جن ضوابط کا تعین کیا ہے' وہ سب عورت کے صنفی حالات اور نسوانی فطرت کے عین مطابق ہے۔

خواتین کے امتیازی مسائل و قوانین کی حکمتوں اور فوائد پر یہ کتاب ممتاز دینی سکالر حافظ صلاح الدین یوسف صاحب کے قلم کا شاہکار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے مطالعے سے مغربیت زدہ لوگوں کا اٹھایا ہوا وہ گرد و غبار کافور ہو جائے گا' جو اسلامی تعلیمات سے بے خبری کے نتیجے میں پھیلایا جا رہا ہے۔

دارالسلام نے اسے طباعت کے عمدہ معیار پر پیش کیا ہے۔ میں کتاب کے مصنف اور دارالسلام کے عملہ کی ان کاوشوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے بہترین اجر کی دعا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس علمی کاوش کو عامۃ المسلمین کے لیے مفید بنائے۔ آمین یا رب العالمین۔

عبدالمالک مجاہد

مدیر: دارالسلام' الریاض' لاہور۔

عرضِ مؤلّف

زیرِ نظر کتاب ''عورتوں کے امتیازی مسائل و قوانین'' راقم کے مختلف اوقات میں تحریر کیے گئے مضامین کا مجموعہ ہے۔ مثلاً' عورت کی سربراہی کا مسئلہ' جو اس کتاب میں شامل ہے' ان مضامین پر مشتمل ہے جو پہلی مرتبہ بے نظیر کے پاکستان کے وزیراعظم (یا وزیرۂ عظمیٰ) بننے کے فوراً بعد تحریر کیے گئے تھے' اسی لیے اس کے جواز میں اس وقت جو جو ''دلائل'' یا مغالطات و شبہات پیش کیے گئے' ان مضامین میں ان پر بحث و تبصرہ ہے۔ اسی طرح جنرل ضیاء الحق کے دور میں جب حدود و قصاص کا آرڈی نینس نافذ کیا گیا' جس میں عورت کی گواہی کو مرد کی گواہی کے مقابلے میں نصف قرار دیا گیا' جیسا کہ شرعی دلائل کی رُو سے علمائے اسلام کا موقف ہے' تو مغرب زدہ طبقے نے اس کے خلاف بہت شور مچایا اور عورت کی توہین قرار دیا' حتیٰ کہ اس نے آرڈی نینس کی اس شق کو شرعی عدالت میں چیلنج کر دیا۔ راقم نے اس وقت شرعی عدالت کی درخواست پر اس پر ایک مفصل مقالہ تحریر کیا تھا' اس کا ایک حصہ بھی اس کتاب میں شامل ہے۔

عورت کی نصف میراث پر سندھ ہائی کورٹ کے ایک جج نے ژاژخائی کی تھی اور اپنے ذہنی ارتداد کا اظہار کیا تھا' اس پر بھی راقم نے ایک تبصرہ کیا تھا۔ اسی طرح دیگر وہ مضامین ہیں جن میں مرد و عورت کے درمیان شریعت کے امتیاز کردہ احکام و مسائل پر بحث اور اس فرق و امتیاز کی ان حکمتوں کا بیان ہے جو ان میں پنہاں ہیں اور ان حکمتوں اور فوائد ہی کی وجہ سے اسلام کی تعلیمات' دیگر مذاہب و ادیان سے مختلف اور ممتاز ہیں۔ اس قسم کے ۱۵ مسائل ہیں جو اس کتاب میں شامل ہیں' یہ سب وہ مسائل ہیں جن میں شریعت اسلامی نے مرد اور عورت کے درمیان امتیاز کیا ہے۔ ان مَابِهِ الْاِمْتِیَاز مسائل میں یہ فرق کیوں ہے؟ ان میں کیا حکمتیں ہیں؟ یہی اس کتاب کا موضوع ہے۔

مغربی استعمار کا اس وقت جو سیاسی استبداد اور فکری استیلاء ہے' اس کی وجہ سے اس کی کھوکھلی اور بے حیا تہذیب کا اثر و نفوذ بھی عالم اسلام میں روز افزوں ہے' حالانکہ اس مغربی تہذیب کا اسلامی تہذیب سے قدم قدم پر ٹکراؤ ہوتا ہے' لیکن بدقسمتی سے اسلامی ملکوں پر جو قیادت مسلط ہے چاہے وہ فوجی ہو یا سیاسی۔ ان کی فکر و نظر کے سوتے مغربی ہیں' ان کا ذہنی سانچہ کارگہ مغرب کا ڈھلا ہوا ہے اور وہ از فرق تا بہ قدم مغربیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس لیے انہوں نے وہی تعلیمی نصاب' سکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مسلط کیا ہوا ہے جو مسلمانوں کو مسلمان نہ رہنے دینے کے لیے ان کے ایک مفکر لارڈ میکالے نے برصغیر پاک و ہند کے باشندگان کے لیے تجویز کیا تھا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی نسل نو اپنے پُر حکمت دین اور اس کی نہایت بہترین تعلیمات سے متنفر اور بیزار اور مغربی تہذیب کی والہ و شیدا ہے۔

عورتوں کے ان امتیازی مسائل و قوانین پر بھی یہ طبقہ چیں بہ جبیں ہوتا' ناک بھوں چڑھاتا اور انگشت نمائی کرتا رہتا ہے۔ بنابریں ضرورت محسوس ہوئی کہ اسلام کی مذکورہ ممتاز تعلیمات کے امتیازات اور ان کی خوبیوں اور حکمتوں کو واضح کیا جائے اور ان اعتراضات کا جائزہ لیا جائے جو ساحرانِ مغرب کے آفسوں کے شکار اور شاہدانِ یورپ کے عشوہ طرازیوں کے اسیر حضرات کی طرف سے ان تعلیمات پر کیے جاتے ہیں' تاکہ واضح ہو جائے کہ یہ عورت کے خلاف امتیازی مسائل نہیں' بلکہ مسلمان عورت کا امتیاز اور تشخص بھی انہی تعلیمات کی بدولت ہے اور اس کے احترام و تقدس کی ضامن بھی یہی تعلیمات ہیں ؎

وہی دیرینہ بیماری' وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی (بال جبریل)

ارشادِ باری تعالیٰ

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ

''اور اپنے گھروں میں قرار (عزت ووقار) سے رہو، پہلے دورِ جاہلیت کی طرح اپنی زیب وزینت کی نمائش نہ کرتی پھرو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔'' (الاحزاب:۳۳)

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝

''یقیناً مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، ایمان دار مرد اور ایمان دار عورتیں، فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں، سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں، صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں، خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں، اپنے نفس کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنے نفس کی حفاظت کرنے والی عورتیں، بہ کثرت اللہ کا ذکر کرنے والے مرد اور اللہ کا ذکر کرنے والیاں، اِن سب کے لیے اللہ نے وسیع مغفرت اور بہت بڑا اَجر تیار کر رکھا ہے۔'' (الاحزاب: ۳۵)

مُقدّمَه

اسلام سے قبل عورت کی جو حالت تھی' محتاجِ وضاحت نہیں۔ اہل علم اس سے پوری طرح باخبر ہیں۔ اسلام نے اسے قعرِ مذلت سے نکالا اور عزت و احترام کے مقام پر فائز کیا۔ وہ وراثت سے محروم تھی' اسے وراثت میں حصے دار بنایا۔ نکاح و طلاق میں اس کی پسندیدگی و ناپسندیدگی کا قطعاً کوئی دخل نہ تھا' اسلام نے نکاح و طلاق میں اسے خاص حقوق عطا کیے۔ اسی طرح اسے تمام وہ تمدنی و معاشرتی حقوق عطا کیے جو مَردوں کو حاصل تھے۔ عورت کی بابت اسلامی تعلیمات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

عورت کے شرف و وقار کے تحفظ کیلئے اسلامی تعلیمات کا خلاصہ : ۱۔ بحیثیت انسان کے عورت بھی مرد ہی کی طرح انسانی شرف و احترام کی مستحق ہے۔ اس لحاظ سے مرد و عورت کے مابین کوئی فرق نہیں۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو ﴿ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ﴾ (النساء:۱/۴) ''تم سب کو ایک جان سے پیدا کیا۔'' کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے اور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّمَا النِّسَاءُ شَقَائِقُ الرِّجَالِ»(سنن أبي داود، الطهارة، باب في الرجل يجد البلة في منامه: ۱/ ۱۶۲، ح: ۲۳۶ مع شرحه معالم السنن للخطابي طبع مصر)

''عورتیں مردوں ہی کی شقیقہ (ہم جنس) ہیں۔''

''شقیقہ'' کا مطلب ہے ''پیدائش اور طبیعت میں یکساں ہونا۔'' چنانچہ امام خطابی لکھتے ہیں:

«أَيْ نَظَائِرُهُمْ وَأَمْثَالُهُمْ فِي الْخَلْقِ وَالطِّبَاعِ فَكَأَنَّهُنَّ شُقِقْنَ مِنَ الرِّجَالِ»(حواله مذكور)

''عورتیں پیدائش اور طبعی اوصاف میں مردوں ہی کی طرح ہیں' گویا کہ وہ مردوں ہی سے نکلی ہوئی ہیں۔''

یوں اسلام نے عورت کے بارے میں اس تصور کو کہ عورت مرد کے مقابلے میں ذلیل

و حقیر مخلوق ہے' باطل قرار دیا اور واضح الفاظ میں صراحت کر دی کہ تکریم آدمیت اور شرف انسانیت کے لحاظ سے مرد و عورت میں فرق روا نہیں رکھنا چاہیے۔

۲۔ اسی بنیاد پر' اسلام میں وجہ فضیلت اور وجہ ذلت یہ نہیں ہے کہ فلاں مرد ہے' اسلئے افضل ہے اور فلاں عورت ہے' اسلئے ذلیل ہے' بلکہ شرف و فضل کا معیار ایمان و تقویٰ ہے۔

﴿ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ﴾ (الحجرات۴۹/ ۱۳)

"اللہ کے نزدیک تم میں سب سے معزز وہ ہے' جو تم میں سب سے زیادہ متقی اور پرہیز گار ہے۔"

اس نکتے کو قرآن کریم نے کھول کر بیان فرمایا:

﴿ مَنْ عَمِلَ صَٰلِحًا مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُۥ حَيَوٰةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ﴿٩٧﴾ ﴾ (النحل۱۶/ ۹۷)

"جس کسی نے بھی' چاہے وہ مرد ہو یا عورت' عمل صالح کیا در آں حالیکہ وہ مومن ہے تو ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور ان کے بہترین عملوں کا ضرور بدلہ دیں گے۔"

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ أَنِّى لَآ أُضِيعُ عَمَلَ عَٰمِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ ﴾ (آل عمران۳/ ۱۹۵)

"میں تم میں سے کسی کارکن (عامل) کا عمل ضائع نہیں کروں گا (بلکہ بہترین بدلہ دوں گا) چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔"

اور اس مفہوم کو سورۂ احزاب میں تفصیل سے بیان کیا۔ فرمایا:

﴿ إِنَّ ٱلْمُسْلِمِينَ وَٱلْمُسْلِمَٰتِ وَٱلْمُؤْمِنِينَ وَٱلْمُؤْمِنَٰتِ وَٱلْقَٰنِتِينَ وَٱلْقَٰنِتَٰتِ وَٱلصَّٰدِقِينَ وَٱلصَّٰدِقَٰتِ وَٱلصَّٰبِرِينَ وَٱلصَّٰبِرَٰتِ وَٱلْخَٰشِعِينَ وَٱلْخَٰشِعَٰتِ وَٱلْمُتَصَدِّقِينَ وَٱلْمُتَصَدِّقَٰتِ وَٱلصَّٰٓئِمِينَ وَٱلصَّٰٓئِمَٰتِ وَٱلْحَٰفِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَٱلْحَٰفِظَٰتِ وَٱلذَّٰكِرِينَ ٱللَّهَ كَثِيرًا وَٱلذَّٰكِرَٰتِ أَعَدَّ ٱللَّهُ لَهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ﴿٣٥﴾ ﴾ (الأحزاب۳۳/ ۳۵)

”بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں، فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں، راست گو مرد اور راست گو عورتیں، صابر مرد اور صابر عورتیں، خشوع کرنے والے مرد، اور خشوع کرنے والی عورتیں، صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں، روزے دار مرد اور روزے دار عورتیں، شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں، اللہ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور اللہ کو بہت یاد کرنے والی عورتیں، اللہ تعالیٰ نے ان سب کے لیے مغفرت اور اجر عظیم تیار کیا ہے۔“

غرض ایمان اور اعمالِ صالحہ، جو فلاحِ ابدی کے ضامن ہیں، ان میں مرد و عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ جو بھی اپنی سیرت و کردار کو اس سانچے میں ڈھال لے گا، وہ اللہ کی بارگاہ میں سرخرو ہو گا اور جو اس ایمان و عمل صالح سے محروم ہو گا، وہ مستحق عذاب ہو گا۔ قطع نظر اس بات کے کہ اس کا تعلق صنف ذکور سے ہے یا صنف اناث سے۔

اسلام سے قبل لڑکی کی ولادت کو منحوس سمجھا جاتا تھا حتی کہ بعض درندہ صفت لڑکی کو زندہ درگور تک کر دیتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت کے لوگوں کے اس رویے کو قرآن نے یوں بیان کیا ہے:

﴿ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ﴿٥٨﴾ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِن سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ ۚ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ ﴾

(النحل ١٦/ ٥٨-٥٩)

”جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی نوید سنائی جاتی ہے، تو اس کا چہرہ (مارے غم اور افسوس کے) سیاہ ہو جاتا ہے اور دل میں وہ گھٹ رہا ہوتا ہے وہ اس خبر کو برا سمجھتے ہوئے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اور سوچتا ہے کہ اس ذلت کو برداشت کرے یا اس کو مٹی میں دبا دے۔“

۳۔ اسلام نے ان کے اس رویے کی سخت مذمت کی اور بچیوں کو اس طرح زندہ درگور کرنے سے یہ کہہ کر منع فرمایا کہ اگر کسی نے اس فعل شنیع کا ارتکاب کیا تو اس سے

بارگاہ الٰہی میں باز پرس ہوگی۔

﴿ وَإِذَا ٱلْمَوْءُۥدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِأَيِّ ذَنۢبٍ قُتِلَتْ ۝ ﴾ (التکویر ۸۱/۸۔۹)

نبی اکرم ﷺ نے بھی لڑکے کے مقابلے میں لڑکی کو حقیر سمجھنے اور اسے زندہ درگور کرنے کی مذمت بیان فرمائی اور بچیوں کی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت کے فضائل بیان فرمائے۔ فرمایا:

«مَنْ كَانَتْ لَهُ أُنْثَى فَلَمْ يَئِدْهَا وَلَمْ يُهِنْهَا وَلَمْ يُؤْثِرْ وَلَدَهُ عَلَيْهَا قَالَ: يَعْنِي الذُّكُورَ ۔ أَدْخَلَهُ اللهُ الْجَنَّةَ»(سنن أبي داود، الأدب، باب فضل من عال يتامى، ح:٥١٤٦)

”جس کے ہاں لڑکی ہوئی اس نے اسے زندہ درگور نہیں کیا' نہ اسے حقیر سمجھا اور نہ لڑکے کو اس پر ترجیح دی تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔“

اور فرمایا:

«مَنْ عَالَ ثَلَاثَ بَنَاتٍ، فَأَدَّبَهُنَّ وَزَوَّجَهُنَّ، وَأَحْسَنَ إِلَيْهِنَّ، فَلَهُ الْجَنَّةُ»(سنن أبي داود، الأدب، باب في فضل من عال يتامى، ح:٥١٤٧)

”جس نے تین لڑکیوں کی پرورش کی' ان کی تعلیم و تربیت کی' ان کی شادیاں کیں اور ان کے ساتھ حسن سلوک کیا تو اس کے لیے جنت ہے۔“

ایک اور روایت میں یہ الفاظ اس طرح ہیں:

«ثَلَاثُ أَخَوَاتٍ أَوْ ثَلَاثُ بَنَاتٍ، أَوِ ابْنَتَانِ أَوْ أُخْتَانِ»(سنن أبي داود، الأدب، باب في فضل من عال يتامى، ح:٥١٤٨)

”جس نے تین بہنوں یا تین لڑکیوں یا دو لڑکیوں یا دو بہنوں کی پرورش کی' اس کے لیے جنت ہے۔“

اس مفہوم کی متعدد روایات کتب حدیث میں موجود ہیں۔ جن میں لڑکیوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ اسلام کی انہی تعلیمات و ہدایات کا نتیجہ ہے کہ بہت سے گھرانوں میں اگرچہ جہالت کی وجہ سے لڑکیوں کی پیدائش پر کراہت کا اظہار کیا جاتا

ہے' لیکن جہاں تک ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا تعلق ہے' کسی بھی مسلم گھرانے میں اس میں کوتاہی نہیں کی جاتی اور بچیوں کو شہزادیوں کی طرح پالا اور رکھا جاتا ہے۔

اسلامی معاشرے میں عورت کی چار حیثیتیں ہیں۔ وہ کسی کی بیٹی ہے' کسی کی بہن ہے' کسی کی بیوی اور کسی کی ماں ہے۔ اسلام نے ان چاروں حیثیتوں میں اس کی عزت و احترام کی تلقین و تاکید کی ہے۔ بیٹی اور بہن کی حیثیت سے اس کی تعلیم و پرداخت کا مختصر ذکر تو گزر چکا ہے۔ بہ حیثیت بیوی کے اس کے لیے جو تعلیم دی گئی ہے' وہ حسب ذیل آیت و حدیث سے واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمِنْ ءَايَـٰتِهِۦٓ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَٰجًا لِّتَسْكُنُوٓا۟ إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً ﴾ (الروم۳۰/ ۲۱)

"اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان مودت و رحمت پیدا فرمادی۔"

اس آیت کریمہ میں ایک تو عورت کو مرد کے لیے وجہ تسکین بتلایا' جس سے اس کی اہمیت و عظمت واضح ہے۔ دوسرے' دونوں صنفوں کے تعلق کی نوعیت کو واضح کیا کہ ان کے مابین کشاکش اور تناؤ کی بجائے الفت و محبت اور شفقت و رحمت کا رشتہ قائم ہونا اور رہنا چاہیے۔ ایک دوسرے مقام پر عورت کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید اس طرح کی:

﴿ وَعَاشِرُوهُنَّ بِٱلْمَعْرُوفِ ۚ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰٓ أَن تَكْرَهُوا۟ شَيْـًٔا وَيَجْعَلَ ٱللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ﴿١٩﴾ ﴾ (النساء٤/ ١٩)

"عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو' اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں (تب بھی ان سے نباہ کرو) ہوسکتا ہے کہ جس کو تم ناپسند کرتے ہو' اس میں اللہ تعالیٰ خیر کثیر پیدا فرمادے۔"

ایک اور مقام پر عورت کے حقوق کا ان الفاظ میں تذکرہ فرمایا:

﴿ وَلَهُنَّ مِثْلُ ٱلَّذِى عَلَيْهِنَّ بِٱلْمَعْرُوفِ ۚ ﴾ (البقرة٢/ ٢٢٨)

"ان عورتوں کے لیے (مردوں پر) معروف کے مطابق وہی (حقوق) ہیں جو عورتوں

پر (مردوں کے لیے) عائد ہوتے ہیں۔"

احادیث میں نبیِ کریم ﷺ نے بھی اپنی اُمت کو بڑی تاکید فرمائی ہے۔ فرمایا:

«إِنَّ مِنْ أَكْمَلِ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا وَأَلْطَفُهُمْ بِأَهْلِهِ»(جامع الترمذي، الإيمان، باب في استكمال الإيمان والزيادة والنقصان، ح:٢٦١٢)

"کامل ترین مومن وہ ہے جو اخلاق میں سب سے بہتر اور اپنے بیوی بچوں پر سب سے زیادہ مہربان ہو۔"

اور فرمایا:

«خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لأَهْلِهِ، وَأَنَا خَيْرُكُمْ لأَهْلِي»(سنن ابن ماجة، النكاح، باب حسن معاشرة النساء، ح:١٩٧٧)

"تم میں سب سے بہتر وہ ہے' جو اپنی بیوی کے حق میں سب سے بہتر ہے اور میں اپنے گھر والوں کے لیے سب سے بہتر ہوں۔"

ایک اور روایت میں اس کو یوں بیان فرمایا:

«خِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَائِهِمْ»(حواله مذكور، ح:١٩٧٨)

"تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی عورتوں کے حق میں بہتر ہے۔"

حجۃ الوداع کے موقع پر نبی ﷺ نے جو اہم باتیں اپنی امت کو ارشاد فرمائیں' ان میں ایک یہ بھی تھی:

«اسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا فَإِنَّهُنَّ عِنْدَكُمْ عَوَانٍ»(سنن ابن ماجة، النكاح، باب حق المرأة على الزوج، ح:١٨٥١)

"عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا' وہ تمہارے پاس اسیر (قیدی) ہیں۔"

ایک موقع پر کچھ عورتوں نے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے خاوندوں کی شکایتیں کیں تو آپ نے ایسے مردوں کی بابت فرمایا:

«فَلَا تَجِدُونَ أُولَئِكَ خِيَارَكُمْ»(سنن ابن ماجه، النكاح، باب ضرب النساء، ح:١٩٨٥)

"ان لوگوں کو تم اپنے میں بہتر نہیں پاؤ گے۔"

ایک اور حدیث میں نیک عورت کو بہترین متاع قرار دیا گیا ہے:

«خَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ»(صحيح مسلم، النكاح، باب خير متاع الدنيا المرأة الصالحة، ح:١٤٦٩)

ماں کی حیثیت سے اسلام میں عورت کا مقام بہت اونچا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَوَصَّيْنَا ٱلْإِنسَٰنَ بِوَٰلِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُۥ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَٰلُهُۥ فِى عَامَيْنِ أَنِ ٱشْكُرْ لِى وَلِوَٰلِدَيْكَ ﴾ (لقمان٣١/ ١٤)

"ہم نے انسان کو اس کے والدین کے بارے میں (حسن سلوک کی) بڑی تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے کمزوری پر کمزوری برداشت کرتے ہوئے حمل کی مدت پوری کی اور اس کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہے (یہ اس لیے) کہ وہ میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کرے۔"

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَوَصَّيْنَا ٱلْإِنسَٰنَ بِوَٰلِدَيْهِ إِحْسَٰنًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُۥ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ﴾

(الأحقاف٤٦/ ١٥)

"ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے' اس کی ماں نے اسے مشقت کے ساتھ حمل میں رکھا اور مشقت و تکلیف کے ساتھ اس کو جنا۔"

ان دونوں آیات میں اگرچہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم اور اس کی تاکید کی گئی ہے' لیکن ماں کا ذکر جس انداز میں ہوا ہے اور حمل و ولادت کی تکلیف کا بطور خاص جس طرح ذکر کیا گیا ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں کا حق باپ سے کئی گنا زیادہ ہے اور حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے' چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا:

«مَنْ أَحَقُّ النَّاسِ بِحُسْنِ صَحَابَتِي؟ قَالَ: أُمُّكَ، قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ثُمَّ أُمُّكَ، قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ثُمَّ أُمُّكَ، قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟

قَالَ : ثُمَّ أَبُوكَ»(صحيح البخاري، الأدب، باب من أحق الناس بحسن الصحبة، ح:٥٩٧١ وصحيح مسلم، البر والصلة والأدب، باب بر الوالدين وأيهما أحق به، ح:٢٥٤٨ واللفظ له)

"میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ آپ نے فرمایا: تمھاری ماں۔ اس نے پوچھا: پھر کون؟ آپ نے فرمایا: تمھاری ماں۔ اس نے پھر پوچھا: پھر کون؟ آپ نے فرمایا: تمھاری ماں۔ اس نے کہا' پھر کون؟ آپ نے جواب میں فرمایا: پھر تمھارا باپ۔"

اس حدیث میں تین مرتبہ ماں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی تاکید فرمانے کے بعد چوتھی مرتبہ باپ کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ علماء نے یہ لکھی ہے کہ تین تکلیفیں ایسی ہیں جو صرف ماں برداشت کرتی ہے' بچے کے باپ کا اس میں حصہ نہیں۔ ایک حمل کی تکلیف' جو نو مہینے عورت برداشت کرتی ہے۔ دوسری وضع حمل (زچگی) کی تکلیف' جو عورت کے لیے موت و حیات کی کشمکش کا ایک جاں گسل مرحلہ ہوتا ہے۔ تیسری رضاعت (دودھ پلانے) کی تکلیف' جو دو سال تک محیط ہے۔ بچے کی شیرخوارگی کا یہ زمانہ ایسا ہوتا ہے کہ ماں راتوں کو جاگ کر بھی بچے کی حفاظت و نگہداشت کا مشکل فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ اس دوران بچہ بول کر نہ اپنی ضرورت بتلا سکتا ہے' نہ اپنی کسی تکلیف کا اظہار ہی کر سکتا ہے۔ صرف ماں کی ممتا اور اس کی بے پناہ شفقت اور پیار ہی اس کا واحد سہارا ہوتا ہے۔ عورت یہ تکلیف بھی ہنسی خوشی برداشت کرتی ہے۔

یہ تین مواقع ایسے ہیں کہ صرف عورت ہی اس میں اپنا عظیم کردار ادا کرتی ہے اور مرد کا اس میں حصہ نہیں۔ انھی تکالیف کا احساس کرتے ہوئے شریعت نے باپ کے مقابلے میں ماں کے ساتھ حسن سلوک کی زیادہ تاکید کی ہے۔

شادی سے قبل اور شادی کے بعد: شادی سے قبل اس کی تعلیم و پرداخت کی فضیلت اور شادی کے بعد عورت سے حسن معاشرت کی تاکید کی تفصیل بیان ہو چکی ہے' لیکن عورت کے لیے دو مرحلے اس کی زندگی میں بڑے اہم موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک مرحلہ شادی سے

قبل رشتۂ ازدواج سے انسلاک میں اس کی پسند اور ناپسند کا مسئلہ ہے اور دوسرا مرحلہ وہ ہے کہ شادی کے بعد اگر خاوند صحیح کردار کا ثابت نہ ہو' تو اس سے گلو خلاصی کی کیا صورت ہے؟ ان دونوں مرحلوں کے لیے بھی اسلام نے عورت کے جذبات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسی معقول ہدایات دی ہیں کہ عورت پر کسی طرح سے جبرو ظلم نہ ہو سکے۔

ا۔ نکاح میں عورت کی پسند اور اس کے اختیار کے مسئلے میں بالعموم بڑی افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ کہیں تو عورت کو بالکل بے دست و پا بنا دیا گیا ہے' اس کی پسند و ناپسند کی قطعاً کوئی پروا نہیں کی جاتی اور کہیں ایسا بااختیار بنا دیا گیا ہے کہ ماں باپ اور اس کے سرپرستوں کی رائے اور مشورے کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ اسلام نے اس افراط و تفریط کے مقابلے میں یہ راہِ اعتدال اختیار کی کہ ایک طرف ولی (سرپرست) کی ولایت اور اجازت کو ضروری قرار دیا اور فرمایا:

«لَا نِكَاحَ إِلاَّ بِوَلِيٍّ»(سنن أبي داود، النكاح، باب في الولي، ح:٢٠٨٥)

''ولی کے بغیر نکاح صحیح نہیں۔'' [1]

اس حدیث کی روشنی میں اکثر ائمہ کے نزدیک ایسا نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا' تاہم فقہاء کا ایک گروہ اس حدیث کی تضعیف' یا تاویل کی وجہ سے انعقاد نکاح کا تو قائل ہے' لیکن اس کے ناپسندیدہ ہونے میں اسے بھی کلام نہیں اور بعض شکلوں میں سرپرستوں کو ایسا نکاح فسخ کرانے کا اختیار رہتا ہے۔ (فتح القدیر لابن الهمام' ۲۵۵/۳)

دوسری طرف عورت کی رضامندی اور اس کی اجازت بھی ضروری قرار دی گئی ہے اور فرمایا:

«لَا تُنْكَحُ الأَيِّمُ حَتَّى تُسْتَأْمَرَ»(صحيح البخاري، النكاح، باب لا ينكح الأب وغيره البكر والثيب إلا برضاهما، ح:٥١٣٦)

''بیوہ عورت کا نکاح اس کے مشورے کے بغیر نہ کیا جائے۔'' اور:

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو' فتح الباری' باب مَنْ قَالَ لَا نِكَاحَ إِلاَّ بِوَلِيٍّ و بَابُ السُّلْطَانِ وَلِيٌّ ..... الخ۔ نیل الاوطار' ج:۶/۲۵۲-۲۵۶- طبع منیریہ مصر۔

«لاَ تُـنْكَحُ الْبِكْرُ حَتّٰى تُسْتَأْذَنَ»(حوالہ مذکور)

"کنواری لڑکی کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے۔"

کنواری عورت کے اندر شرم و حیاء زیادہ ہوتی ہے' اس لیے اس سے اجازت طلبی کا مسئلہ مشکل تھا' اسے بھی شریعت نے اس طرح حل فرما دیا کہ "باکرہ" کی خاموشی ہی اس کی اجازت اور رضامندی ہے۔" (حوالہ مذکور)

عورت کی رضامندی اور اس کی اجازت کی شریعت میں کتنی اہمیت ہے' اس کا اندازہ عہد رسالت مآب ﷺ کے ایک واقعے سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک خاتون' خنساء بنت خِذام انصاریہ' کا نکاح ان کے والد نے ان کی اجازت کے بغیر کر دیا۔ انہیں یہ رشتہ ناپسند تھا۔ انہوں نے آکر نبی ﷺ کی خدمت میں باپ کی شکایت کی' تو آپ نے اس کو ناپسند فرمایا اور نکاح کو ردّ کر دیا یعنی کالعدم قرار دے دیا۔ (صحیح بخاری' النکاح' باب اِذَا زَوَّجَ الرَّجُلُ ابْنَتَهُ وَهِیَ کَارِهَةٌ فَنِکَاحُهُ مَرْدُوْدٌ حدیث 5138)

دوسرا مرحلہ: شادی کے بعد اگر خاوند عورت کے نزدیک ناپسندیدہ ہو' تو اس سے گلوخلاصی حاصل کرنے کے لیے اسی طرح عورت کو خلع کا حق دیا گیا ہے' جس طرح مرد کو ناپسندیدہ بیوی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے طلاق کا حق حاصل ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ مرد کو تو طلاق کا حق ہے' لیکن اس کے مقابلے میں عورت مجبور ہے۔ وہ اگر خاوند کو ناپسند کرتی ہے تو اس کے لیے اس سے نجات حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ یہ تصور صحیح نہیں۔ عورت کو مرد کے حق طلاق کے مقابلے میں اسلام نے حق خلع عطا کیا ہے' البتہ اس نے مرد و عورت دونوں کو یہ تاکید کی ہے کہ دونوں اپنا یہ حق انتہائی ناگزیر حالات ہی میں استعمال کریں۔ محض ذائقہ بدلنے کے لیے استعمال نہ کریں۔ اگر کوئی ایسا کرے گا' تو سخت گناہ گار ہو گا۔

اسی طرح شریعت اسلامیہ نے مرد کو طلاق دینے کے بعد رجوع کا حق دیا ہے اس میں عورت پر ظلم کی صورت ہو سکتی تھی کہ طلاق دینے کے بعد عدت کے اندر بار بار مرد رجوع کر لے اور یوں عورت کو نہ آباد کرے نہ مکمل آزاد کرے اور وہ بیچ میں معلق رہے' جس طرح زمانۂ جاہلیت میں عورت کو اس طرح تنگ کیا جاتا تھا کہ نہ اس کو طلاق دیتے

تھے نہ آباد کرتے تھے' طلاق دیتے اور عدت گزرنے سے قبل ہی رجوع کر لیتے' پھر طلاق دیتے اور پھر عدت گزرنے سے قبل رجوع کر لیتے اور یہ سلسلہ سالہا سال تک اس طرح معلق چلتا رہتا۔ شریعت نے اس ظلم کے انسداد کے لیے حق طلاق کو محدود کر دیا کہ مرد دو مرتبہ تو طلاق دینے کے بعد رجوع کر سکتا ہے' لیکن تیسری مرتبہ طلاق دینے کے بعد رجوع کا بالکل حق نہیں رہتا۔ پھر مسئلہ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ (یہاں تک کہ وہ دوسرے خاوند سے نکاح کرے) والا آجاتا ہے۔

یہ چند مختصر اشارات ہیں جن سے واضح ہے کہ اسلام نے عورت کو عزت و احترام کا وہ مقام عطا کیا ہے جو کسی بھی مذہب اور نظام نے نہیں دیا۔

مرد اور عورت کے دائرہ کار کا اختلاف: اسی طرح اسلام کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے مرد اور عورت دونوں کے دائرۂ کار کو بھی متعین کر دیا ہے۔ اس امر میں تو اختلاف کی کوئی ادنیٰ سی گنجائش بھی نہیں کہ قدرت نے مرد اور عورت دونوں کو الگ الگ مقاصد کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ اس لیے دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں صنفوں کی ذہنی و عملی صلاحیتوں میں قدرتی فرق کو بھی تسلیم کیا جائے اور اس فرق کی بنیاد پر دونوں کے دائرۂ کار کے اختلاف کو بھی۔ اگرچہ دونوں اپنے اپنے دائرے میں انسانی زندگی کے لیے ناگزیر اور ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عورت مرد سے بے نیاز نہیں رہ سکتی اور مرد عورت کو نظرانداز کر کے زندگی کی شاہراہ پر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا' تاہم دونوں کی ذہنی صلاحیتوں میں فرق ہے' دونوں کا مقصد تخلیق الگ الگ ہے اور دونوں کے دائرہ کار ایک دوسرے سے مختلف اور جداگانہ ہیں۔

بنابریں شریعت اسلامیہ نے ذہنی و عملی فرق و تفاوت اور دائرہ کار کے اختلاف کی وجہ سے بہت سی چیزوں میں مرد و عورت کے درمیان فرق ملحوظ رکھا ہے اور بعض ذمے داریاں صرف مردوں پر عائد کی ہیں' عورتوں کو ان سے مستثنیٰ رکھا ہے۔ اسی طرح بعض خصوصیات سے عورتوں کو نوازا ہے' مردوں کو ان سے محروم رکھا ہے' لیکن ان فطری صلاحیتوں کے فرق و تفاوت کا مطلب کسی صنف کی برتری اور دوسری صنف کی کمتری و حقارت نہیں

ہے۔ مثال کے طور پر مرد کے اندر اللہ تعالیٰ نے صلاحیت رکھی ہے کہ وہ عورت کو بار آور کر سکتا ہے، لیکن خود بار آور نہیں ہو سکتا' اس کے برعکس عورت کے اندر صلاحیت رکھی ہے کہ وہ بار آور ہو سکتی ہے' لیکن وہ بار آور کر نہیں سکتی۔ گویا مرد کے اندر تخلیق و ایجاد کا جوہر رکھا گیا ہے' تو عورت کو اس تخلیق و ایجاد کے ثمرات و نتائج سنبھالنے کا سلیقہ اور ہنر عطا کیا گیا ہے۔ اسی طرح اگر مرد کو حکمرانی و جہانبانی کا حوصلہ عنایت کیا گیا ہے' تو عورت کو گھر بسانے کی قابلیت بخشی گئی ہے۔ مرد کے اندر قوت و عزیمت کے اوصاف رکھے گئے ہیں' تو عورت کو دل کشی و دل ربائی کا جمال عطا گیا ہے اور اس کار خانۂ عالم کی زیب و زینت کسی ایک ہی صنف کے اوصاف سے نہیں ہے' بلکہ دونوں قسم کے اوصاف سے ہے اور دونوں ہی انسانی معاشرے کے اہم رکن ہیں۔

انسانی معاشرے کا وجود' اس کی بقا اور اس کا تسلسل ان دونوں میں سے کسی ایک ہی پر منحصر نہیں ہے کہ ساری اہمیت بس اسی کو دے دی جائے اور دوسرے کو یکسر نظرانداز کر دیا جائے' بلکہ اس پہلو سے دونوں مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ خصوصیات اور صلاحیتیں دونوں الگ الگ لے کر آئے ہیں۔ اس لیے مرد جو کام کر سکتے ہیں' عورتیں وہ سارے کام نہیں کر سکتیں' لیکن ایسے مردانہ کام نہ کر سکنا' عورت کی تحقیر نہیں ہے۔ اسی طرح عورت کے بعض کام مرد نہیں کر سکتے' تو اس میں ان کے لیے حقارت کا کوئی پہلو نہیں۔ دونوں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق اعمال کے مکلف ہیں۔ اس لیے اسلام اسی بات کو پسند کرتا ہے کہ دونوں صنفیں اپنے اپنے دائرے میں کام کر کے قدرت کے منشا کی تکمیل کریں۔ ایک دوسرے کے کاموں میں دخیل ہو کر فسادِ تمدن کا باعث نہ بنیں۔ وہ ایک دوسرے کے معاون ہوں' متحارب نہ ہوں۔ حلیف ہوں' حریف نہ ہوں۔ جو بھی انسانی معاشرہ اس فطری اصول سے انحراف کرے گا' امن و سکون سے محروم ہو جائے گا۔

اس لیے اسلام نے انسانی معاشرے کو فساد سے بچانے کے لیے مرد و عورت دونوں کے دائرہ کار کو ان کی فطری صلاحیتوں کے مطابق متعین کر دیا ہے۔ مرد کا دائرہ کار گھر سے باہر ہے اور عورت کا اصل دائرہ کار گھر کی چاردیواری اور اسی بنیاد پر اس نے مرد اور عورت

کے درمیان بہت سے امور میں فرق کیا ہے' جس کی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے۔

معاشی کفالت کا ذمے دار اور خاندان کا سربراہ: اسلام نے عورت کو کمانے (ملازمت کرنے یا تجارت و کاروبار کرنے) سے مستثنٰی رکھا ہے اور نان و نفقہ کی ساری ذمے داری مرد پر ڈالی ہے' چنانچہ عورت جب تک' وہ غیر شادی شدہ ہے' ماں' باپ یا بھائی یا بصورت دیگر چچا وغیرہ اس کے کفیل ہوں گے اور شادی کے بعد اس کا خاوند۔ اسی اعتبار سے مرد کو عورتوں کا قوام (سربراہ' حاکم اور نگران) کہا گیا ہے۔

﴿ ٱلرِّجَالُ قَوَّٰمُونَ عَلَى ٱلنِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ ٱللَّهُ بَعۡضَهُمۡ عَلَىٰ بَعۡضٖ وَبِمَآ أَنفَقُواْ مِنۡ أَمۡوَٰلِهِمۡۚ ﴾ (النساء٤/ ٣٤)

"مرد عورتوں پر قوام ہیں' بہ سبب اس کے جو اللہ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی اور بہ سبب اس کے جو وہ مرد اپنے مالوں سے خرچ کرتے ہیں۔"

مرد کی جس فضیلت کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ چونکہ خاندان کا کفیل وہ ہے اور تجارت و کاروبار اسی کی ذمے داری ہے۔ اس کو اسی قسم کی صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے اور وہی یہ بوجھ اٹھانے کے قابل بھی ہے۔ اس لیے اس کی ذمہ داری کی نسبت سے اس کا حق بھی زیادہ ہے اور وہ حق یہ ہے کہ سربراہ خاندان بھی وہ ہے۔ مرد کی اس فضیلت اور تفوق کو دوسری آیت میں یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿ وَلِلرِّجَالِ عَلَيۡهِنَّ دَرَجَةٞۗ ﴾ (البقرة٢/ ٢٢٨)

"مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ (مرتبہ) حاصل ہے۔"

عورت کے لیے پردے کا حکم: اسلام نے عورت کو چونکہ بیرون خانہ کی ذمے داریوں سے مستثنٰی رکھا ہے' اس لیے اس نے عورتوں کے لیے یہ تاکید کی ہے کہ وہ اپنا وقت گھر کے اندر گزاریں۔

﴿ وَقَرۡنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجۡنَ تَبَرُّجَ ٱلۡجَٰهِلِيَّةِ ٱلۡأُولَىٰۖ ﴾ (الأحزاب٣٣/ ٣٣)

"اپنے گھروں میں بیٹھی رہو اور پہلے زمانۂ جاہلیت کی طرح بناؤ سنگھار کا اظہار نہ

کرتی پھرو۔"

اس آیت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا منصب یہ قطعاً نہیں ہے کہ وہ بازار کی تاجر' دفتر کی کلرک' عدالت کی جج' فوج کی سپاہی' کسی افسر کی سیکرٹری' کسی دکان میں ماڈل گرل یا ائرہوسٹس بنے' بلکہ اس کے عمل کا حقیقی میدان اس کا گھر ہی ہے' چنانچہ امام جصاص رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں:

«وَفِيهِ الدَّلَالَةُ عَلٰى أَنَّ النِّسَاءَ مَأْمُورَاتٌ بِلُزُومِ الْبَيْتِ مَنْهِيَّاتٌ عَنِ الْخُرُوجِ»

"یہ آیت اس امر پر دلیل ہے کہ عورتیں اپنے گھروں میں ٹک کر رہنے پر مامور ہیں اور باہر نکلنا ان کے لیے ممنوع ہے۔"

یہ آیت ازواج مطہرات کے ضمن میں نازل ہوئی تھی' لیکن اس میں جو احکام دیے گئے ہیں وہ تمام مسلمان عورتوں کے لیے عام ہیں' چنانچہ یہی امام جصاص رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

«فَهٰذِهِ الأُمُورُ كُلُّهَا مِمَّا أَدَّبَ اللهُ تَعَالٰى بِهِ نِسَآءَ النَّبِيِّ ﷺ صِيَانَةً لَهُنَّ وَسَائِرُ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِينَ مُرَادَاتٌ بِـهَا»(احكام القرآن: ۳/ ۴۴۳)

"یہ تمام امور وہ ہیں جن کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کو ان کی عزت و حرمت کی حفاظت کے لیے آداب سکھلائے اور مراد ان سے تمام مومن عورتیں ہیں۔"

البتہ ضرورت کے وقت وہ گھر سے باہر نکل سکتی ہیں' لیکن پردے کی پابندی کے ساتھ' جس کا حکم بھی قرآن مجید میں موجود ہے اور احادیث میں بھی یہ تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

شریعت کی نگاہ میں عورت کے لیے لزوم بیت کی جتنی اہمیت ہے' اس کا اندازہ اس سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ عبادات ہوں یا دیگر فرائض حیات ان کو عورت پر اجتماعی شکل میں فرض ہی نہیں کیا گیا ہے۔ نماز جو سب سے اہم عبادت ہے۔ مرد پر تو باجماعت فرض ہے اور بغیر جماعت کے پڑھنے پر سخت وعیدیں بیان کی گئی ہیں' لیکن عورت پر نماز تو ضرور فرض ہے' لیکن اس کے لیے جماعت ضروری نہیں ہے۔ اگرچہ اسے یہ اجازت تو حاصل

ہے کہ اگر وہ مسجد میں آ کر باجماعت نماز پڑھنا چاہتی ہے' تو پردے کے اہتمام میں آ کر ادا کر سکتی ہے لیکن اسے ترغیب یہ دی گئی ہے کہ اس کے لیے زیادہ بہتر گھر کے اندر ہی نماز پڑھنا ہے' بلکہ گھر کے اندر بھی وہ حصہ یا گوشہ زیادہ بہتر ہے جو گھر کا زیادہ سے زیادہ اندرونی حصہ یا گوشہ ہو۔ چنانچہ فرمایا:

«خَيْرُ مَسَاجِدِ النِّسَاءِ قَعْرُ بُيُوتِهِنَّ»(مسند أحمد: ٦/٢٩٧، ح: ٢٧٠٧٧)

"عورتوں کے لیے بہترین مساجد (جائے عبادت) ان کے گھروں کے سب سے اندرونی حصے ہیں۔"

مشہور صحابی حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ حضرت ام حمید رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا اِنِّیِ أُحِبُّ الصَّلَاةَ مَعَكَ "میں آپ کے ساتھ نماز پڑھنا پسند کرتی ہوں" تو آپ نے فرمایا: "مجھے یقین ہے کہ تمہاری خواہش یہی ہے' لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارا اپنے مکان کی کسی تنگ کوٹھڑی میں نماز پڑھنا تمہارے لیے کشادہ کمرے میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور تمہاری جو نماز کمرے میں ادا ہو وہ مکان کے وسط میں ادا کی جانے والی نماز سے اولیٰ ہے اور تمہاری وسط مکان میں پڑھی جانے والی نماز اس نماز سے افضل ہے جو تم اپنے محلے کی کسی مسجد میں پڑھو۔ اسی طرح تمہاری جو نماز اپنے محلے کی کسی مسجد میں ادا ہو وہ تمہارے حق میں میری مسجد (مسجد نبوی) میں پڑھی جانے والی نماز سے بہتر ہے۔"

اس حدیث کے راوی حضرت عبداللہ بن سوید رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں (جو حضرت ام حمید رضی اللہ عنہا کے بھتیجے ہیں) کہ ان کی پھوپھی نے اپنے لیے مکان کا سب سے اندرونی اور تاریک حصہ نماز کے لیے متعین کر لیا تھا اور وہیں ساری عمر نماز پڑھتی رہیں۔ (مسند احمد: ٦/٣٧١)

جمعہ بھی اجتماعی عبادت کا ایک اہم مظہر ہے۔ اس میں بھی عورتیں اگرچہ شرکت کر سکتی ہیں لیکن یہ اجتماعی عبادت بھی عورت پر فرض نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

«اَلْجُمُعَةُ حَقٌّ وَاجِبٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ فِي جَمَاعَةٍ إِلاَّ أَرْبَعَةً: عَبْدٌ مَمْلُوكٌ أَوِ امْرَأَةٌ أَوْ صَبِيٌّ أَوْ مَرِيضٌ»(سنن أبي داود، الصلاة، باب

الجمعة للمملوك والمرأة، ح:١٠٦٧)

”جمعہ ہر مسلمان پر باجماعت پڑھنا واجب ہے۔ البتہ غلام' عورت' بچہ اور مریض اس (وجوب جمعہ) سے مستثنیٰ ہیں۔“

شریعت نے مسلمانوں کو اپنے مرنے والے مسلمان بھائیوں کی نماز جنازہ پڑھنے کی بڑی تاکید کی اور اس کی خاص فضیلت بیان کی ہے' لیکن عورتوں کے لیے اس کو ضروری نہیں سمجھا' بلکہ ان کو جنازوں میں شرکت سے منع کر دیا گیا۔ حضرت ام عطیہ ؓ روایت کرتی ہیں:

«نُهِينَا عَنِ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ وَلَمْ يُعْزَمْ عَلَيْنَا»(صحيح البخاري، الجنائز، باب اتباع النساء الجنازة، ح:١٢٧٨)

”ہم (عورتوں) کو جنازے کی متابعت کرنے سے منع کر دیا گیا ہے تاہم اس میں زیادہ سختی نہیں کی گئی۔“

اور حدیث مذکور «نهينا عن اتباع الجنائز» کے تحت حافظ ابن حجر ؒ ابن منیر ؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

«فَصَّلَ الْمُصَنِّفُ بَيْنَ هٰذِهِ التَّرْجَمَةِ وَبَيْنَ فَضْلِ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ بِتَرَاجِمَ كَثِيرَةٍ تُشْعِرُ بِالتَّفْرِقَةِ بَيْنَ النِّسَاءِ وَالرِّجَالِ، وَأَنَّ الْفَضْلَ الثَّابِتَ فِي ذٰلِكَ يَخْتَصُّ بِالرِّجَالِ دُونَ النِّسَاءِ لِأَنَّ النَّهْيَ يَقْتَضِي التَّحْرِيمَ أَوِ الْكَرَاهَةَ، وَالْفَضْلُ يَدُلُّ عَلَى الْاِسْتِحْبَابِ، وَلَا يَجْتَمِعَانِ وَأُطْلِقَ الْحُكْمُ هُنَا لِمَا يَتَطَرَّقُ إِلَيْهِ مِنَ الْاِحْتِمَالِ، وَمِنْ ثَمَّ اخْتَلَفَ الْعُلَمَاءُ فِي ذٰلِكَ وَلَا يَخْفَى أَنَّ مَحَلَّ النِّزَاعِ إِنَّمَا هُوَ حَيْثُ تُؤْمَنُ الْمَفْسَدَةُ»(فتح الباري، الجنائز، باب اتباع النساء الجنائز: ٣/ ١٨٥)

”امام بخاری نے بَابُ ” اِتِّبَاعِ النِّسَاءِ الْجَنَائِزَ “ اور بَابُ ” فَضْلُ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ “ کے درمیان متعدد ابواب کے ساتھ فاصلہ کر دیا ہے' جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں مرد و عورت کے درمیان فرق ہے اور جنازے میں شرکت کی جو فضیلت ہے' وہ صرف مردوں کے ساتھ خاص ہے۔ عورتیں اس کی مخاطب نہیں۔

اس لیے کہ عورتوں کو جنازے میں شرکت سے منع کیا گیا ہے۔ یہ ممانعت تحریم یا کراہت کی مقتضی ہے۔ جب کہ فضیلت استحباب پر دال ہے اور تحریم' یا کراہت فضل کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے اور یہاں ((اِتِّبَاعِ النِّسَاءِ الْجَنَائِزَ)) میں حکم کو مطلق رکھا گیا' کیونکہ اس میں (دوسرے) احتمال (عدم فضیلت) کا بھی امکان ہے' اسی وجہ سے اس میں علماء کے مابین اختلاف ہوا اور مخفی نہ رہے کہ اصل محل نزاع وہ صورت ہے جس میں کسی مفسدے کا اندیشہ نہ رہے (اور جس جگہ مفسدے کا اندیشہ ہو وہ بالاتفاق ناجائز ہو گی۔)"

جہاد بھی اسلام کا ایک اہم فریضہ ہے' لیکن اسے بھی مردوں ہی پر فرض کیا گیا ہے' عورتوں پر نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

«عَلَى النِّسَاءِ جِهَادٌ؟»

"کیا عورتوں پر بھی جہاد فرض ہے؟"

آپ نے فرمایا:

«نَعَمْ عَلَيْهِنَّ جِهَادٌ لَا قِتَالَ فِيهِ: اَلْحَجُّ وَالْعُمْرَةُ»(سنن ابن ماجه، المناسك، باب الحج جهاد النساء، ح: ۲۹۰۱)

"ہاں! ان پر بھی جہاد فرض ہے' لیکن لڑائی والا جہاد نہیں' ان کا جہاد حج اور عمرہ ہے۔"

غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت ام ورقہ بنت نوفل رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا:

«ائْذَنْ لِي فِي الْغَزْوِ مَعَكَ أُمَرِّضُ مَرْضَاكُمْ لَعَلَّ اللهَ أَنْ يَرْزُقَنِي شَهَادَةً»

"مجھے بھی اجازت دیجئے کہ آپ کے ساتھ جنگ میں چلوں اور زخمیوں اور بیماروں کی دیکھ بھال کا کام کروں' شاید اس طریقے سے اللہ تعالیٰ مجھے بھی رتبۂ شہادت سے سرفراز فرما دے۔"

آپ نے فرمایا:

«قَرِّي فِي بَيْتِكِ، فَإِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ يَرْزُقُكِ الشَّهَادَةَ»

"تم اپنے گھر ہی میں ٹک کر رہو' تمہیں اللہ تعالیٰ (ایسے ہی) شہادت کا رتبہ عطا فرما دے گا۔"

راوی کا بیان ہے:

«فَكَانَتْ تُسَمَّى الشَّهِيدَةَ»(سنن أبي داود، الصلاة، باب إمامة النساء، ح: ٥٩١)

"ان کا نام ہی "شہیدہ" پڑ گیا تھا۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض غزوات میں چند خواتین اسلام نے حصہ لیا ہے' لیکن وہ محض گنتی کی چند عورتیں تھیں اور انہوں نے بھی وہاں جا کر مردوں کے دوش بدوش مورچے نہیں سنبھالے تھے نہ توپ و تفنگ سے وہ مسلح تھیں' بلکہ صرف پیچھے رہ کر فوجیوں کی خوراک اور مرہم پٹی کا کام کرتی رہی تھیں۔ جس طرح حضرت ام عطیہ انصاری رضی اللہ عنہا نے وضاحت کی ہے:

«غَزَوْتُ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ سَبْعَ غَزَوَاتٍ، أَخْلُفُهُمْ فِي رِحَالِهِمْ، فَأَصْنَعُ لَهُمُ الطَّعَامَ، وَأُدَاوِي الْجَرْحٰى، وَأَقُومُ عَلَى الْمَرْضٰى»
(صحيح مسلم، الجهاد، باب النساء الغازيات... الخ، ح: ١٨١٢ وسنن ابن ماجه، الجهاد، باب العبيد والنساء يشهدون مع المسلمين، ح: ٢٨٥٦)

"میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سات غزوات میں شرکت کی میں ان کے خیموں میں پیچھے رہتی' ان کے لیے کھانا تیار کرتی' زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی اور بیمار پرسی کرتی۔"

ان احادیث سے واضح ہے کہ جمعہ' جماعت' جنازہ اور جہاد وغیرہ فرائض میں عورتوں کی شرکت کو ضروری قرار نہیں دیا گیا ہے' بلکہ ان کے ساتھ یہ خصوصی رعایت کی گئی ہے کہ گھر بیٹھے ہی ان کو ان فرائض کا اجر و ثواب مردوں ہی کی طرح مل جائے گا بشرطیکہ وہ گھریلو

امور پوری ذمے داری سے ادا کریں۔

وراثت میں عورت کا نصف حصہ: وراثت میں بھی مرد و عورت کے درمیان فرق ہے۔ ﴿ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ﴾ (النساء ۱۱/۴) "مرد کے لیے دو عورتوں کی مثل ہے" اور اس کی وجہ بھی وہی مرد و عورت کے دائرہ کار کا اختلاف ہے۔ اسلام میں چونکہ نان و نفقہ کا ذمے دار مرد کو بنایا گیا ہے' عورت کو نہیں' اس لیے مرد کی ذمے داریوں کے بوجھ کے حساب سے اسے وراثت میں حصہ بھی دگنا دیا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو مرد پر ظلم ہوتا۔ اس کو ایک مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے۔

ایک شخص فوت ہو جاتا ہے' اس کے ورثاء میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے۔ اس کی جائیداد میں سے ﴿ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ﴾ کے تحت لڑکے کو ایک لاکھ کی رقم ملتی ہے اور لڑکی کو پچاس ہزار روپے۔ لڑکی کے یہ پچاس ہزار روپے نہ صرف محفوظ رہیں گے' بلکہ ان میں اضافہ ہو گا' اگر وہ اس کو کسی کاروبار میں لگا دے تو نفع آئے گا۔ علاوہ ازیں شادی پر اسے خاوند کی طرف سے مہر ملے گا' جس سے اس کی مالی حیثیت میں اضافہ ہی ہو گا' جب کہ اس کے برعکس لڑکے کو اپنی شادی پر بھی خرچ کرنا پڑے گا اور آنے والی بیوی کو مہر بھی ادا کرے گا' اس کے نان نفقہ کا بھی ذمے دار ہو گا اور شاید اپنی بہن کی شادی کا خرچ بھی اسے ہی برداشت کرنا پڑے۔ مکان اگر نہیں ہے تو بیوی بچوں کے لیے مکان کا بھی انتظام کرے گا۔ جب کہ اس کی بہن ان تمام جھمیلوں اور کھکھیڑوں سے محفوظ ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام کا نظام وراثت کس طرح حکمت سے پُر اور عدل و انصاف کے عین مطابق ہے۔

مرد کو ایک سے زیادہ چار تک شادی کرنے کی اجازت: اسلام میں مرد کو حسب ضرورت و اقتضاء ایک سے زیادہ (چار تک) بیویاں کرنے کا حق حاصل ہے اور مغرب زدہ طبقہ اس پر کتنا بھی چیں بہ جبیں ہو' لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے مرد کو یہ حکیمانہ اجازت دے کر انسانی معاشرے کو بہت سی خرابیوں سے بچانے کا اہتمام کیا ہے جس کا اعتراف اب مغرب کے وہ دانشور بھی کر رہے ہیں جن کے ہاں قانونی طور پر تو ایک سے زیادہ بیوی نہیں رکھی جا سکتی'

لیکن داشتائیں رکھنے اور باہمی رضامندی سے زناکاری کی عام اجازت ہے۔

عورت کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ بیک وقت کئی خاوندوں کی بیوی بن کر رہے اور اس میں حکمت یہی ہے کہ ایک تو خلقی طور پر عورت مرد کے مقابلے میں کمزور ہے۔ وہ زیادہ مردوں کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی۔ دوسرا سب سے اہم مسئلہ نسب کی حفاظت کا ہے۔ عورتوں کو بھی مردوں کی طرح ایک سے زیادہ خاوندوں کی اجازت ہوتی تو ہونے والا بچہ مجهول النسب رہتا۔ آخر کس کی طرف یقین کے ساتھ اسے منسوب کیا جاتا؟ اس کے علاوہ اس کی متعدد حکمتیں ہیں' جس کی کچھ تفصیل آگے آئے گی۔

مرد کا حق طلاق اور اس کی حکمت: حق طلاق بھی وہ حق ہے جو اسلام نے مرد کو تو دیا ہے' عورت کو نہیں دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت مرد کے مقابلے میں زود رنج' زود مشتعل اور جلد بازی میں جذباتی فیصلہ کرنے والی ہے' نیز عقل اور دور اندیشی میں کمزور ہے۔ عورت کو بھی اختیار دیے جانے کی صورت میں' یہ اہم رشتہ جو خاندان کے استحکام و بقا اور اس کی حفاظت و صیانت کے لیے بڑا ضروری ہے' تارِ عنکبوت سے زیادہ پائیدار ثابت نہ ہوتا۔ علمائے نفسیات و طبیعیات بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ علامہ فرید وجدی لکھتے ہیں:

> "عورت کی جسمانی ساخت بچوں کی جسمانی ترکیب سے قریب تر ہوتی ہے' اس لیے عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ وہ بچوں ہی کی طرح جلد متاثر اور منفعل ہو جاتی ہے۔ فرحت و کلفت' خوف و مسرت کے احساسات جلد ہی اس پر طاری ہو جاتے ہیں اور چونکہ اس میں عقلیت اور غور و فکر کی قوت کو زیادہ دخل نہیں ہوتا' اس لیے جلد ہی یہ تاثرات اس سے زائل بھی ہو جاتے ہیں اور اکثر دیرپا ثابت نہیں ہوتے۔ اس بنا پر عورت متلون اور غیر مستقل مزاج ہوتی ہے۔"

ایک اور اشتراکی فلسفی کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> "عورت کا وجدان مرد کے وجدان سے کمزور ہوتا ہے' جتنی کہ اس کی عقل مرد کی عقل سے کم ہوتی ہے' اس کے اخلاقی پیمانے بھی مرد سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے بالکل ضروری نہیں کہ جس کو وہ اچھا یا برا بتائے' واقعی وہ اچھا یا برا ہی ہو۔"

(دائرۃ المعارف (عربی) فرید و جدی، ۵۹۶/۸۔ بحوالہ "معاشرتی مسائل دین فطرت کی روشنی میں" مؤلفہ مولانا برہان الدین سنبھلی۔ شائع کردہ مکتبۃ الحسن، لاہور)

مشہور حنفی فقیہ علامہ ابن ہمام، عورت کو حق طلاق نہ دیے جانے کے ضمن میں لکھتے ہیں:

«جَعْلَهُ بِيَدِ الرِّجَالِ دُونَ النِّسَاءِ لِاخْتِصَاصِهِنَّ بِنُقْصَانِ الْعَقْلِ وَغَلَبَةِ الْهَوٰى وَمِنَ ذٰلِكَ سَاءَ اخْتِيَارُهُنَّ وَسُرْعِ اغْتِرَارِهِنَّ وَنُقْصَانِ الدِّينِ وَمِنْهُ كَانَ أَكْثَرُ شُغْلِهِنَّ بِالدُّنْيَا وَتَرْتِيبِ الْمَكَائِدِ وَإِفْشَاءِ سِرِّ الْأَزْوَاجِ وَغَيْرِ ذٰلِكَ»(فتح القدير، الطلاق: ۳/ ٤٦٥)

"طلاق کا اختیار صرف مرد کے ہاتھ میں دینے کے وجوہ میں سے چند یہ ہیں: عورتیں ناسمجھ (نقصان عقل) اور غلبہ ہوئی (جذباتی ہونے) کی وجہ سے اختیارات کا غلط طور پر استعمال کرنے لگتی ہیں اور جلد فریب کا شکار ہو جاتی ہیں اور دینی حیثیت سے کمزور (نقصان دین) ہونے کی وجہ سے دنیا کے کاموں (بناؤ سنگھار، غیبت اور بدگوئی وغیرہ) میں زیادہ منہمک رہتی ہیں، مکر کے جال بنتی رہتی ہیں اور شوہروں کے رازوں کو ظاہر کر دیتی ہیں اور اسی طرح کی اور چیزیں ہیں۔"

اس لیے شریعت اسلامیہ نے طلاق کا حق بھی صرف مرد کو دیا ہے جو عقل و فہم، تدبر، دور اندیشی اور حوصلہ و عزم میں عورت سے فائق ہے۔ ہر سمجھ دار طلاق دینے سے پہلے بہت کچھ سوچتا ہے اور بدرجۂ آخر یہ حق طلاق استعمال کرتا ہے جس طرح کہ شریعت نے بھی اسے بدرجۂ آخر ہی استعمال کرنے کی تاکید کی ہے۔ عورت کی اس کمزوری کا ذکر احادیث میں اس طرح کیا گیا ہے۔ فرمایا:

«اسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ، فَإِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ، وَإِنَّ أَعْوَجَ شَيْءٍ فِي الضِّلَعِ أَعْلَاهُ، فَإِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهُ كَسَرْتَهُ وَإِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ أَعْوَجَ فَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ»(صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب خلق آدم وذريته، ح: ۳۳۳۱)

"عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی وصیت مانو! عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے

اور سب سے زیادہ کجی اوپر کی پسلی میں ہوتی ہے۔ پس اگر تم سیدھا کرنے لگو گے‘ تو توڑ دو گے اور یوں ہی چھوڑ دو گے تو کجی باقی رہے گی۔ پس عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی وصیت قبول کرو۔"

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

«وَفِيهِ سِيَاسَةُ النِّسَاءِ بِأَخْذِ الْعَفْوِ مِنْهُنَّ وَالصَّبْرِ عَلٰى عِوَجِهِنَّ، وَأَنَّ مَنْ رَامَ تَقْوِيمَهُنَّ فَاتَهُ الانْتِفَاعُ بِهِنَّ مَعَ أَنَّهُ لاَ غِنَى لِلإِنْسَانِ عَنِ امْرَأَةٍ يَسْكُنُ إِلَيهَا وَيَسْتَعِينُ بِهَا عَلٰى مَعَاشِهِ، فَكَأَنَّهُ قَالَ: الاَسْتِمْتَاعُ بِهَا لاَ يَتِمُّ إِلاَّ بِالصَّبْرِ عَلَيهَا»(فتح الباري، النكاح: ۹/ ۳۱۵)

"مطلب اس کا یہ ہے کہ عورت کے مزاج میں تھوڑی سی کجی ہے (جو ضد وغیرہ کی شکل میں بالعموم ظاہر ہوتی رہتی ہے۔) پس اس کمزوری میں اسے معذور سمجھو‘ کیونکہ یہ پیدائشی ہے۔ اسے صبر و حوصلے کے ساتھ برداشت کرو اور ان سے عفو و درگزر کا معاملہ کرو اگر تم انہیں سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکو گے درآں حالیکہ ان کا وجود انسان کے سکون کے لیے ضروری ہے اور کشمکش حیات میں ان کا تعاون ناگزیر ہے‘ اس لیے صبر کے بغیر ان سے استمتاع اور نباہ ناممکن ہے۔"

ایک دوسری حدیث میں عورت کے سریع الغضب (زود رنج ہونے) اور ذرا سی بات خلاف طبیعت پیش آجانے پر ایک دم سارے احسانات فراموش کر دینے کی فطرت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

«لَوْ أَحْسَنْتَ إِلٰى إِحْدَاهُنَّ الدَّهْرَ ثُمَّ رَأَتْ مِنْكَ شَيْئًا قَالَتْ: مَا رَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ»(صحيح البخاري، النكاح، باب كفران العشير وهو الزوج وهو الخليط من المعاشرة، ح: ۵۱۹۷)

"تم ایک عورت کے ساتھ عمر بھر احسان کرتے رہو‘ لیکن اگر وہ کسی وقت تم سے کوئی معمولی بات بھی (خلاف طبیعت) دیکھ لے گی‘ تو فوراً کہہ اٹھے گی‘ میں نے تو

تیرے ہاں کبھی سکھ دیکھا ہی نہیں۔"

مسئلہ شہادتِ نسواں اور مرد و عورت کے درمیان فرق و اختلاف کی تین صورتیں:

ان تفصیلات سے واضح ہے کہ بہت سے معاملات میں مرد و عورت کے درمیان ان کی فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے اور دائرہ کار کے اختلاف کی وجہ سے فرق کیا گیا ہے۔ اس فرق و اختلاف کی بالعموم تین صورتیں ہیں۔

1 بعض کام تو ایسے ہیں جنہیں صرف مرد ہی کر سکتے ہیں' عورتیں نہیں کر سکتیں اور بعض کام عورتیں کر سکتی ہیں' مرد نہیں کر سکتے۔ دنیا کی کوئی طاقت ان میں تبدیلی کرنے پر قادر نہیں۔ جیسے مرد کا بار آور کرنا اور عورت کا حاملہ اور مرضعہ ہونا۔

2 اور بہت سے کام ایسے ہیں کہ جنہیں اگرچہ مردوں کی طرح عورتیں بھی کر سکتی ہیں' لیکن ان کاموں کو عورتوں پر فرض نہیں کیا گیا ہے' تاکہ عورت کا اصل دائرۂ کار (گھریلو زندگی) متاثر نہ ہو اور مردوں کے ساتھ عام اختلاط نہ ہو جو اسلام کے نزدیک سخت ناپسندیدہ ہے۔ نماز باجماعت' جمعہ' جنازے اور جہاد میں شرکت سے عورتوں کا استثناء اسی اصول پر مبنی ہے اور کسب معاش کے بوجھ سے بھی اسے اسی بنیاد پر فارغ رکھا گیا ہے۔

اسلام کے نزدیک عورت کا اپنے آپ کو صرف امور خانہ داری تک محدود رکھنا' اس عزت و شرف کے بقا کے لیے بھی ضروری ہے جو اس نے عورت کو عطا کیا ہے۔ خاندان کی حفاظت و صیانت کا بھی عین تقاضا ہے اور انسانی معاشرے کو فسادِ قلب و نظر سے بچانے کے نقطۂ نظر سے بھی ایک امر ناگزیر ہے۔

3 بہت سے معاملات ایسے ہیں کہ عورت اپنی فطری کمزوری کی وجہ سے ان کو اس طرح انجام نہیں دے سکتی جس طرح مرد اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے ان پر قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح مرد کو جسمانی قوت و طاقت عورت سے زیادہ عطا کی ہے' اسی طرح ذہنی و دماغی صلاحیتوں میں بھی وہ عورت سے فائق ہے۔ اس فطری کمزوری' یا فطری خوبیوں کی وجہ سے کسی کو حقیر سمجھنا اور کسی کو بالاتر مخلوق کا درجہ قرار دے دینا بلاشبہ صحیح نہیں ہے۔ قدرت نے جس سے جو کام لینا تھا' اس کے مطابق اس کو وہ صلاحیتیں عطا کی

ہیں۔ ان فطری صلاحیتوں کا انسانی شرف و کرامت سے کوئی تعلق نہیں ہے' اس اعتبار سے مرد و عورت دونوں یکساں ہیں۔ صلاحیتوں کے تفاوت کا مطلب' شرف و کرامت میں تفاوت نہیں ہے۔ تاہم صلاحیتوں میں فرق و تفاوت کو جھٹلانا بھی آفتاب نیم روز کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔

اس تیسری قسم میں عورتوں کی شہادت کا مسئلہ بھی ہے۔ جب یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ عورت بعض باتوں میں مرد سے مختلف اور ممتاز ہے۔ مثلاً:

- اس میں شرم و حیا کا مادہ زیادہ ہے۔
- وہ مرد کی طرح فصیح و بلیغ نہیں ہے۔
- وہ دماغی و ذہنی صلاحیتوں میں کچھ کمزور ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ضعف حافظہ' نسیان اور ذہول کا زیادہ شکار ہوتی ہے۔ جسے حدیث میں نقصانِ عقل اور قرآن کریم میں ﴿ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ﴾ (البقرة: ۲/۲۸۲) سے تعبیر کیا گیا ہے۔
- اسلام نے عورت کا مردوں کے ساتھ اختلاط اور گھر سے زیادہ باہر نکلنے کو ناپسند کیا ہے۔

اگر یہ ساری باتیں تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں تو پھر اس بات کے ماننے میں تامل کیوں ہے کہ مسئلہ شہادت میں بھی شریعت نے مرد کو فوقیت اور ترجیح دی ہے اور عورت کی گواہی کو بہ وقت ضرورت ہی تسلیم کیا ہے۔ عام حالات میں یا مردوں کی موجودگی میں اس کے گواہ بننے کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا ہے' کیونکہ شہادت کے تقاضوں کو عورتیں مردوں کی طرح نبھانے پر فطری طور پر قادر نہیں ہیں۔ (اس کی مزید تفصیل --مسئلہ شہادت نسواں' عقل و نقل کی روشنی میں-- کے عنوان سے کتاب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔)

عورت کی امتیازی خصوصیات کے بارے میں یہ چند اشارے ہیں۔ آئندہ صفحات میں ان کی تفصیل ہے اور ان شبہات کا ازالہ بھی' جو اس ضمن میں پیش کیے جاتے ہیں۔

حافظ صلاح الدین یوسف

دارالسلام' لاہور۔

-- ۱ --

عورت' خانگی امور اور پرورش اولاد کی ذمے دار

۱۔ تربیت اولاد میں عورت کا کردار: اللہ تعالیٰ نے عورت کی تخلیق کا مقصد یہ بیان فرمایا ہے کہ یہ مرد کی رفیقۂ حیات ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کے درمیان مودّت و محبّت کا ایسا تعلق قائم کر دیا ہے جو اٹوٹ اور لازوال ہے اور انسانی زندگی انہی دونوں کی رفاقت و محبت کا نام ہے۔

اس ارتباط و تعلق کا ذریعہ اللہ نے نکاح کو بنایا ہے۔ حیوانوں کی طرح محض جنسی خواہش پوری کر کے علیحدہ ہو جانا اور کسی بات کا ذمے وار نہ بننا' اسلام نے اسے سخت ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ اس لیے وہ مرد اور عورت کو اس وقت تک ایک دوسرے کے قریب ہونے کی اجازت نہیں دیتا' جب تک وہ دونوں نکاح کے ذریعے سے ایک عقد میں نہیں بندھ جاتے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک اور جیون ساتھی ہونے کا اقرار و اعتراف نہیں کر لیتے۔

اس عقد نکاح یا معاہدۂ رفاقت کے بعد جب ایک مرد اور عورت کے مابین رشتۂ ازدواج قائم ہوتا ہے تو اس سے ایک نئے خاندان کی بنیاد پڑتی ہے۔ یہ دو سے تین' چار' حتیٰ کہ درجن یا اس سے کم و بیش' حسب مشیت الٰہی' ہو جاتے ہیں۔ اس بڑھتے ہوئے خاندان کی کفالت و تربیت بھی ان دونوں ہی کی ذمے داری ہوتی ہے' جو آپس میں تو میاں بیوی ہوتے ہیں لیکن نئے افراد خاندان کے ماں باپ کہلاتے ہیں۔

ماں کو اللہ تعالیٰ نے معاش کی ذمے داریوں سے فارغ رکھا ہے۔ یہ ذمے داری کلیۃً باپ کے سپرد کی گئی ہے کہ وہ گھر سے باہر جا کر کاروبار کرے' ملازمت' یا محنت مزدوری کرے' یا کھیتی باڑی کرے' کسب معاش کے لیے جو بھی صورت وہ اختیار کرے' اپنی صلاحیت اور پسند کے مطابق وہ کر سکتا ہے۔ وہ اپنے لیے اور بیوی بچوں کے لیے کمائے' ان کے لیے رہائش' خوراک و پوشاک' علاج اور دیگر ضروریات زندگی مہیا کرے۔ ماں گھر کی

چاردیواری کے اندر رہ کر امور خانہ داری کے ساتھ ساتھ خاوند کی خدمت اور بچوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کا کام کرے تاکہ بچوں کا باپ یکسوئی اور بے فکری کے ساتھ کسب معاش کے لیے محنت اور جدوجہد کرتا رہے۔ گھر سے نکلنے کے بعد اسے یہ فکر نہ ہو کہ گھر کی حفاظت کون کرے گا۔ اس کے معصوم بچوں کو کون سنبھالے گا؟ اور ہانڈی روٹی پکانے کا کام کون انجام دے گا؟

گویا اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت دونوں کا دائرہ کار متعین کر دیا ہے' تاکہ زندگی کی گاڑی' جس کے دو پہیے ہیں' شاہراہ حیات پر گامزن اور رواں دواں رہے۔ مرد کا دائرہ کار' بیرونِ در ہے' اور عورت کا دائرہ کار اندرونِ در' یعنی گھر کی چاردیواری ہے۔ مرد اپنے دائرے میں محنت اور جدوجہد کرے اور اپنے مفوضہ فرائض ادا کرے اور عورت اپنی ذمے داری پوری کرے اور اس میں کوتاہی نہ کرے' کیونکہ دونوں ہی کی مشترکہ کاوشوں سے یہ باغ ثمر آور ہو گا جن کے بوٹوں کو انھوں نے اپنے خون جگر سے سینچا ہے' یہ خاندان پروان چڑھے گا جو ان دونوں کے ملاپ سے معرض وجود میں آیا ہے اور یہ نونہال معاشرے کے بہترین فرد بنیں گے جو ان کے مستقبل کی امیدوں کا مرجع اور حسین آرزوؤں کا محور ہیں۔

اس اعتبار سے تربیت اولاد میں ماں کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اولاً تو اس لیے کہ ماں کی گود ہی بچے کا وہ پہلا گہوارہ ہے جہاں وہ آنکھیں کھولتا ہے۔ اس کی کل کائنات ماں کی شفقت و محبت ہی ہوتی ہے۔ ماں کی محبت آمیز مسکراہٹ اور شفقت بھرا ہاتھ ہی اس کا سہارا ہوتا ہے اور ماں کی چھاتی سے اسے وہ لطیف غذا ملتی ہے جس سے اس کی جسمانی نشوونما ہوتی ہے۔ ثانیاً جب وہ چلنے پھرنے لگتا ہے اور کچھ بول اس کی زبان سے نکلنے شروع ہوتے ہیں' تو باپ تو باہر کسب معاش میں سرگرداں ہوتا ہے' ماں کی گود ہی اس کا پہلا مدرسہ بنتا ہے' جہاں سے اس کی تعلیم کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ تعلیم نہایت بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اس وقت بچے کا ذہن سلیٹ یا بلیک بورڈ کی طرح بالکل صاف ہوتا ہے۔ اس پر جو بھی لکھ دیا جائے' یعنی اسے ذہن نشین کرایا جائے' وہ اس کے دل و دماغ میں نقش ہو جاتا ہے اسی بات کو نبی کریم ﷺ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

«كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ»(صحيح البخاري، الجنائز، باب ما قيل في أولاد المشركين، ح:١٣٨٥)

"ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے' پھر اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں"

یعنی اس کے ذہن کے تختۂ سیاہ پر جس مذہب کی بھی تحریر درج کر دی جائے وہ اَلنَّقْشُ كَالْحَجَرِ کی طرح اس کے لوح قلب پر ثبت ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مائیں اگر صحیح مسلمان ہوں گی' اسلامی تعلیم و تربیت کے زیور سے آراستہ ہوں گی اور اسلامی جذبات و احساسات سے سرشار ہوں گی' تو ان کی گودوں میں پلنے والے بچے بھی صحیح مسلمان ہوں گے' ان کی تعلیم و تربیت سے اسلام کی حقانیت و صداقت کا نقش ان کے دل و دماغ میں ثبت ہو جائے گا اور اسلام کی تعلیمات کو اپنانے اور اختیار کرنے کا سچا جذبہ ان کے اندر پیدا ہو گا۔

اس لیے ایک عورت کو اسلامی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کا مطلب ہے' ایک پورے خاندان کو اسلامی سانچے میں ڈھال دینے کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔ یہ اسلامی معاشرے کو سدھارنے کا ایک فطری طریقہ ہے۔ کیونکہ خاندانوں ہی سے قبیلے اور برادریاں بنتی ہیں اور قبیلے اور برادریاں ہی پھیل کر معاشرہ بنتی ہیں۔ اگر مذکورہ فطری طریقے کے مطابق ہر خاندان کے سربراہ۔ ماں اور باپ۔ اپنے اپنے زیر کفالت و زیر تربیت خاندانوں کی صحیح تربیت کا اہتمام کریں' تو معاشرتی اصلاح کا آغاز ہو سکتا ہے' بشرطیکہ ماں ایک معلّمہ' مبلغہ اور داعیہ کا کردار ادا کرے۔

تجربات نے واضح کیا ہے کہ انتخابات کے ذریعے سے' سیاست کے ذریعے سے' حکمرانوں یا حکمران جماعتوں کی تبدیلیوں سے معاشرہ اصلاح پذیر نہیں ہو گا' بلکہ ان سے بگاڑ اور فساد میں مزید اضافہ ہی ہو گا' جیسا کہ ہو رہا ہے۔ اصلاح مطلوب ہے تو اس کا آغاز ماں کی گود سے کیا جائے اور یہاں سے آغاز کرنے کا مطلب ہے کہ اس ابتدائی اسکول کو آوارہ' بے پردہ اور اپنے دائرہ کار سے تجاوز کرنے سے روکا جائے اور اس کے اندر اسلامی احساس و شعور بیدار کر کے اس سے بچوں کی اسلامی تعلیم و تربیت کا کام لیا جائے۔

-- ۲ --

پردے کے احکام و آداب

پردے کا حکم اور مردوں سے اختلاط کی ممانعت: مسلمان عورت کے لیے پردے کا حکم بھی ان امتیازات میں سے ہے جس میں وہ مردوں سے ممتاز اور اس کی وجہ سے اسلام دوسرے مذاہب سے ممتاز ہے' اور مقصد اس سے مسلمان عورت کا تحفظ ہے۔ مسلمان عورت کی عزت و ناموس اور اس کی کرامت و نجابت کی حفاظت اور اس کو شبہات سے بچانے کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایک تو مرد اور عورت کو باہمی اختلاط (مل کر پڑھنے' مل کر کام کرنے' مل کر بے محابا گفتگو کرنے اور بے باکانہ میل ملاقات) سے روک دیا ہے اور دوسرے' عورت کے لیے حجاب (پردے) کی پابندی کو ضروری قرار دیا ہے۔ پس عورت کے لیے پردہ ایسے درخت کی حیثیت رکھتا ہے جس کے سائے میں وہ سکون محسوس کرتی اور اس کے دامن میں پناہ حاصل کرتی ہے۔

حجاب' کوئی قید اور قدغن نہیں جس سے گھٹن محسوس کی جائے' کوئی بوجھ نہیں جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تدبیر کی جائے اور کوئی ناروا پابندی نہیں جس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جائے' جیسا کہ اسلام دشمن عناصر' لادین قسم کے لوگ اور مغرب زدہ حضرات باور کراتے ہیں' بلکہ پردے کا حکم اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام نے عورت کو ایک نہایت بیش قیمت متاع قرار دیا ہے' اسی لیے اس کی حفاظت و صیانت کا خصوصی اہتمام کیا ہے' کیونکہ ہر قیمتی چیز کو چھپا کر رکھا جاتا اور اس کی حفاظت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

اس لیے دشمنوں کے مکروکید کو سمجھنا اور ان کے حسین جالوں سے بچنا اور ان کی سازشوں کو ناکام بنانا ضروری ہے۔

بنابریں ہر مسلمان عورت حجاب کے شرعی تقاضوں کی پابندی کر کے اپنے ایمان کی بھی حفاظت کرے اور دشمنانِ اسلام کے مذموم اور مکروہ عزائم کو بھی خاک میں ملا دے۔

پردے کی اہمیت اور اس کی افادیت و ضرورت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور مارکیٹ میں اس موضوع پر بہت مواد موجود ہے' اس لیے ذیل میں صرف شرعی پردے کے آداب و شرائط اور اختلاط کی ممانعت کے ضروری مسائل بیان کیے جاتے ہیں' تاکہ ہر مسلمان عورت ان کو سامنے رکھے اور ان کی پابندی کرے۔ مَردوں کی بھی ذمے داری ہے کہ وہ اپنی جوان بچیوں' بہنوں' ماؤں اور بیویوں کو تلقین کریں کہ وہ ہر جگہ --گھر کے اندر ہوں یا گھر سے باہر-- ان پابندیوں کا اہتمام کریں۔

پردے کا حکم اور اس کے آداب: عورت کو پردے کا جو حکم دیا گیا ہے' اس کے تقاضوں کی ادائیگی کے لیے علماء نے اس کے آٹھ آداب بیان فرمائے ہیں' تاکہ صحیح معنوں میں پردہ ہو سکے' ان آداب و شرائط کے بغیر شرعی پردہ نہیں ہوتا' یہ آداب حسب ذیل ہیں۔

- چادر یا برقع ایسا ہو جو سر سے لے کر پیروں تک پورے جسم کو ڈھانپ لے' چہرہ نظر آئے نہ بازو' چھاتی نظر آئے نہ گدی' حتیٰ کہ ہاتھ اور پیر بھی نظر نہ آئیں۔
- چادر یا برقع بھی بجائے خود زینت یعنی جاذب نظر نہ ہو' جیسے اس پر کڑھائی کا کام کیا گیا ہو' یا پر کشش رنگ کا حامل ہو یا اتنا خوب صورت اور نفیس ہو کہ بے اختیار مردوں کی نظریں عورت کی طرف اٹھ جائیں۔ گویا مذکورہ قسم کی چادر یا برقعے سے بھی پردے کی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔
- حجاب' ایسے باریک اور شفاف کپڑے کا نہ ہو جس میں عورت کا جسم جھلکے' گویا چادر یا برقع یا کپڑا سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ موٹا بھی ہو۔
- حجاب ڈھیلا ڈھالا ہو۔ اس طرح تنگ نہ ہو کہ جسم کا انگ انگ اس سے نمایاں ہوتا ہو' یا فتنے میں ڈالنے والی جگہیں واضح ہوں یا اس سے جسمانی ساخت اور اس کے خدوخال کی غمازی ہوتی ہو۔
- اس کے کپڑے سینٹ یا خوشبو سے معطر نہ ہوں۔
- مَردوں کے سے لباس کی طرح نہ ہوں۔
- اسی طرح کافر عورتوں کے لباس کی طرح نہ ہوں' جیسے منی سکرٹ' یا ساڑھی' لہنگا

وغیرہ۔ اس لیے کہ کافروں کی مشابہت بھی ممنوع ہے۔ ((مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ)) (ابو داؤد' اللباس' باب في لبس الشهرة' حديث : ۴۰۳۱) "اور جو جس کی مشابہت اختیار کرے گا وہ انہی میں سے ہو گا۔"

❁ شہرت و ناموری والا لباس نہ ہو۔ اس لیے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ لَبِسَ ثَوبَ شُهْرَةٍ اَلْبَسَهُ اللّٰهُ يَومَ الْقِيَامَةِ مِثْلَهُ)) (زاد عن ابی عوانة ((ثُمَّ تُلَهَّبُ فِيهِ النَّارُ)) (ابو داؤد' حديث : ۴۰۲۹) "جس نے شہرت کا لباس پہنا' اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن اس جیسا ہی لباس پہنائے گا' پھر اس میں جہنم کی آگ کو بھڑکایا جائے گا۔"

کن کن لوگوں سے پردہ ضروری اور اختلاط (میل جول) منع ہے: لوگ سمجھتے ہیں کہ عورت کے لیے پردہ اسی وقت ضروری ہے جب وہ گھر سے باہر نکلے اور اسی طرح میل جول بھی صرف انہی سے منع ہے جو بیگانے ہیں' ورنہ گھر میں وہ اپنے رشتے داروں کے ساتھ جس طرح چاہے رہے' پردے کے منافی نہیں۔ اسی طرح اپنے رشتے داروں کے ساتھ جس طرح چاہے' میل جول رکھے' ان سے ہنسی مذاق کرے اور ان سے خلوت و جلوت میں بے باکانہ گفتگو کرے' اس میں کوئی حرج نہیں۔ یہ دونوں ہی باتیں غلط ہیں۔

ایسے گھروں میں جہاں خاوند کے دوسرے بھائی بھی رہتے ہوں' عورت کو ڈھیلے ڈھالے اور ساتر لباس میں رہنا چاہیے' جس سے عورت کے بازو نظر آئیں نہ چھاتی اور گدی وغیرہ۔ اسی طرح عورت کے لیے دیوروں اور جیٹھوں سے پردہ کرنا بھی ضروری ہے اور یہ پردہ اس طرح نہایت آسانی سے ممکن ہے کہ ایک تو مذکورہ انداز میں ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے جس سے اس کی زینت کا اظہار اور فتنے والی جگہیں آشکارا نہ ہوں۔ دوسرے' دیور اور جیٹھ وغیرہ کے سامنے آنے پر گھونگٹ نکال لے' علاوہ ازیں ان سے بے باکانہ انداز میں گفتگو نہ کرے' بلکہ حسب ضرورت مختصر بات کرے اور ان کے ساتھ تنہائی بالکل اختیار نہ کرے۔

حسب ذیل رشتے داروں اور لوگوں سے اختلاط ممنوع ہے: بہرحال شرعی ہدایات کی روشنی میں جن جن رشتے داروں سے پردہ کرنا ضروری اور ان سے اختلاط منع ہے' ان کی تفصیل' علماء کی وضاحت کی روشنی میں' حسب ذیل ہے۔

- چچا زاد' ماموں زاد' خالہ زاد' پھوپھی زاد بھائی کا اپنی چچا زاد' ماموں زاد' خالہ زاد اور پھوپھی زاد بہن سے اختلاط۔
- عورت کا اپنے دیور' جیٹھ' بہنوئی سے اختلاط۔
- عورت کے رضاعی بھائی کا اپنی رضاعی بہن کی بہنوں سے اختلاط۔

مذکورہ تمام اختلاط ممنوع ہیں۔ اختلاط کا مطلب' ان سے بے پردہ ہو کر بلا تکلف گفتگو اور ہنسی مذاق کرنا اور خلوت میں بھی ان سے ملاقات کرنا ہے۔

- منگیتر کا اپنی منگیتر سے اختلاط بھی ممنوع ہے' البتہ نکاح سے قبل ولی کی موجودگی میں اسے ایک نظر دیکھ لینا مستحب ہے۔
- شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں بیروں یا نوجوان لڑکوں کا عورتوں کی خدمت پر مامور ہونا۔
- نکاح کے بعد دولہا دلہن کا اپنے رشتے داروں کے ساتھ لوگوں کے سامنے گروپ کی صورت میں بیٹھنا اور تصویریں اتروانا' وغیرہ۔
- اسی طرح دولہا دلہن کے رشتے داروں کا عورتوں کے سامنے گروپ بنا کر بیٹھنا' وغیرہ۔
- عمر رسیدہ خواتین کا اجنبی مردوں کے ساتھ تنہائی میں خلوت اختیار کرنا۔
- عورت کا اجنبی مردوں کے ساتھ اختلاط' یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ تو ہمارے ہی قبیلے یا برادری کے افراد ہیں۔
- یا اس نقطۂ نظر سے مردوں سے اختلاط' کہ اصل پردہ تو دل کا پردہ ہے' یعنی دل پاکیزہ ہوں' آنکھ میں حیا ہو' تو یہی پردہ ہے۔ جسمانی پردہ ضروری نہیں۔
- ان بچیوں کے ساتھ اختلاط میں تساہل جو قریب البلوغت ہوں' یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ تو ابھی بچیاں ہیں۔
- ٹیکسی' رکشے میں اکیلی عورت کا سفر کرنا' جب کہ ڈرائیور اجنبی ہو۔
- بغیر محرم کے عورت کا حج کے سفر پر جانا۔
- کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لڑکیوں کا لڑکوں کے ساتھ مل کر پڑھنا اور اسی طرح

جامعات کی دیگر سرگرمیوں میں ان کا باہم اختلاط۔

- کالجوں' یونیورسٹیوں اور دیگر مدارس میں عورتوں کا مَردوں کو پڑھانا یا مَردوں کا عورتوں کو پڑھانا۔
- حتیٰ کہ پرائمری کلاسوں میں بھی عورتوں کا بچوں کو پڑھانا' بتدریج اختلاط کی راہ ہموار کرنا ہے۔
- لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے نام پر مغرب کی یونیورسٹیوں میں بھیجنا' ان کو مغربی افکار اور اس کی حیا باختہ تہذیب کا شکار بنانا ہے۔
- اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں عملی تربیت کے نام پر لڑکے لڑکیوں کا اختلاط۔
- یونیورسٹیوں میں ایم اے اور پی ایچ ڈی وغیرہ کے مقالات کی تیاری میں بطور رہنما اور نگران کے مردوں کا عورتوں کے ساتھ خلوت (تنہائی) میں میل ملاقات۔
- علمی اجتماعات' کانفرنسوں' مشاعروں اور دیگر اس قسم کی تقریبات میں مرد و عورت کا پہلو بہ پہلو بیٹھنا۔
- نرسوں اور خاتون ڈاکٹر کا اجنبی مردوں' حتیٰ کہ ڈاکٹروں اور ہسپتال کے دیگر مرد ملازمین کے ساتھ اختلاط۔
- ڈاکٹر کی نرس یا لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ خلوت۔
- ڈاکٹر کی غیر محرم مریضہ کے ساتھ خلوت۔
- بغیر حاجت یا ضرورت کے' یا لیڈی ڈاکٹر کی موجودگی میں' عورت کا مرد ڈاکٹر کے سامنے چہرہ وغیرہ ننگا کرنا۔
- استقبالیہ یا الوداعی وغیرہ مجلسوں میں عورتوں کا مردوں کے ساتھ اختلاط۔
- طبی تجربہ گاہوں سے عملی تربیت کے عنوان پر مردوں اور عورتوں کا اختلاط۔
- کھیل کود کے میدانوں اور مواقع پر عورتوں کا مردوں سے اختلاط۔
- ہوٹلوں یا کھانے پینے کی دیگر تقریبات میں عورتوں اور مردوں کا اختلاط۔
- دکان یا شو روم وغیرہ میں عورت کا مردوں سے اختلاط یا خلوت۔

* مارکیٹوں میں عورتوں کا مردوں سے اختلاط۔
* بغیر محرم کے عورت کا بس' ریل یا ہوائی جہاز میں سفر کرنا۔
* عورتوں کا فوٹوگرافروں سے تصویریں کھنچوانا۔
* بدعات پر مبنی اجتماعات (جیسے میلاد' محفل شب معراج وغیرہ) اور اسی طرح تبلیغی جلسوں میں مردوں اور عورتوں کا اختلاط۔
* مرد ٹیوٹر کا کسی بھی عمر کی بچیوں کو پڑھانا یا عورت ٹیوٹر کا لڑکوں کو پڑھانا۔

اختلاط کی مذکورہ تمام صورتیں اور اس قسم کی دوسری صورتیں جن کی شرعاً اجازت نہیں' سب ممنوع اور حرام ہیں۔ مغربی تہذیب کی نقالی میں بے پردگی وبائے عام کی شکل اختیار کر گئی ہے' جس کی وجہ سے اب مرد و عورت کے اختلاط میں لوگ کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔ اس لیے بے پردگی کے ساتھ ساتھ اختلاط کا فتنہ بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ حالانکہ جب بے پردگی ہی جائز نہیں' تو پھر اختلاط کا جواز کیوں کر ممکن ہے؟ یہ تو بنائے فاسد علی الفاسد کی واضح صورت ہے۔

بنابریں مسلمان عورتوں کو اختلاط کی مذکورہ صورتوں سے اپنے کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مردوں کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی بیویوں' ماؤں' بہنوں اور بیٹیوں کو پردے کی اہمیت و ضرورت سے بھی آگاہ کریں اور بے پردگی اور مردوں سے اختلاط کے مفاسد و خطرات سے بھی انہیں خبردار کریں' تاکہ وہ ان سے بچنے کا اہتمام کریں۔

ملحوظہ : عورت کا جن مردوں سے اختلاط ممنوع اور ان سے پردہ ضروری ہے' ان سے مراد اجنبی مرد ہیں اور اجنبی مرد کون ہیں؟ تو یاد رکھیے' خاوند اور محرم کے علاوہ جتنے بھی لوگ ہیں وہ سب شریعت کی رو سے اجنبی ہیں اور محرم کون کون ہیں جن سے پردہ کرنا ضروری نہیں' وہ حسب ذیل ہیں۔

نسبی محارم : باپ' دادا' بیٹا' پوتا' پرپوتا' چچا' ماموں' بھانجا اور بھتیجا۔

سسرالی محارم : سسر' داماد' خاوند کا بیٹا۔

رضاعی محارم : رضاعت سے ثابت ہونے والے مذکورہ رشتے' کیونکہ حدیث میں ہے'

"رضاعت سے بھی وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے ہوتے ہیں۔" (صحیح مسلم' الرضاع' باب یحرم من الرضاعة ما یحرم من الولادة' حدیث: ۱۴۴۴)

ان مذکورہ رشتوں میں سے کسی کے ساتھ عورت کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہ سب عورت کے محرم ہیں' ان سے پردہ کرنا ضروری نہیں۔ ان کے علاوہ جتنے بھی لوگ ہیں' سب غیر محرم ہیں' ان سے پردہ کرنا ضروری ہے۔

مثالی مسلمان عورت کی صفات: اے مسلمان بہن! اپنی حیثیت اور اس عزت و تکریم پر غور کر جس سے اللہ نے تجھے نوازا ہے۔ ہر قیمتی چیز کا' اگر وہ ٹوٹ جائے یا ضائع یا چوری ہو جائے' بدل ممکن ہے۔ لیکن اگر تیری عفت و عصمت داغ دار ہو جائے' تیری عزت و تکریم کو بٹہ لگ جائے اور تیری شرافت و نجابت موضوعِ بحث بن جائے' تو اس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے تیرا سب سے قیمتی جوہر' تیری عزت و عصمت ہے جو لٹ جائے تو کوئی اس کا معاوضہ نہیں دے سکتا۔

یہ تیری ردائے تقدس ہے جو تار تار ہو جائے' تو اس کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔

تیرا آبگینۂ ناموس ہے جو ٹوٹ جائے' تو کوئی اسے جوڑ نہیں سکتا۔

پس تیری عزت اسی میں ہے کہ تو اپنی عصمت کی' اپنے تقدس کی چادر کی اور اپنے ناموس کے آبگینے کی حفاظت کر۔ یہ حفاظت کس طرح ممکن ہے؟ یہ اس طرح ممکن ہے کہ تو کچھ چیزوں کو اختیار اور کچھ چیزوں سے اجتناب کر۔

اختیار کرنے والے اہم کام: مسلمان عورت کے لیے جن چیزوں کو اختیار کرنا اور اپنانا لازم ہے' وہ حسب ذیل ہیں:

- تجھے محبت ہو' صرف اللہ سے' اللہ کے رسول سے اور ان لوگوں سے جو اللہ کے دین کے پابند ہیں۔
- تیری خلوت ہو' آخرت کی یاد دہانی اور ایسے اعمال پر غور کرنے کے لیے جو تیری قبر سے ظلمتوں کو دور کرنے کا باعث اور لحد کی تنگیوں کو فراخی میں بدلنے کا ذریعہ ہوں۔
- تیری سہیلیاں صرف وہ ہوں' جو مسلمان اور مومن ہوں' اللہ کے دین کی مکمل پابند

ہوں۔

- تیرے دشمن ہوں' ہر قسم کے گانے اور بجانے کے آلات (ریڈیو' ٹی وی' فلمیں' وی سی آر اور ویڈیو وغیرہ) موسیقی کے آلات' تمام وہ رسائل و اخبارات جو بے حیائی پر مبنی مضامین' تصویریں اور گمراہ کن افکار و تصورات شائع کرتے ہیں' بے پردہ اور کھلے عام زیب و زینت کا اظہار کرنے والی ہر عورت اور ہر وہ شخص جو رب کی ناراضی پر مبنی کام کرنے والا ہو۔
- تجھے نفرت ہو' یہود و نصاریٰ سے' منافقین سے' لادینوں سے اور آزادیٔ نسواں کے پُرفریب نعرے لگا کر عورتوں کو گمراہ کرنے والوں سے۔
- تجھے حرص ہو' خالص اور سچی توبہ کی' اس کے آداب و شرائط کے ساتھ' نہ کہ محض زبان سے جھوٹی توبہ کی۔
- تیرا مقصد زندگی ہو' انابت الی اللہ' بارگاہ الٰہی میں استغفار' آخرت کی تیاری اور رضائے الٰہی کا حصول۔
- تیری شادی بیاہ کی تقریبات' پاک ہوں جاہلانہ رسموں سے' بینڈ باجوں سے' پٹاخوں اور آتش بازی کے خطرناک مظاہر سے' میوزک کی دھنوں سے' رقص و سرود کی محفلوں اور شراب و شاہد کی سرمستیوں سے' ویڈیو سے' زیورات اور کپڑوں کی نمائش اور میک اپ کے ذریعے سے برپا ہونے والے نور و نکہت کے طوفان سے' جہیز اور بَری کی مسرفانہ رسموں سے' بے پردگی اور مَردوں کے اختلاط سے۔
- تیری آرزو' خواہش اور کوشش ہو' ایک مسلمان خاندان کی بنیاد ڈالنے کی' اپنی نسل کی اسلامی خطوط پر تربیت کرنے کی اور اس میں اسلامی روح و جذبہ پیدا کرنے کی۔

وہ کام' جن سے اجتناب کرنا ضروری ہے: اور مسلمان عورت کو جن چیزوں سے اجتناب کرنا ضروری ہے' وہ حسب ذیل ہیں:

- دینی اقدار و روایات کا استہزاء و استخفاف کرنے' اور کرنے والوں سے اجتناب۔
- دین میں بدعات ایجاد کرنے اور بدعات میں حصہ لینے سے اجتناب۔

- نماز کے چھوڑ دینے یا اس میں غفلت و تساہل اختیار کرنے یا بلاوجہ اس میں تاخیر کرنے سے اجتناب۔
- غیر مَردوں کے سامنے زیب و زینت کے اظہار اور بے پردگی سے اجتناب۔
- غیبت' لعن طعن اور چغل خوری سے اجتناب۔
- کافر اور مغرب کی اخلاق باختہ عورتوں کی تقلید سے' ان کی محبت اور ان کو اچھا سمجھنے سے اجتناب۔
- بغیر ضرورت کے گھر سے نکلنے سے اجتناب۔
- آخرت فراموشی سے اور خاوند کی ناشکری کرنے سے اجتناب۔
- خاوند اور والدین کی نافرمانی سے اجتناب۔
- بے حیاء بنانے والے اخبارات' رسالوں اور اسی قسم کے دیگر آلات و رسائل سے اجتناب۔
- مذکورہ تمام باتوں سے اجتناب' مثالی مسلمان عورت بننے کے لیے ضروری ہے۔

یہ چند ضروری ہدایات ہیں جن کی مخاطب ہر مسلمان ماں' بہن' بیٹی' طالبہ اور استانی اور جوان اور بوڑھی ہے۔ ان میں دین و دنیا کی سعادتیں ہیں۔ ان پر عمل کر کے ان سعادتوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیں اور فوز و فلاح کو اپنا مقدر بنالیں۔ وَمَا عَلَیْنَا الاَّ الْبَلاَغُ۔

-- ۳ --

عورت اور تعلیم ؟

آج کل عورت کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کا بڑا غلغلہ ہے۔ ٹھیک ہے۔ اسلام میں بھی طلب علم ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے اس لئے تعلیم کی اہمیت' افادیت اور ضرورت سے انکار نہیں ہے' لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کون سی تعلیم ہے جس سے عورت کو آراستہ کیا جائے۔ سائنس کی' اقتصادیات کی' سیاست اور تاریخ کی' ریاضی اور فلسفے کی' ادب و صحافت کی' پولی ٹیکنک اور انجینئرنگ کی؟ نہیں نہیں ان میں سے کوئی بھی تعلیم عورت کے لیے ضروری نہیں ہے' بلکہ یہ سب شعبے اس کے مقصد وجود اور اس کی فطری صلاحیتوں کے خلاف ہیں اس لیے ان میں سے کسی بھی شعبے میں اس کو تعلیم دلانا' اسلام کے مقصد و منشا کے خلاف ہے۔ تعلیم سے مراد صرف دینی تعلیم ہے۔ عورت کو دینی تعلیم و تربیت سے بہرہ ور کیا جائے' تا کہ وہ بچوں کی دینی خطوط پر تعلیم و تربیت کا اہتمام کر سکے' یا ان عورتوں کو اسکولوں میں پرائمری کی حد تک بچوں کو پڑھانے پر مامور کر دیا جائے' جو عورتیں اس کے لیے وقت نکال سکیں۔

اس کے علاوہ عورتیں میڈیکل کی تعلیم حاصل کر سکتی ہیں' بشرطیکہ ایسے میڈیکل کالج ہوں جہاں پڑھانے والی صرف عورتیں ہی ہوں' اس طرح میڈیکل تعلیم حاصل کر کے عورتوں کا علاج معالجہ کریں' کیونکہ اس شعبے میں وہ حجاب کی پابندیوں کے ساتھ عورتوں کی خدمت کر سکتی ہیں۔ حجاب کی پابندیوں کو نظر انداز کر کے عورتوں کو مردوں والی تعلیم دلانا' نہ صرف یہ کہ بے مقصد ہے بلکہ دین کے لیے سخت خطرناک ہے۔ اسلامی ملکوں میں مخلوط تعلیم کا فتنہ بھی اسی لیے روز افزوں ہے کہ مسلمان اپنی بچیوں کو' سوچے سمجھے بغیر اور اپنے مذہب کی تعلیمات پر غور کیے بغیر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے سپرد کر رہے ہیں اور وہ وہاں

وہی نصاب پڑھتی ہیں جو لڑکے پڑھتے ہیں اور بالعموم جو صرف لڑکوں ہی کے لیے ہے اور کوئی لڑکی اسے پڑھ کر لڑکا بنے بغیر' اس کے تقاضوں کی تکمیل نہیں کر سکتی۔

اس لیے ضروری ہے کہ عورت کے دائرہ عمل کو اگر بڑھانا ہے تو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کے لیے سرگرمیوں کا تعین اور کچھ مخصوص شعبوں کا انتخاب کیا جائے اور پھر اس کے مطابق نصاب تیار کیا اور پڑھایا جائے' تاکہ مسلمان عورت اپنے مقصد تخلیق اور اسلام کے منشاء کے مطابق حیاء و حجاب کی پابندی کے ساتھ' اپنے دائرے میں' ملک و قوم کی مزید خدمت کرنا چاہے تو کر سکے۔ ورنہ وہ جو خدمت پہلے سے ہی سرانجام دیتی آ رہی ہے اس پر قناعت کی جائے' کیونکہ وہ بھی بہت بڑی خدمت ہے اس کی اس خدمت کو حقیر سمجھا جائے' نہ اس کی وجہ سے اس کی شخصیت کو کم تر خیال کیا جائے' کیونکہ یہ دونوں ہی باتیں خلاف واقعہ ہیں۔ عورت بھی مرد کی طرح عظیم اور مرد ہی کی طرح عزت و احترام کی مستحق ہے۔

لاکھوں بے روزگار مردوں کی موجودگی میں عورتوں کی ملازمت کا کوئی جواز نہیں:

علاوہ ازیں ایک ایسے ملک میں' جہاں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں مرد بے روزگار ہیں' ان کے پاس ڈگریاں موجود ہیں' لیکن سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں ان کے لیے کام کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ ڈگریاں لیے در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ وہاں عورتوں کو بھی بلا سوچے وہی تعلیم دینے اور وہی ڈگریاں جاری کرنے کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ پہلے تمام تعلیم یافتہ ڈگری ہولڈروں کے روزگار اور ملازمتوں کا انتظام کیجئے۔ ان کی کھپت کے باوجود بھی کارکنوں' ہنرمندوں اور تعلیم یافتگان کی ضرورت ہو تو پھر بھی مردوں کے میدان اور دائرہ عمل میں عورتوں کی ملازمت کا کوئی جواز سمجھ میں آ سکتا ہے اور ان کے یکساں نصاب تعلیم کا مسئلہ چل سکتا ہے۔ لیکن بحالات موجودہ دونوں باتوں کا قطعاً کوئی جواز نہیں ہے۔

لاکھوں تعلیم یافتہ بے روزگار مردوں کی موجودگی میں' ہر شعبۂ زندگی میں عورتوں کو ملازمتیں مہیا کرنے کی پالیسی مغرب کی اندھا دھند نقالی کے سوا کچھ نہیں۔ اس سے ملک کو

ترقی نہیں، تنزلی ملے گی اور اخلاقی قباحتوں کا جو طوفان برپا ہو گا وہ اس پر مستزاد۔ مغرب کی اس پالیسی سے کارخانوں اور دفتروں میں کچھ "رونق" ضرور بہم پہنچ گئی ہے اور مردوں کی ہوسناکی کی تسکین کا کچھ سامان یقیناً ہو گیا ہے لیکن اس پالیسی نے ان کے خاندانی نظام کا تیاپانچا کر کے رکھ دیا ہے۔ وہاں اولاد ماں باپ سے بیزار اور ماں باپ اولاد سے بیزار ہیں۔ میاں، بیوی سے متنفر اور بیوی، میاں سے متنفر ہے۔ بالخصوص بوڑھے ماں باپ کا کوئی پرسان حال نہیں۔ وہ اپنا بڑھاپا، حکومت کے مہیا کردہ "اولڈ ہوموں" میں گزارنے پر مجبور ہیں۔ اس کے مقابلے میں اسلام میں خاندان ایک اکائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جوان اولاد کو تاکید ہے کہ وہ والدین کی خدمت و اطاعت کریں، بالخصوص ان کے بڑھاپے میں ان کو اولاد کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس لیے اولاد بڑھاپے میں ان کا زیادہ خیال رکھے، ان کے نازک جذبات کو ذرا سی بھی ٹھیس نہ پہنچائے اور ان کے ادب و احترام میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرے۔

جب مادیت کا اتنا غلبہ ہو جائے کہ گھر کا ہر فرد چاہے وہ عورت ہو یا مرد، جوان ہو یا بوڑھا، معاشی مشین کا کل پرزہ ضرور بنے، ورنہ اس کے لیے گھر میں رہنے کی کوئی جگہ نہیں ہوگی، تو پھر از کار رفتہ، ریٹائرڈ اور ضعیف و ناتواں ماں باپ کو کون اپنے گھر پر رکھ کر ان کو نان نفقہ اور ضروریات زندگی مہیا کرنے پر آمادہ ہو گا؟

مادیت کے اس غلبے میں "معیار زندگی" بلند کرنے کے نعرے کا بھی بڑا دخل ہے۔ معیار زندگی بلند کرنے کا مطلب یہ لیا اور پھیلایا جا رہا ہے کہ نہایت عالی شان بنگلہ، کوٹھی یا مکان ہو، جس میں دنیا بھر کی آسائشیں بہم ہوں۔ چنانچہ ان آسائشوں کے حصول کے لیے مرد و عورت کی تمیز کے بغیر گھر کا ہر فرد کمائی کرتا ہے، تاکہ وہ اپنا معیار زندگی بلند کرنے میں کسی سے پیچھے نہ رہ جائے۔ اس نعرے نے بھی بڑی قیامت ڈھائی ہے اور لوگوں نے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے درمیان تفریق کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اولا تو یہ نعرہ ہی غلط اور "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کا آئینہ دار ہے۔ اس کی جگہ معیار اخلاق بلند کرنے کا نعرہ قوم کو دیا جانا چاہیے۔ کہ اصل سکون و راحت، آسائشوں کی فراوانی سے نہیں۔ حسن

اخلاق اور رفعت کردار کی ارزانی ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ ضروری ہے کہ ہر شخص نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان کو سامنے رکھے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ تم ہمیشہ ایسے لوگوں کو دیکھو جو دنیوی نعمتوں اور آسائشوں میں تم سے کمتر ہوں' اسی طرح تم اللہ کی نعمتوں کی قدر اور اس کا شکر ادا کر سکو گے۔ اس کے برعکس اپنے سے برتر پر نظر رکھو گے تو اللہ کی نعمتوں کی ناقدری بھی کرو گے اور اس کی ناشکری بھی۔ (صحیح مسلم' الزھد' باب الدنیا سجن المؤمن وجنة للکافر حدیث:۲۹۶۳)

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دین کے معاملے میں ایسے لوگوں کو دیکھنا چاہیے جو دین کی پابندی اور زہد و ورع میں تم سے زیادہ ہوں' تاکہ تم بھی زہد و تقویٰ میں بلند مقام حاصل کرنے کی سعی کرو۔ دنیا کے مقابلے میں دین کو اور دنیا کی آسائشوں کے مقابلے میں آخرت کی زندگی کو ترجیح دینے کے لیے یہ نسخۂ نبوی ﷺ ہمارے لیے بہترین راہ عمل ہے اور اسی سے انسان کو امن و سکون نصیب ہو سکتا ہے۔ ﴿ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴾ (الرعد: ۲۸/۱۳)

-- ۴ --

عورت اور ملازمت؟

گزشتہ صفحات سے واضح ہے کہ تربیت اولاد میں عورت کا کردار نہایت بنیادی اہمیت کا حامل ہے' کیونکہ ماں کی گود ہی سب سے پہلا اسکول ہے۔ اس کی پہلی معلّمہ اس کی ماں ہے اور اس کا پہلا سبق وہ لوری ہے جو ماں اپنے بچے کو ایام شیر خوارگی میں دیتی ہے۔ یہ اسکول جتنا صاف ستھرا ہو گا' اس کی معلّمہ (ماں) جتنی نیک سیرت' پاکیزہ اطوار اور اسلامی جذبات کی حامل ہو گی اور اس کی لوری (سبق) میں جس حساب سے اخلاص اور خیر خواہی ہو گی' اسی حساب سے بچے کی ذہنی نشوونما اور اس کے کردار کی تربیت ہو گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس معلّمۂ اوّل کی صحیح تعلیم و تربیت ہو اس کے قلب و ذہن کی جلا ہو اور اس کے دماغ کا تزکیہ و تنقیہ ہو' تاکہ اس کی گود میں پلنے والا بچہ بھی صحیح ہو' اس کا قلب و دماغ مسلمان ہو اور اسے ایک صحیح ماحول اور صحیح سانچہ میسر آ جائے جس میں وہ اپنے اخلاق و کردار کو ڈھال سکے اور قلب و ذہن کی اصلاح و تطہیر کر سکے۔

مسلمانوں میں یہ مدرسۂ اوّل جب تک صحیح' فعال اور مؤثر رہا' مذکورہ مقصد حاصل ہوتا رہا اور ان کے نونہال اسلامی تعلیم و تربیت سے آراستہ ہوتے رہے اور انہوں نے اپنے عمل و کردار کے انمٹ نقوش صفحۂ ہستی پر ثبت کیے اور اپنی ایمانی قوت اور حسن اخلاق کے ہتھیار سے ایک دنیا کو مسخر کر لیا اور چار دانگ عالم میں اسلامی تہذیب کا پھریرا لہرا دیا۔ صرف باہر ہی فتوحات کے جھنڈے نہیں گاڑے' بلکہ اندر بھی مسلمان اپنی مملکت میں جسد واحد کی طرح ایک دوسرے کے ہم درد و غم خوار رہے۔ بمصداق حدیث نبوی:

«اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِّسَانِهِ وَيَدِهِ»(صحيح البخاري، الرقاق، باب الانتهاء عن المعاصي، ح: ٦٤٨٤)

"مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف نہ پہنچے۔"

اور:

«اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا»(صحيح البخاري، الأدب، باب تعاون المؤمنين بعضهم بعضا، ح:٦٠٢٦)

''مومن دوسرے مومن کے لیے ایک عمارت یا دیوار کی طرح ہے' جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کی مضبوطی کا باعث ہے۔''

لیکن اب بدقسمتی سے یہ خاندانی حصار' جو مسلمانوں کی قوت و استحکام اور وحدت و یک جہتی کا مظہر تھا' ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے' اس اسکول کو اجاڑا جا رہا ہے اور اس کی معلّمہ کو تعلیمی و تربیتی کردار ادا کرنے کی بجائے' معاشی جھمیلوں میں الجھایا جا رہا ہے۔ اسے گھر کی بجائے' دفتروں اور کارخانوں کی زینت اور اس چراغ خانہ کو شمع محفل بنانے پر اصرار کیا جا رہا ہے' تاکہ وہ اپنے اصل کردار سے محروم ہو جائے۔

اس سازش کے لیے بڑے حسین جال بچھائے گئے ہیں' اسے خوش نما عنوان سے مُعَنْوَن کیا گیا ہے اور دل فریب وعدوں کا سبز باغ دکھایا جا رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ عورت آبادی کا نصف حصہ ہے' وہ جب تک مردوں کے دوش بدوش ترقی میں حصہ نہیں لے گی' ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ اسے گھروں میں بیکار نہیں چھوڑا جا سکتا' چنانچہ اسے گھر سے باہر دھکیلا جا رہا ہے تاکہ وہ بھی ہر وہ کام کرے جو مرد کر رہا ہے۔ حالانکہ مساوات مرد و زن کا یہ مغربی نظریہ اسلام کی تعلیمات کے یکسر خلاف ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ مرد اور عورت یقیناً انسانی زندگی کے دو پہیے ہیں جو ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں اور ان دونوں کے مجموعی عمل و کردار کا نام ہی زندگی ہے۔ نہ مرد' عورت سے بے نیاز ہو سکتا ہے اور نہ عورت مرد سے بے پروا۔ دونوں ایک دوسرے کی ضرورت اور ایک دوسرے کے لیے لازم ہیں' لیکن اس کے ساتھ وہ اس حقیقت کو بھی واضح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو الگ الگ مقصد کے لیے تخلیق کیا ہے۔ اس لیے دونوں کو صلاحیتیں بھی ایک دوسرے سے مختلف اور جداگانہ دی گئی ہیں۔ جو صلاحیتیں اللہ نے عورت کے اندر رکھی ہیں' مرد ان سے محروم ہیں۔ اور مردوں والی خصوصیات سے عورت محروم ہے۔ انسانی زندگی کا یہ نظام صحیح طریقے سے

چلانے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں اپنے اپنے مقصد تخلیق کے مطابق' اپنی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں۔ مرد کو جو صلاحیتیں اور قوتیں دی گئی ہیں۔ اس کے اعتبار سے اس کا دائرہ عمل گھر سے باہر کا میدان ہے۔ کاروبار و تجارت ہے' زراعت و باغبانی ہے' فیکٹری اور کارخانے ہیں اور امور سیاست و جہاں بانی ہیں جب کہ عورت کا دائرہ عمل اس کی فطری صلاحیتوں کے مطابق' گھر کی چاردیواری ہے' وہ گھر کے اندر رہ کر امور خانہ داری سرانجام دے' بچوں کی دیکھ بھال اور ان کی تعلیم و تربیت اور خاوند کی خدمت کرے۔ یوں عورت مرد کو خانگی معاملات اور ذمے داریوں سے فارغ رکھے' تاکہ وہ یکسوئی سے' گھر سے باہر' کسب معاش کے لیے جدوجہد کرتا رہے اور مرد' عورت کو معاشی بکھیڑوں سے بچا کر رکھے' تاکہ وہ یکسوئی سے گھریلو کام سرانجام دے سکے۔ مسلمان معاشروں میں صدیوں سے مرد اور عورت اسی انداز سے اپنے اپنے دائرے میں کام کرتے آ رہے ہیں' کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ عورت بیکار ہے اور گھر میں اس کی کوئی ذمے داری نہیں ہے' کیونکہ واقعتاً عورت گھر میں بیکار نہیں رہتی' بلکہ مرد ہی کی طرح سارا دن مصروف جہد و سعی رہتی ہے۔ گھر کی چاردیواری کے اندر گھریلو امور سرانجام دینے والی عورت کو بے کار کہنا یا قرار دینا سراسر خلاف واقعہ بات' بہت بڑا جھوٹ اور ایک عظیم بہتان ہے۔ یہ گھریلو عورت' ملک کی ترقی میں مرد کے برابر حصہ لے رہی ہے' اگر یہ مرد کو وہ سکون خاطر اور بے فکری مہیا نہ کرے جو گھر کی طرف سے' اسے عورت اپنے گھریلو کردار کی وجہ سے مہیا کرتی ہے' تو مرد اپنے میدان میں مؤثر اور بھرپور کردار کرنے کے قابل ہی نہیں ہو سکتا۔ مرد کی اس محنت و سعی میں' جو وہ گھر سے باہر کرتا ہے' یقیناً عورت کا حصہ بھی شامل ہے۔ جو وہ گھر کے اندر رہ کر نہایت خاموشی سے اس میں ڈالتی ہے۔

اس لئے مسلمان عورت کو اس حسین جال میں پھنسنے سے گریز کرنا چاہیے اور قرآن کے حکم ﴿ وَ قَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ ﴾ (الاحزاب: ۳۳/۳۳) "اپنے گھروں میں ٹک کر رہو" پر عمل کرتے ہوئے اپنی سرگرمیوں کو خانگی امور تک ہی محدود رکھنا چاہیے۔ یہی ہمارے مذہب کی تعلیم ہے' یہی مسلمان عورت کی تاریخ ہے اور یہی ہماری تہذیب ہے۔ اس تعلیم' اس تاریخ اور اس

تہذیب سے انحراف "خودکشی" ہے' تباہی و بربادی ہے اور عورت پر ظلم ہے۔

مردوں کے دوش بدوش کام کرنے والا نعرہ دراصل عورت کو اس کے نسوانی وقار سے محروم کرنا اور اسے مرد بنانا ہے' جو عورت پر ایک بہت بڑا ظلم ہے۔ کیونکہ عورت کی تخلیق کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ نسل نو کی ماں بنے۔ یہ مقصد اسے بہرصورت پورا کرنا ہے' جس کے لیے وہ نو مہینے مسلسل حمل کی تکلیف برداشت کرتی ہے اور اس کے بعد وضع حمل کا مرحلہ بھی' جو اس کے لیے موت و حیات کی کشمکش کا مرحلہ ہوتا ہے' وہ بھی برداشت کرتی ہے' پھر وہ دو سال تک رضاعت (دودھ پلانے) کی تکلیف بھی برداشت کرتی ہے' اس کے لیے اسے راتوں کو جاگنا پڑتا ہے' تو جاگتی ہے' اپنے آرام و راحت کو قربان کرتی ہے اور اپنی جان و صحت کو بھی گھلاتی ہے۔ ان تمام تکلیفوں کی وجہ سے ہی اسلام نے معاشی کفالت کا تمام تر بوجھ مرد پر ڈالا ہے اور عورت کو اس ذمے داری سے کلیۃً فارغ رکھا ہے۔ لیکن مذکورہ نعرے کا مطلب ہے کہ حمل' ولادت اور رضاعت وغیرہ کی تمام تکلیفوں کے ساتھ' عورت کما کر بھی لائے' اس کے لیے سڑکوں کی خاک چھانے' دفتروں اور کارخانوں کی دریوزہ گری کرے اور ہر جگہ مردوں کی ہوس ناک نگاہوں کا ہدف بن کر اپنی عصمت و تقدیس کی چادر کو بھی داغ دار یا تار تار کروائے۔ یہ عورت پر ظلم نہیں تو کیا ہے؟ یہ دہری ذمے داری عورت پر کیا اللہ نے ڈالی ہے؟ نہیں' ہرگز نہیں۔ یہ عورت پر ایک ظلم ہے' بہت بڑا ظلم۔ اللہ تعالیٰ اس ظلم سے بری ہے۔ ﴿ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴾ (حٰمٓ السجدة ۴۱/۴۶) "تیرا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔"

اسلام نے عورت کو گھر کی ملکہ بنایا ہے۔ اسے بچوں کی اور گھر کی حفاظت کے علاوہ صرف اپنے خاوند کی خدمت و اطاعت کی تاکید ہے۔ ایک حدیث میں نبی ﷺ نے فرمایا:

«وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَا تُؤَدِّي الْمَرْأَةُ حَقَّ رَبِّهَا حَتَّى تُؤَدِّيَ حَقَّ زَوْجِهَا وَلَوْ سَأَلَهَا نَفْسَهَا، وَهِيَ عَلَى قَتَبٍ، لَمْ تَمْنَعْهُ» (سنن ابن ماجة، النكاح، باب حق الزوج على المرأة، ح: ۱۸۵۳)

"قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے' عورت اس وقت

تک اپنے رب کا حق ادا نہیں کر سکتی جب تک وہ اپنے خاوند کا حق ادا نہیں کرتی' خاوند اگر اسے ایسی حالت میں بلائے کہ وہ اونٹ پر (سفر کے لیے) بیٹھی ہو' تب بھی وہ اس کے پاس آنے سے انکار نہ کرے۔"

یہ ہے اسلام کی نیک عورت۔ اسلام نے کمائی کرنے والی عورت کو' ٹائپسٹ' کلرک اور سٹینو گرافر قسم کی عورت کو یا پائیلٹ' ایرہوسٹس یا سیاست کے پھڈے میں ٹانگ اڑانے والی عورت کو "المرأۃ الصالحہ" نہیں کہا' بلکہ صرف اور صرف گھر کی چاردیواری کے اندر رہ کر خانگی امور سرانجام دینے والی عورت کو "نیک عورت" کہا ہے۔ اسی طرح پیغمبر اسلام نے فرمایا ہے:

«تَزَوَّجُوا الْوَدُودَ الْوَلُودَ»(سنن أبي داود، النكاح، باب النهي عن تزويج من لم يلد من النساء، ح: ٢٠٥٠)

"تم زیادہ بچے جننے والی اور زیادہ محبت کرنے والی عورت سے شادی کرو۔"

اگر اسلام میں عورت کو بھی سروس' ملازمت اور معاش و تجارت اختیار کرنے کا حکم ہوتا تو زیادہ کماؤ عورت کو بہترین عورت قرار دیا جاتا۔ اسی طرح اسے یہ حکم نہ دیا جاتا کہ "گھر میں ٹک کر رہو" نہ پردے کی اتنی تاکید کی جاتی' جتنی کہ اس کی تاکید ہے' کیونکہ پردے کی پابندی کے ساتھ معاشی جدوجہد میں حصہ لینا نہایت مشکل ہے۔ نہ عورت کے لیے بچے جننے کو مستحسن قرار دیا جاتا' کیونکہ بچے بھی ملازمت اور کسب معاش کی راہ کے سنگ گراں ہیں۔ (اسی سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کے دو نہایت اہم مضمون اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں)

مرد اور عورت کو زندگی کے دو پہیے تو ضرور مانتا ہے کہ جن کے بغیر انسانی زندگی کی گاڑی رواں دواں نہیں رہ سکتی' لیکن وہ دونوں کا دائرہ عمل ایک دوسرے سے مختلف تجویز کرتا ہے اس کے نزدیک دونوں کی فطری صلاحیتیں بھی مختلف ہیں اور دونوں کا مقصد تخلیق بھی ایک دوسرے سے جدا۔ اس لیے وہ دونوں کو الگ الگ دائرے میں رکھ کر اپنے اپنے مفوضہ فرائض ادا کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ سیاست اور امور جہانبانی کا شعبہ بھی (بعض اور شعبوں کی طرح) ایک ایسا شعبہ ہے جسے اسلام نے صرف مرد ہی کے لیے خاص کیا ہے وہ عورت کا سیاست میں حصہ لینے کو قطعاً پسند نہیں کرتا' جب کہ مذکورہ چاروں تجویزیں عورت کے سیاست میں حصہ لینے کے تصور پر مبنی ہیں۔

بنابریں یہ چاروں ہی تجویزیں اسلامی نقطۂ نظر سے غیر صحیح ہیں' کیونکہ ان میں سے ہر تجویز میں اسلامی اصول و ضوابط سے انحراف پایا جاتا ہے اور اسلامی ضوابط کو پامال کیے بغیر کوئی بھی تجویز بروئے کار نہیں آسکتی۔

ثانیاً: اسمبلیوں میں عورتوں کی نمائندگی کے لیے عورتوں کو اسمبلیوں کے لیے نامزد کرنا' یا وہاں تک پہنچنے کے لیے انتخابات میں ان کا حصہ لینے کو ضروری سمجھنا بھی ہمارے لیے ناقابل فہم ہے۔ کیا ممبران اسمبلی پوری قوم کے نمائندے نہیں ہیں؟ ممبران اسمبلی قوم کے ہر طبقے کے نمائندہ ہیں۔ وہ مزدوروں کے بھی نمائندہ ہیں' اہل صنعت و حرفت کے بھی نمائندہ ہیں' تاجروں اور خوانچہ فروشوں کے بھی نمائندہ ہیں' وہ ملازمت پیشہ اور اہل زراعت کے بھی نمائندہ ہیں۔ غرض وہ زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے افراد کے نمائندہ ہیں' سب کی فلاح و بہبود کے لیے قانون سازی اور اسباب و وسائل کی فراہمی ان کی ذمہ داری ہے۔ جب وہ ہر طبقے کی فلاح و بہبود کے ذمہ دار ہیں تو کیا عورتوں کے مسائل و مشکلات کے حل کے وہ ذمہ دار نہیں ہیں؟ بالخصوص جب کہ عورت ان کی ماں بھی ہے' ان کی بیٹی بھی ہے' ان کی بیوی اور ان کی بہن بھی ہے۔ تو کیا وہ اتنے ہی ناخلف ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے مردوں کے مسائل پر تو وہ سوچ بچار کریں گے ان کی فلاح و بہبود کے لیے منصوبہ سازی اور قانون سازی تو کریں گے' لیکن اپنی ہی ماں'

اپنی ہی بیوی' اپنی ہی بیٹی اور ہمشیرہ کے لیے وہ کچھ نہیں کریں گے؟ ان کے مسائل و مشکلات کو در خور اعتناء نہ سمجھیں گے؟ آخر یہ کیسے اور کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے؟

اگر کہا جائے کہ عورتوں کا اسمبلیوں میں پہنچنا مشکل ہے تو ہم عرض کریں گے کہ دوسرے طبقات کا پہنچنا کون سا آسان ہے' بلکہ دوسرے طبقات کا تو اسمبلیوں میں پہنچنا عورت کی بہ نسبت بہت زیادہ مشکل ہے۔ مال دار اور جاگیر دار خاندانوں کی بیگمات تو پھر بھی آسانی سے انتخاب لڑ کر اسمبلیوں میں پہنچ سکتی ہیں جیسے ہر دفعہ کے انتخابات میں کچھ نہ کچھ عورتیں کامیاب ہو کر اسمبلیوں میں پہنچتی رہی ہیں اور اکتوبر ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں کافی تعداد میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں خواتین پہنچی ہیں۔ علاوہ ازیں ۱۹۷۳ء کے آئین کے مطابق اس دفعہ عورتوں کو منتخب نمائندگان کے ووٹوں سے متناسب نمائندگی کی بنیاد پر بھی منتخب کیا گیا ہے' جس کے بعد قومی اسمبلی ہی میں خواتین کی تعداد ۷۵ ہو گئی ہے اور صوبائی اسمبلیوں میں بھی صورت حال یہی ہے۔ جب کہ مزدوروں' ہاریوں' کاشت کاروں' بے روزگاروں' کاریگروں اور ہنر مندوں' تعلیمی اداروں کے اساتذہ' ملازمت پیشہ افراد حتیٰ کہ متوسط خاندانوں کا بھی کوئی نمائندہ اسمبلیوں میں پہنچ سکا ہے؟ یا آئندہ ان میں سے کسی کے پہنچنے کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ اسی طرح اہل علم و فکر حضرات کا طبقہ ہے جس میں غیر سیاسی علماء' مختلف شعبہ ہائے زندگی کے ماہرین' اہل قلم اور دانش ور حضرات اور دیگر بہت سے ممتاز طبقات ہیں' لیکن اسمبلیوں میں وہ نمائندگی سے محروم چلے آ رہے ہیں اور آئندہ بھی ان کی محرومی کے ازالے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

عورتوں سے زیادہ کیا ان طبقات کی نمائندگی ضروری نہیں ہے؟ اگر عورتوں کی نمائندگی کے لیے خاص سہولتوں کا اہتمام ضروری ہے تو مذکورہ طبقات کے لیے بھی ان سہولتوں کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے' ورنہ یہ ایک امتیازی سلوک ہو گا جس کی نفی یہ سیکولر حضرات بڑے شد و مد سے کرتے ہیں حتیٰ کہ یہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ مرد و عورت کے درمیان بعض فطری امتیاز کو بھی ختم کرنے کے لیے بے قرار ہیں۔

خواتین کی نمائندگی کے جواز کے لیے ایک دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ خلافت راشدہ

میں متعدد دفعہ متعلقہ امور بلکہ اجتماعی معاملات میں بھی عورتوں سے رائے لی گئی..... اس لیے اجتماعی معاملات کے حوالے سے قومی سطح پر مشاورت اور رہنمائی کے نظام میں شرکت عورتوں کے لیے شرعاً ممنوع نہیں ہے (الشریعۃ' مذکور۔ ص:۴۲)

ٹھیک ہے' لیکن سوال یہ ہے کہ مشاورت کے لیے اسمبلیوں کا ممبر بننا یا بنانا کیوں ضروری ہے؟ کیا اس کے بغیر حسب ضرورت و اقتضاء خواتین سے مشورہ نہیں لیا جا سکتا؟ بلکہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ جو خواتین اسمبلیوں کی ممبر بنیں گی یا بنائی جائیں گی ان کی اکثریت اس قبیل کی ہوں گی کہ وہ ممبران اسمبلی کے ذوق جمال اور نگاہ ہوس کی تسکین کا سامان تو شاید ضرور مہیا کر دیں' لیکن خواتین کے حقیقی مسائل و مشکلات سے نہ وہ آگاہ ہی ہوں گی نہ ان کے ناخن تدبیر سے ان کے حل کی راہیں ہی کھلیں گی۔ اس کے برعکس اگر چند عورتوں کو ممبر بنائے بغیر' ملک کی سمجھ دار' پڑھی لکھی گھریلو اور فکری و تعلیمی اداروں سے وابستہ خواتین سے مختلف سوال ناموں کی شکل میں رائے حاصل کی جائے تو زیادہ بہتر طریقے سے عورتوں سے مشاورت کا اہتمام ہو سکتا ہے۔ یہ خواتین کے ممبر بننے یا بنانے کے بھاری بھرکم اخراجات کے مقابلے میں' کہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی' رنگ چوکھا آئے' کا مصداق بھی ہو گا۔

جیسا کہ اکتوبر ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں جس طرح بڑی تعداد میں عورتوں کو قومی و صوبائی اسمبلیوں میں نمائندگی دی گئی ہے' اس کے سالانہ اخراجات کا تخمینہ ۵ کروڑ ۶۴ لاکھ روپے لگایا گیا ہے۔ (روزنامہ "جنگ" لاہور۔ ۲۸ نومبر ۲۰۰۲ء ص: ۴ اور ۱۳)

بہر حال جس نقطہ نظر سے بھی دیکھا جائے' اسمبلیوں میں خواتین کی نمائندگی کا مسئلہ ایک شوق فضول' سراسر اسراف و تبذیر اور مغرب زدگی کے شاخسانے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس مطالبے میں قطعاً کوئی معقولیت اور افادیت نہیں ہے' یہ غیر معقول بھی ہے اور قومی خزانے پر ایک ناروا بوجھ بھی اور سب سے بڑھ کر حکم قرآنی ﴿ وَقَرْنَ فِی بُیُوتِكُنَّ ﴾ (الاحزاب ۳۳/۳۳) کے صریح خلاف بھی۔ اس لیے ہم دینی حلقوں اور دینی جماعتوں سے عرض کریں گے کہ وہ اس مسئلے میں معذرت خواہانہ انداز ترک کر کے

زوردار انداز میں اس کے خلاف آواز اٹھائیں۔ اگر مرد عورتوں کے مسائل حل کرنے پر قادر نہیں ہیں تو اسمبلیوں میں نمائندگی کے عنوان سے پہنچنے والی خواتین کیا تیر مار لیں گی؟

ضلعی حکومتوں کے نئے نظام میں عورتوں کی نمائندگی؟: اس تفصیل سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جنرل پرویز مشرف کی موجودہ حکومت نے ضلعی حکومتوں کا جو نیا نظام تجویز کیا ہے' اس میں بھی عورتوں کی ۳۳ فیصد نمائندگی کا اہتمام اسلامی تعلیمات و اقدار کے بالکل خلاف ہے۔ اتنی تعداد میں عورتوں کی نمائندگی تو ان مغربی ملکوں میں بھی نہیں ہے جو نظریہ مساوات مرد و زن کے قائل ہیں۔ پاکستان میں' جس کی بنیاد اسلام پر ہے' اس کا کیا جواز ہے؟

حکومت پاکستان کا ایک اور شوقِ فضول اور مغرب زدگی کا شاخسانہ: اگست ۱۹۹۵ء میں حکومت پاکستان کے زیر اہتمام عالم اسلام کی خواتین پارلیمنٹرین کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی' جسے پہلی کانفرنس قرار دیا گیا اور اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ ہر سال یہ کانفرنس ہوا کرے گی' اس کا مستقل سیکرٹریٹ اسلام آباد میں قائم کیا جائے گا۔ اس کانفرنس پر بلا مبالغہ لاکھوں نہیں' کروڑوں روپیہ خرچ کیا گیا ہے۔ اس کا ایک مقصد بے نظیر کی اپنی تشہیر اور اپنی شخصیت کو اجاگر کرنا تھا۔ دوسرا مقصد اسلامی ملکوں میں مغربیت کا فروغ ہے۔ بالخصوص اس کا نظریہ' مساوات مرد و زن۔ کیونکہ عورت کی حکمرانی کے جواز کی بنیاد بھی مغرب کا یہی نظریہ ہے۔ ورنہ اسلام میں تو عورت کی حکمرانی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے اور جیسا کہ ہم نے گزشتہ صفحات میں عرض کیا ہے کہ عورتوں کا پارلیمنٹ کا ممبر ہونا' یا بلدیاتی سطح پر کونسلر ہونا یا کسی اور سیاسی و معاشرتی شعبے میں سرگرم ہونا اسلامی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتا' بلکہ اس میں اسلامی تعلیمات سے انحراف پایا جاتا ہے اور اسی لیے ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ عالم اسلام کی ان خواتین کا' جو حکم قرآنی سے بغاوت کرنے والی ہیں' اسلام آباد میں ہر سال میلہ لگانے کا بھی کوئی جواز نہیں ہے۔ یہ ایک بے فائدہ عیاشی اور قومی وسائل کی بربادی ہے۔ کیونکہ بے نظیر سمیت یہ تمام خواتین ایسی ہیں کہ انہیں قطعاً عورتوں کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ صرف اسلامی ملکوں میں مغرب کی حیا باختہ تہذیب

پھیلانا چاہتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی مقصد نہیں ہے۔

مسلمان خواتین کے حل طلب ضروری مسائل کی ایک فہرست : اگر یہ خواتین عورتوں کی خیر خواہ ہوتیں' انہیں عورتوں کی مشکلات کا احساس و شعور ہوتا اور یہ ان کے مسائل کے حل کرنے کا جذبہ اپنے اندر رکھتیں تو سب سے اہم ترین مسئلہ ان کے سامنے یہ ہوتا:

① خواتین یونیورسٹیاں قائم کی جائیں تاکہ مسلمان عورت' مردوں سے الگ رہ کر' ستر و حجاب کی پابندی کے ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکے۔ کیا ان مغرب زدہ خواتین نے اس کا مطالبہ کیا؟ یا اس پر کوئی سوچ بچار کی ؟ یا آئندہ ان سے کوئی توقع ہے؟

② دوسرا مطالبہ ان کی طرف سے یہ ہونا چاہیے تھا کہ عورت کا جنسی استحصال ختم کیا جائے' اسے شو پیس یا سامان تجارت کے طور پر استعمال نہ کیا جائے۔ اسے ہر اشتہار کی زینت بنا کر سر بازار ذلیل و رسوا نہ کیا جائے۔ عورت کا وجود نہایت مقدس ہے' نازک آبگینہ ہے' صدف کی آغوش میں پرورش پانے والے موتی سے زیادہ قیمتی ہے۔ اسے جنس بازار بنایا جائے' نہ اسے اخباروں اور فلموں میں عریاں کر کے' عصمت فروشوں کی طرح مال و دولت کے حصول کا ذریعہ بنایا جائے۔

③ اسی طرح مطالبہ کیا جاتا کہ مخلوط تعلیم کا خاتمہ کیا جائے' تاکہ عورت کے تقدس کے مجروح ہونے اور اس کی ردائے عصمت کے تار تار ہونے کے امکانات کم سے کم ہو جائیں۔ جب کہ مخلوط تعلیم نے ان امکانات کو' واقعات میں بدل رکھا ہے۔

④ جہیز کی لعنت کا خاتمہ اور شادی بیاہ کی فضول' بے ہودہ اور مسرفانہ رسومات کا سد باب کیا جائے جنھوں نے شادی جیسے اہم فریضے کو ایک عذاب بنا دیا ہے۔

⑤ چادر اور چار دیواری کا تحفظ کیا جائے' تاکہ عورت کی عزت بھی محفوظ رہے اور اس کا امن و سکون بھی برباد نہ ہو۔

⑥ عائلی عدالتوں کو زیادہ مؤثر اور فعال بنایا جائے' تاکہ مظلوم اور ستم رسیدہ عورتیں عدالتوں سے فوری انصاف حاصل کر سکیں۔

﴿۷﴾ فحاشی' بے حیائی اور بے پردگی کا خاتمہ کیا جائے' تاکہ عورتوں کی عصمت دری کے بڑھتے ہوئے رجحان پر قابو پایا جا سکے۔

﴿۸﴾ فضائی میزبان (ایئر ہوسٹس) عورتوں کی بجائے مردوں کو مقرر کیا جائے' تاکہ اسلامی احکام کی بے حرمتی نہ ہو۔

﴿۹﴾ اخبارات' ٹیلی وژن اور کمرشل اشتہارات میں عورت کا استعمال ممنوع قرار دیا جائے' کیونکہ اس میں اس کا استحصال بھی ہے اور اس کی بے حرمتی بھی۔

﴿۱۰﴾ بیواؤں اور نادار عورتوں کی فلاح کے لیے زیادہ سے زیادہ امدادی مراکز اور ادارے قائم کیے جائیں' تاکہ ایسی عورتیں آبرومندانہ طریقے سے اپنی حیات مستعار کے دن گزار سکیں۔

﴿۱۱﴾ عورتوں کے لیے مردوں سے الگ نصاب تعلیم مرتب کیا جائے' تاکہ وہ اپنے مقصد تخلیق ادر فطری صلاحیتوں کے مطابق زیادہ بہتر طریقے سے ملک و قوم کی خدمت کر سکیں۔

﴿۱۲﴾ جس طرح ان کے تعلیمی ادارے الگ ہوں' اسی طرح ان کے لیے چند شعبے مخصوص کر دیے جائیں جن کی وہ تعلیم و تربیت بھی حاصل کریں اور وہاں وہ مردوں سے الگ رہ کر قومی خدمات بھی سر انجام دیں' مثلاً تعلیم کا شعبہ ہے' طب کا شعبہ ہے' اسی طرح اور بہت سے شعبے ایسے ہو سکتے ہیں جہاں وہ ستر و حجاب کی پابندی کے ساتھ مفوضہ فرائض انجام دیں۔

﴿۱۳﴾ عورت کے بارے میں اسلامی تعلیمات اور اس کے ساتھ حسن سلوک کے تاکیدی احکام کو ریڈیو' ٹی وی' اخبارات اور دیگر ذرائع سے عام کیا جائے' تاکہ لوگ جہالت کی وجہ سے عورتوں پر جو ظلم کرتے ہیں' اس کا سد باب ہو اور عورت صحیح معنی میں گھر کی ملکہ کا اعزاز حاصل کر سکے' جیسا کہ اسلام چاہتا ہے۔

یہ اور اس قسم کے اور بہت سے مسائل ہیں جو غور و فکر اور توجہ کے مستحق ہیں' لیکن عورتوں کے نام پر تنظیمیں قائم کرنے اور ان کے بل بوتے پر اپنی لیڈری کی دکان چمکانے

والی خواتین کو مذکورہ مسائل سے' جو پاکستانی مسلمان عورتوں کے حقیقی مسائل ہیں' کوئی دلچسپی نہیں۔ انہیں دلچسپی ہے تو صرف ایسے مسائل سے کہ جن کے ذریعے سے پاکستان کا اسلامی معاشرہ' مغرب کے اخلاق باختہ معاشرہ میں بدل جائے اور مغرب کی تمام اخلاقی برائیاں یہاں عام ہو جائیں۔ چنانچہ آپ دیکھ لیجیے کہ خواتین کے حقوق کے نام پر سرگرم خواتین کی تقریروں اور مطالبات میں ایسی ہی چیزیں نمایاں ہیں جو مغربی معاشرے کے امتیازات ہیں۔ ہر شعبۂ زندگی میں مردوزن کی مساوات اور ایک دوسرے کے دوش بدوش چلنے کا تصور خالص مغربی ہے' جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں' مگر ان نام نہاد لیڈر انیوں کی زبان پر ہر وقت یہی نعرہ رہتا ہے۔ مغرب میں مرد کو طلاق دینے کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہ لیڈر انیاں چاہتی ہیں کہ پاکستان کے مردوں سے بھی' جو اسلام نے انہیں دیا ہے' یہ حق سلب کر لیا جائے بلکہ اس کی جگہ یہ حق عورتوں کو تفویض کر دیا جائے۔ مغرب میں ایک سے زیادہ شادی ممنوع ہے' تاہم غیر قانونی داشتاؤں اور گرل فرینڈز کی عام اجازت ہے۔ پاکستانی لیڈر انیاں بھی یہاں یک زوجگی کے قانون پر اصرار کر کے بے حیائی کا وہی دروازہ کھول رہی ہیں جس سے مغرب کا لادین معاشرہ دو چار ہے۔ علیٰ ھذا القیاس یہ لیڈر انیاں مغرب کی ہر بات پر ایمان بالغیب رکھتی ہیں اور اسلامی تہذیب و تمدن سے سخت بیزار ہیں اور مغرب پرستی اور اسلام بیزاری کا رجحان وہ بڑی تیزی سے پاکستان کی نئی نسل میں بھی منتقل کر رہی ہیں۔

چنانچہ زیر بحث کانفرنس کا اعلامیہ بھی دیکھ لیجیے' اس میں کی گئی تقریروں کو ملاحظہ فرما لیجیے۔ آپ کو یہی چیزیں اور باتیں ملیں گی اور کانفرنس کے اختتام پر تو مغرب کی یہ بلی تھیلے سے بالکل باہر آ گئی اور رقص و سرود کی محفل سے ان تمام خواتین کی ضیافت کی گئی جو "حقوق نسواں" کے نام پر اسلام آباد میں جمع کی گئی تھیں۔ اس مذموم حرکت سے بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ خواتین مسلمان عورت کو اس کے اسلامی حقوق دلوانے میں کوشاں ہیں یا وہ اسے مغرب کی عورت کی طرح سربازار نچوا کر اس کی ذلت و رسوائی کے درپے ہیں۔

افسوس اور ستم ظریفی یہ ہے کہ ہمارے تمام وزراء' ارباب اختیار و اقتدار' افسران اعلیٰ اور اخبارات جدید چلتے ہوئے نعروں سے مرعوب اور شاید مغرب کی عشوہ طرازیوں سے مسحور ہیں۔ یہ بھی سب مغرب کے نقطۂ نظر ہی کو یہاں فروغ دے رہے ہیں۔ حکومت کی تمام پالیسیاں اسی فکر اور طرز عمل کی غماز ہیں اور اخبارات بھی ان نظریات کی بھرپور اشاعت کر رہے ہیں۔

یہ صورت حال اسلامی نقطۂ نظر سے سخت خطرناک ہے۔ حکومت' اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ کی پالیسیوں اور رویے سے ہمارے معاشرے میں مغربی رجحانات کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔ اور اسلام کا تصور حیاء و عفت ختم ہو رہا ہے۔ ﴿ الرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ﴾ (النساء: ۴/۳۴) کے برعکس صورت حال رونما ہو رہی ہے اور قرآن کا حکم ﴿ وَ قَرْنَ فِي بُيُوْتِكُنَّ وَلاَ تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلٰى ﴾ (الاحزاب: ۳۳/۳۳) زینت طاق نسیاں بنتا جا رہا ہے۔

مغربی نظریۂ مساوات مردوزن کے مطابق مسلمان عورت کا مردوں کے دوش بدوش چلنے کی یہ روش' جسے مادی ترقی اور ملکی خوش حالی کی ضمانت سمجھا جا رہا ہے' معاشرے کے لیے سخت تباہ کن ہے۔ اس سے عائلی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار' اسلام سے بیزاری اور مغربی تہذیب و معاشرت کی برتری کا تصور عام ہو رہا ہے۔ نیز اسلام کو ایک فرسودہ اور موجودہ دور میں ناقابل عمل دین سمجھا جا رہا ہے۔ کیا ہمارے حکمران اور مالکان و مدیرانِ جرائد یہی کچھ چاہتے ہیں؟ اگر یہی ان کا مطلوب و مقصود ہے (اور ان کے طرز عمل کا لازمی و منطقی نتیجہ یہی ہے)' تو پھر پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں کو سوچنا چاہیے کہ کیا وہ اس رو میں بہتے چلے جائیں گے؟ یا اپنی نسل نو کو اس باغیانہ روش سے بچانے کی ہر ممکن سعی کریں گے؟

-- ۶ --

عورت اور اس کی سربراہی ؟

عورت کی سربراہی کا مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے جس سے مرد و عورت کے درمیان امتیاز ہوتا ہے' کیونکہ اسلام میں عورت کی سربراہی کا کوئی جواز نہیں ہے' اللہ تعالیٰ کا واضح فرمان ہے:

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا ﴾ (النساء٤/ ٣٤)

"مرد عورتوں پر حاکم ہیں' بوجہ اس کے جو اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی اور بوجہ اس کے جو وہ اپنے مال (ان عورتوں پر) خرچ کرتے ہیں۔"

اس آیت مبارکہ میں اللہ نے مرد کی حاکمیت و قوامیت کا بیان فرمایا ہے اور ساتھ ہی اس کی دو وجہیں بیان کی ہیں' ان میں سے ایک وہبی ہے جو مردانہ قوت و دماغی صلاحیت ہے جس میں مرد عورت سے خلقی (پیدائشی) طور پر ممتاز ہے (جسے دنیا کی کوئی طاقت بدلنے یا مٹانے پر قادر نہیں۔)

دوسری وجہ کسبی ہے جس کا مکلف شریعت نے مرد کو بنایا ہے کہ وہ عورت کو کما کر کھلائے' کیونکہ عورت کو اس کی فطری کمزوری اور مخصوص تعلیمات کی وجہ سے' جو اسلام نے عورت کی عفت و حیاء اور اس کے تقدس کے تحفظ کے لیے ضروری بتلائی ہیں' عورت کو معاشی جھمیلوں سے دور رکھا ہے۔ اسی طرح اللہ کا حکم ہے:

﴿ وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ ﴾ (الأحزاب٣٣/ ٣٣)

"اپنے گھروں میں ٹک کر رہو۔"

اور اللہ تعالیٰ کا حکم چونکہ فطری مقاصد اور شرعی حکمتوں پر مبنی ہے' اس لیے یہ عام

ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں مرد حاکم و نگران ہے اور عورت اس کی محکوم اور فرماں بردار۔ علاوہ ازیں عورت کا دائرۂ عمل گھر کی چار دیواری ہے' بیرونی معاملات نہیں۔

جب واقعہ یہ ہے تو عورت ملک کی سربراہ کس طرح بن سکتی ہے؟ یہ تو قرآن کریم کی نص صریح کے خلاف ہے اور احادیث رسول سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ عورت کی سربراہی' تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً»(صحيح البخاري، المغازي، باب كتاب النبي ﷺ إلى كسرى وقيصر، ح:٤٤٢٥ والفتن، باب:١٨)

"وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جس نے اپنے معاملات ایک عورت کے سپرد کر دیے۔"

حدیث «لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ .....» اہل سُنَّت کے دو مسلمہ اصول کی روشنی میں: حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مذکورہ حدیث کہ "وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہوگی جس نے ایک عورت کو اپنا حکمران بنالیا۔"

بعض لوگ اسے رد کرنے کے لیے صحابیٔ رسول حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ تک کو مطعون کرنے کی اور بعض لوگ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کے بعد کے راویوں پر جرح کر کے صحیح بخاری کی عظمت و اہمیت گھٹانے کی مذموم سعی کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں اہل سنت کے مسلمہ اصولوں کے خلاف ہیں۔

اہل سنت کا ایک مسلمہ اصول یہ ہے کہ اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عَدُوْلٌ (تمام صحابہ عادل ہیں) جس کا مطلب یہ ہے کہ جس روایت کا سلسلۂ سند صحابی تک بالکل صحیح ہو تو وہ روایت صحیح ہے اور صحابی کے بارے میں سرے سے کوئی تحقیق ہی نہیں کی جائے گی' کیونکہ تمام صحابہ عادل ہیں' یعنی حدیث رسول بیان کرنے میں کسی بھی صحابی سے کذب اور تلبیس کا امکان نہیں ہے۔ اس لیے جو لوگ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی کردار کشی کر رہے ہیں' وہ اس مسلمہ اصول کے خلاف ہے جس کی کوئی اہمیت نہیں۔

اسی طرح حدیث کے دوسرے راویوں پر جرح کر کے روایت کو مخدوش قرار دینے کا

مطلب صحیح بخاری کی اہمیت کو مجروح کرنا ہے' حالانکہ صحیح بخاری کے بارے میں بھی امت مسلمہ کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ یہ کتاب اللہ کے بعد حدیث رسول کا صحیح ترین مجموعہ ہے اور اس کی کسی روایت کی تضعیف و تردید اس مسلمہ قاعدے کے منافی ہے۔ اسی لیے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بجا طور پر فرمایا ہے:

«أَمَّا الصَّحِيحَانِ فَقَدِ اتَّفَقَ الْمُحَدِّثُونَ عَلٰى أَنَّ جَمِيعَ مَا فِيهِمَا مِنَ الْمُتَّصِلِ الْمَرْفُوعِ صَحِيحٌ بِالقَطْعِ، وَأَنَّهُمَا مُتَوَاتِرَانِ إِلٰى مُصَنِّفَيْهِمَا وَإِنَّهُ كُلُّ مَنْ يُّهَوِّنُ أَمْرَهُمَا فَهُوَ مُبْتَدِعٌ مُتَّبِعٌ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ»

(حجة الله البالغة: ١/ ١٣٤ مطبعة منيريه، مصر)

"صحیح بخاری و صحیح مسلم کے بارے میں محدثین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ان کی تمام متصل اور مرفوع روایات قطعی طور پر صحیح ہیں،یہ دونوں کتابیں اپنے مصنّفین تک متواتر ہیں اور ہر وہ شخص جو ان دونوں کتابوں کی اہمیت گھٹاتا ہے' وہ بدعتی اور مومنین کے راستے کو چھوڑ کر کسی اور راستے کا پیروکار ہے۔"

آئندہ صفحات میں ان "دلائل" کا پوسٹ مارٹم اور ان مغالطات و شبہات کا ازالہ ہے جو عورت کی سربراہی کے جواز کے ضمن میں پیش کیے جاتے ہیں' واللّٰہ الموفق۔

شبہات و مغالطات کا جائزہ

① حدیث ((لَنْ یُّفلِحَ قَوْمٌ .....)) پر اعتراض؟

نبی کریم ﷺ کا فرمان' جو صحیح بخاری میں دو مقام پر درج ہے۔ ((لَنْ یُّفلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَھُمْ امْرأَةً)) کہ ''وہ قوم ہرگز فلاح یاب نہیں ہو گی جس نے اپنے امور ایک عورت کے سپرد کر دیے۔'' (صحیح بخاری' المغازی' باب کتاب النبی الی کسریٰ و قیصر' حدیث : ۴۴۲۵- الفتن' باب :۱۸)

یہ فرمان سنداً بالکل صحیح ہے' اس کی صحت میں اہل علم کے درمیان قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بجز اس شرذمہ' قلیلہ کے جو سرے سے حجیت حدیث ہی کا قائل نہیں ہے۔ اس فرمان رسول ﷺ کی بناء پر آج تک امت مسلمہ نے اپنا حکمران کسی عورت کو بنانا پسند نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی چودہ صد سالہ تاریخ میں چاند بی بی' رضیہ سلطانہ اور بھوپال کی حکمران چند بیگمات کے علاوہ مسلمان عورتوں کی حکمرانی کی مثالیں ناپید ہیں اور یہ مثالیں اس لیے قابل نمونہ نہیں کہ ان کو حکمران بنانے میں عوام کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ سب اسی ملوکانہ طرز عمل کے نتیجے میں وارث تخت بنی تھیں جس ملوکیت کو آج کل کے سارے سیاسی دانشور رد کر چکے ہیں۔

لیکن روزنامہ ''جنگ'' کے ایک مستقل کالم نگار نے مذکورہ صحیح اور مسلمہ حدیث کو یہ کہہ کر کہ ''متعدد اہل علم مذکورہ حدیث کے راوی پر اسماء الرجال کے فن کی روشنی میں وزنی اعتراضات پیش کر چکے ہیں۔'' (روزنامہ ''جنگ'' لاہور۔ ص:۳' ۲۸ نومبر ۱۹۸۸ء)

ناقابل قبول قرار دینے کی کوشش کی ہے لیکن ہم نہایت ادب سے ان کی خدمت میں عرض کریں گے کہ موصوف ان متعدد اہل علم کی نشاندہی بھی فرما دیں' تو اچھا ہے۔ ورنہ ہمارے علم کی حد تک تو اہل سنت کے تمام اہل علم اس حدیث کو ہر لحاظ سے صحیح سمجھتے

ہیں۔ ہم یہی جاننا چاہتے ہیں کہ جن اہل علم نے "وزنی اعتراضات" کیے ہیں۔ وہ کون ہیں؟ کس طبقے اور جماعت سے ان کا تعلق ہے؟ اس کی کوئی صراحت ان کے مضمون میں نہیں ہے۔ اس لیے ہم ان کے اعتراضات کی حقیقت جاننے سے قاصر ہیں کہ کیا فی الواقع وہ "وزنی" ہیں جیسا کہ دعویٰ کیا گیا ہے؟

۲ جنگ جمل میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے کردار سے استدلال

دوسری دلیل اس حدیث کو رد کرنے کے لیے یہ پیش فرمائی گئی ہے کہ "چونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک لشکر کی قیادت کی تھی (جنگ جمل میں) اور جو لوگ سیاسی لحاظ سے ان کے خلاف تھے' انھوں نے عورت کی سربراہی کے حوالے سے مذکورہ حدیث کا ذکر کیا۔ دوسرے لفظوں میں اہل علم کا ایک حلقہ اس حدیث کو اپنی سند کے اعتبار سے اسقام سے خالی نہیں سمجھتا۔"

یہاں موصوف کی عبارت میں کچھ ابہام ہے۔ غالباً ان کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مخالف گروپ نے اس حدیث کے حوالے سے عورت کی سربراہی کو غلط قرار دینے کی کوشش کی جسے دوسرے گروپ نے صحیح نہیں سمجھا' گویا ان کے نزدیک یہ حدیث اپنی سند کے اعتبار سے اسقام سے خالی نہیں تھی۔ اگر یہی مفہوم ہے تو یہ یقیناً غلط اور واقعات کے خلاف ہے۔ اول تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مخالف گروپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے یہ حدیث پیش ہی نہیں کی گئی' بلکہ یہ روایت حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس کے شروع کے الفاظ یہ ہیں کہ "مجھے جنگ جمل کے موقعے پر اس حدیث کے ذریعے سے اللہ نے بڑا فائدہ پہنچایا۔"

وہ فائدہ یہی تھا کہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ خونِ عثمان کے مطالبۂ قصاص میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہمنوا تھے جس کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ ان کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی معیت میں سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا پڑتا' لیکن حدیث وہاں زیر بحث نہیں آئی نہ مخالف گروپ نے دوسرے گروپ کی قوت کو توڑنے کے لیے اس کا حوالہ دیا' بلکہ ازخود حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ

نے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کے گروپ کے آدمی تھے اپنے طور پر حدیث کا جو اقتضاء تھا' اس پر عمل کیا۔ اس لیے اس دعوے میں کوئی حقیقت نہیں کہ اہل علم کے ایک حلقے نے اس حدیث کو استقام سے خالی نہیں سمجھا۔

بعض لوگ اس مقام پر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا جنگ جمل میں حصہ لینے سے بھی تو عورتوں کے لیے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا جواز نکلتا ہے' لیکن ایسے تمام حضرات کے علم میں یہ بات آنی چاہیے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ساری عمر اپنے اس اقدام پر نادم رہی ہیں' بلکہ یہاں تک آتا ہے کہ جب وہ قرآن حکیم کی تلاوت کرتے کرتے سورۂ احزاب کی اس آیت ﴿ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ ﴾ "عورتیں گھروں کے اندر ٹک کر رہیں" پر پہنچتیں تو زار و قطار روتیں' کہ مجھ سے جنگ جمل کے موقعے پر اس آیت کی خلاف ورزی ہو گئی تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ اقدام ایک ہنگامی نوعیت کا اور ایک محدود قسم کا تھا اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں خلافت کی امیدوار بھی نہیں تھی۔ اس لیے ایک تو عام نارمل حالات کے لیے اس سے استدلال کرنا صحیح نہیں۔ دوسرے' عورت کی سربراہی کا مسئلہ اس سے کشید کرنے کا جواز بھی نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے خود بھی مذکورہ حدیث کی بنیاد پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ساتھ دینے سے تأمل کیا ہے جیسا کہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی صراحت گزر چکی ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان سے تعاون کی درخواست کی' تو انہوں نے جواب دیا۔ "آپ بلاشبہ ماں ہیں' آپ کا حق بھی بہت عظیم ہے۔ لیکن (میں آپ کا ساتھ دینے سے اس لیے معذور ہوں کہ) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ وہ قوم ہرگز فلاح یاب نہیں ہو گی جس نے اپنے معاملات عورت کے سپرد کر دیے۔" (فتح الباری: ۵۶/۱۳)

چوتھی بات یہ ہے کہ قرآن و حدیث کے واضح اور غیر مبہم احکامات و نصوص کے مقابلے میں کسی کا قول یا عمل حجت نہیں ہے۔ اس لیے کسی بھی شخصیت کے قول و عمل

سے استدلال صحیح نہیں۔ مذکورہ کالم نگار ذرا اپنے حلقے کے علماء سے مسئلہ رضاعت کبیر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مسلک پوچھ لیں اور پھر بتلائیں کہ کیا وہ اس کو جمہور علماء کے مسلک کے مقابلے میں ماننے کے لیے تیار ہیں؟

④ والیۂ سبا ملکہ بلقیس کے قرآن کریم میں ذکر سے استدلال

قرآن کریم میں ملکۂ بلقیس کے ذکر سے بھی استدلال کیا گیا ہے کہ قرآن نے ملکۂ بلقیس کی حکمرانی کے تذکرے میں کوئی اشارہ نہیں دیا جس سے اس ملکہ کے کردار کے بارے میں نکیر کا رنگ جھلکتا ہو۔ اس لیے اس واقعے سے بھی عورت کی حکمرانی کا جواز بلکہ تائید و تحسین کا پہلو نکلتا ہے۔

لیکن ہم عرض کریں گے کہ قرآن کریم میں کئی واقعات و قصص تاریخی طور پر اس انداز سے بیان کیے گیے ہیں کہ ان پر کسی قسم کی نکیر نہیں کی گئی ہے۔ کیونکہ وہاں مقصود صرف بیان واقعہ ہے اس کی تحسین یا تردید نہیں ہے' اس لیے قرآن و حدیث کے واضح نصوص کے مقابلے میں اس قسم کے واقعات سے اگر استدلال اپنے اندر جواز کا کوئی پہلو رکھتا ہے تو پھر تو اور بھی بہت کچھ ماننا پڑے گا۔ ہم یہاں اپنے نقطۂ نظر کی توضیح میں موصوف کی توجہ صرف ایک اور واقعے کی طرف مبذول کرائیں گے اور وہ ہے حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ۔ اس واقعے میں دیکھیے کہ عزیز مصر (زلیخا کے خاوند) نے اپنی بیوی کے مکر کو (جو اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کے پھسلانے کے لیے اختیار کیا تھا) دیکھ کر عورتوں کے بارے میں اس رائے کا اظہار کیا۔ ﴿ اِنَّهٗ مِنۡ كَيۡدِكُنَّ اِنَّ كَيۡدَكُنَّ عَظِيۡمٌ ﴾ (یوسف: ۱۲/۲۸) کہ "عورتوں کا مکر بڑا عظیم ہے" جس کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں بڑی مکار ہیں۔ قرآن کریم نے بغیر کسی ادنی نکیر کے عزیز مصر کا یہ مقولہ نقل کیا ہے' کیا حقانی صاحب کے استدلال کی رو سے یہاں یہ کہنا صحیح ہو گا کہ عورتیں بڑی مکار ہوتی ہیں' کیونکہ قرآن کریم میں بغیر کسی نکیر کے یہ قول نقل کیا گیا ہے؟

اور آگے چلیے جب زلیخا کا یہ واقعہ مصر کی عورتوں میں مشہور ہوا تو اس نے زنانِ مصر کو

جمع کر کے حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال کا مشاہدہ کروایا اور عورتیں فی الواقع حضرت یوسف کے حسن و جمال میں اتنی وارفتہ ہوئیں کہ انہیں اپنا ہوش و حواس بھی نہ رہا اور چھریاں اپنے ہاتھوں پر پھیر لیں۔ قرآن کریم نے اس واقعہ کو بھی بغیر کسی نکیر کے نقل کیا ہے۔ کیا اس سے یہ استدلال صحیح ہو گا کہ اس طریقے سے عورتوں کو مردوں کے حسن و جمال کے مشاہدے کی اجازت ہے۔ کیوں کہ قرآن نے امرأۃ عزیز اور زنانِ مصر کا یہ واقعہ بغیر کسی نکیر کے نقل کیا ہے؟

اور آگے چلیے کہ زلیخا نے زنانِ مصر سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہے وہ شخص جس کی بارگاہ حسن میں میں نقد دل ہار بیٹھی ہوں۔ کیا اب بھی تم مجھے ملامت کرو گی؟ قرآن نے بغیر کسی نکیر کے یہ قول بھی نقل کیا ہے۔ کیا اس سے یہ استدلال کرنا جائز ہو گا کہ اگر کوئی منکوحہ عورت کسی حسین مرد کے عشق کے جال میں پھنس جائے' تو اس کے لیے اپنے اس فعل ناروا کے جواز و اثبات کے لیے اس کے حسن و جمال کا چرچا اور دیدارِ یار کا اہتمام کرنا صحیح ہے' تاکہ اس کی مجبوری کو جان کر اسے معذور گردانا جائے۔

ذرا سوچیے! اس قسم کے سطحی استدلالات سے قرآن کریم کے محکم نصوص کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے؟ پھر یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہے کہ قرآن کریم نے ملکۂ سبا کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ جس سے اس کی تحسین اور دانش مندی کا اظہار ہوتا ہے اس واقعے کا آغاز ہی ہدہد کی زبانی اس تعجب انگیز خبر سے کیا گیا کہ:

"ایک عورت وہاں حکمران ہے جسے ہر چیز عطا کی گئی ہے اور اس کے لیے بڑا تخت ہے' وہ عورت اور اس کی قوم اللہ کو چھوڑ کر سورج کی پوجا کرتی ہے اور شیطان نے ان کے عملوں کو ان کے لیے مزین کر دیا ہے اور اس نے ان کو راہ راست سے روک دیا ہے۔ پس وہ راہ یاب نہیں ہوتے۔" (النمل: ۲۷/ ۲۳-۲۴)

کیا اس صراحت سے یہ واضح نہیں ہے کہ ایک عورت کو حکمرانی کرتے ہوئے دیکھ کر ایک جانور تک نے حیرت و تعجب کا اظہار کیا اور اسی طرح اس کی سورج پرستی کو نشانۂ تنقید بنایا اور پھر اسے راہ راست سے بھٹکا ہوا اور شیطان کے دام فریب میں پھنسا ہوا قرار

دیا ہے' لیکن حقانی صاحب فرما رہے ہیں کہ "قرآن نے ملکۂ بلقیس کی حکمرانی کے پورے تذکرے میں کوئی ایسا اشارہ نہیں دیا جس سے اس ملکہ کے کردار کے بارے میں نکیر کا رنگ جھلکتا ہو۔"

پھر قرآن کریم میں بیان کردہ یہ پہلو کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو یہ لکھا کہ "میرے خلاف سرکشی کا راستہ اختیار مت کرو اور فرمانبردار بن کر میری خدمت میں حاضر ہو جاؤ!" (النمل ۳۱/۲۷)

تو ملکۂ سبا نے گھٹنے ٹیک دیے اور کوئی مزاحمت و مقاومت نہیں کی۔ کیا یہ عورت کی حکمرانی کی کمزوری کی نشاندہی نہیں کرتا؟ اگر بادشاہ کوئی مرد ہوتا' تو کیا وہ اتنی آسانی سے بغیر کسی مزاحمت کے گھٹنے ٹیکنے کے لیے تیار ہو جاتا؟

اور سب سے بڑھ کر قرآن ملکہ سبا کے مشرکہ اور کافرہ ہونے کی صراحت کرتا ہے۔ کیا اب اہل اسلام اتنے ہی بے بضاعت ہو گئے ہیں کہ ایک کافرہ و مشرکہ عورت کا کردار و عمل ہی ان کے لیے قابل تقلید نمونہ رہ گیا ہے؟ اس مقام پر تو افلاس علم پر ماتم کرنے کے ساتھ ساتھ' نگاہ کی نامسلمانی سے بھی فریاد کرنے کو جی چاہتا ہے۔

بہرحال ملکۂ سبا کے قرآن کریم میں ذکر کرنے سے عورت کی سربراہی کا جواز ایسا ہی ہے جیسے کوئی قصۂ یوسف کے ضمن میں بیان کردہ مذکورہ باتوں کو سند جواز عطا فرمادے۔ ع

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

④ قرآن کریم سے ملوکیت کا جواز ہی نہیں' استحسان ثابت ہے

علاوہ ازیں اس تجدد پسند طبقے کا قرآن کریم سے تعلق و شغف کا حال تو یہ ہے کہ قرآن کریم میں "ملوکیت" کا جس انداز سے ذکر آیا ہے اس سے یقیناً ملوکیت (بادشاہی نظام) کا جواز ہی نہیں نکلتا تحسین و تائید کا رنگ صاف جھلکتا ہے' لیکن یہ طبقہ ملوکیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل پر جو احسانات کیے اور جن انعامات سے ان کو نوازا قرآن کریم میں ان کے ضمن میں جہاں اور نعمتیں گنوائی ہیں' ایک نعمت یہ بھی بیان کی ہے کہ

تمہارے اندر انبیاء پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تمہیں ملوک (بادشاہ) بھی بنایا۔

﴿ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا ﴾

(المائدة٥/ ٢٠)

"اللہ کی وہ نعمتیں یاد کرو جو تم پر ہوئیں' جب کہ اس (اللہ) نے تمہارے اندر انبیاء بنائے اور تمہیں بادشاہ بنایا۔"

حضرت طالوت کی بادشاہت کی تحسین ہی نہیں ملتی' بلکہ قرآن سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ بطور بادشاہ ان کا انتخاب بھی اللہ تبارک و تعالیٰ ہی نے فرمایا:

﴿ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ ﴾ (البقرة٢/ ٢٤٧)

"اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمہارے اوپر (بادشاہی کرنے کے لیے) پسند فرمایا ہے اور اس کو علم و جسم میں فراخی عطا فرمائی ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنی بادشاہی نصیب فرماتا ہے۔"

بلکہ آیت کے آغاز میں فرمایا:

﴿ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ﴾ (البقرة٢/ ٢٤٧)

"اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمہارے اوپر (بادشاہی کرنے کے لیے) پسند فرمایا ہے۔"

حضرت سلیمان علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے نبوت کے ساتھ ساتھ بادشاہت سے بھی سرفراز فرمایا تھا اور پھر ان کی حسب خواہش یہ بادشاہت بھی ایسی زبردست اور بے مثال تھی کہ قیامت تک ایسی بادشاہت کسی کو نصیب نہیں ہوگی' کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے دعار فرمائی تھی۔ ﴿ رَبِّ اغْفِرْلِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِنْ بَعْدِي ﴾ (سورہ ص:٣٨/ ٣٥) جسے اللہ تبارک و تعالیٰ نے شرف قبولیت سے نوازا اب ایسا جلیل القدر بادشاہ کہ جس کی حکمرانی جن و انس کے علاوہ وحوش و طیور اور ہوا پر بھی ہو' قیامت تک نہیں ہوگا۔

کیا نبیوں تک کو بادشاہی دے کر اللہ تعالیٰ نے یہ واضح نہیں فرما دیا ہے کہ بادشاہی نظام فی نفسہ مذموم نہیں ہے' بلکہ محمود و مستحسن ہے جس چیز کو اللہ نے اپنے نبیوں کے لیے پسند

فرمایا ہو' اس کے استحسان و جواز میں شک کرنا بھی ایمان کے منافی ہے۔ اس کے برعکس جمہوریت کی بابت قرآن کریم سے واضح ہوتا ہے کہ یہ نظام اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اکثریت کے پیچھے چلنے سے اس لیے منع فرمایا ہے کہ اکثریت ہمیشہ گمراہوں ہی کی ہوتی ہے۔ بنابریں اکثریت کے پیچھے چلنے والے بھی گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اپنے پیغمبر ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِى ٱلْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ ﴾

(الأنعام٦/ ١١٦)

"اے پیغمبر! اگر تو اہل زمین کی اکثریت کے پیچھے چلے گا تو وہ تجھ کو بھی اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی۔"

اور "جمہوریت" نام ہی عوام کی اکثریت کا ہے تو قرآن کریم کی رو سے "جمہوریت" کیونکر ایک صحیح نظام حکومت ہو سکتا ہے؟

⑤ قرآن کریم میں عورت کی سربراہی کے عدم جواز کے دلائل

آخر میں مذکورہ کالم نگار نے کہا ہے کہ "قرآن ہی سے دوسرے بہت سے دلائل بھی دیے جاتے ہیں جو عورت کی سربراہی کے بارے میں پائے جانے والے شکوک کی سنگینی کم کرتے ہیں یا انہیں بالکل رفع کر دیتے ہیں۔"

مگر افسوس ہے کہ موصوف نے وہ دلائل ذکر نہیں فرمائے' کاش وہ ان کی صراحت بھی فرما دیتے' کیونکہ ہم تو اب تک قرآنی دلائل ہی کی رو سے عورت کی سربراہی کے جواز کے قائل نہیں ہیں۔ قرآن ہی نے امہات المومنین رضی اللہ عنہن کو ہدایات دیتے ہوئے ایک ہدایت یہ دی ہے کہ "وہ گھروں میں ٹک کر رہیں" ظاہر بات ہے کہ گھر کے اندر رہتے ہوئے جہانبانی کے فرائض ادا نہیں کیے جا سکتے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ سربراہی و قیادت کی ذمے داریوں سے عورت کو اس کی فطری صلاحیتوں' صنفی مجبوریوں اور مقصد تخلیق کے اعتبار سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے اور اس میں قطعاً عورت کی اہانت نہیں ہے۔ جیسا کہ باور کرایا جاتا ہے' بلکہ مرد و

عورت کی الگ الگ صلاحیتوں کے اعتبار سے ان کا دائرۂ کار بھی الگ الگ اور ایک دوسرے سے مختلف رکھا گیا ہے۔ اسی طرح قرآن میں فرمایا گیا ہے:

﴿ ٱلرِّجَالُ قَوَّٰمُونَ عَلَى ٱلنِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ ٱللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَبِمَآ أَنفَقُوا۟ مِنْ أَمْوَٰلِهِمْ ﴾ (النساء٤/ ٣٤)

"مرد عورتوں پر قوام ہیں۔ بسبب اس کے جو فضیلت دی اللہ نے بعض کو بعض پر اور بسبب اس کے جو مرد اپنے مالوں میں سے خرچ کرتے ہیں۔"

قوام کے معنی حاکم' نگران وغیرہ کے ہیں اور اس کی جو دو وجہیں آگے بیان کی گئی ہیں کہ ایک تو مرد کو عورت کے مقابلے میں جسمانی قوت و توانائی زیادہ عطا کی گئی ہے اور دوسرے' مرد عورت کے نان و نفقہ کا ذمے دار اور کفیل ہے' یہ دونوں وجہیں قوام کے اس مفہوم کو واضح کر دیتی ہیں اور ان کی موجودگی میں اس کا کوئی دوسرا مفہوم نہیں لیا جا سکتا۔ جب قرآن کریم کی رو سے عورت گھر کی نہایت مختصر اور محدود زندگی میں مرد کے مقابلے میں سربراہ نہیں بن سکتی تو اس قرآن کریم کی رو سے ایک ملک کی سربراہ کیسے بن سکتی ہے؟

⑥ فارس کی حکمران عورت کا نام بوران دخت بنت کسریٰ ہے

بعض لوگ حدیث بخاری کی صحت میں تشکیک پیدا کرنے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ فارس کی جس عورت کی بابت کہا گیا ہے' یہی غلط ہے۔ فارس (ایران) میں تو سرے سے نبی ﷺ کے دور میں کوئی عورت حکمران ہی نہیں بنی ہے۔

لیکن یہ دعویٰ یکسر غیر صحیح ہے-اور تاریخ سے ثابت ہے کہ بہ عہد نبوی فارس میں عورت حکمران بنی ہے۔ چنانچہ تاریخ طبری میں اس کا نام بوران بنت کسریٰ پرویز بن ہرمز بتلایا گیا ہے۔ (تاریخ طبری' عربی: ۲۳۱/۲' طبع دار المعارف مصر)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی فتح الباری (۱۲۸/۸ و ۵۶/۱۳) میں بوران نام ہی بتلایا ہے۔ تاہم اسے بنت شیرویہ بن کسریٰ بن پرویز لکھا ہے۔ جب کہ طبری نے اسے بنت کسریٰ بتلایا

ہے اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے بوران شیرویہ کی لڑکی نہیں، بہن بنتی ہے۔ فارسی اور اردو تاریخ دان کسریٰ کا نام بالعموم خسرو پرویز لکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ بوران کو خسرو پرویز کی دختر لکھتے ہیں۔ چنانچہ مجلس ترقی ادب لاہور کے زیر اہتمام مطبوعہ تاریخ ایران میں اس حکمران عورت کا ذکر بایں الفاظ مرقوم ہے:

"اس کے بعد خسرو پرویز کی بیٹی بوران دخت تخت نشین ہوئی۔ ثعالبی لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو بوران دخت کے تخت نشین ہونے کی خبر ملی تو فرمایا، "وہ قوم جو ایک عورت کو حکومت کی عنان سونپتی ہے، وہ کبھی آسائش نہیں دیکھ سکتی" وہ چھ ماہ ہی حکومت کر پائی تھی کہ بیمار ہو گئی اور بیماری سے جانبر نہ ہو سکی۔" (تاریخ ایران، مؤلفہ پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی: جلد ۱/۵۲۵، طبع ۱۹۶۷)

علاوہ ازیں اس تاریخ ایران میں اسے ۶۳۰ عیسوی کے بعد کا واقعہ قرار دیا گیا ہے، جب کہ نبی ﷺ کی بعثت ۶۱۰ عیسوی میں ہوئی ہے۔ خلعت نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد آپ کے تیرہ سال مکے میں گزرے اور اس کے بعد ہجرت فرمائی، اس اعتبار سے یہ واقعۂ فارس، جس میں عورت کو حکمرانی ملی، گویا ۷ ہجری کے بعد رونما ہوا ہے، کیونکہ ہجرت کا ساتواں سال ۶۳۰ عیسوی میں پڑتا ہے۔ اس کی تائید اسلامی مصنّفین کی صراحتوں سے بھی ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ عورت کی حکمرانی کا یہ واقعہ اس بددعا کے بعد رونما ہوا ہے جب کسریٰ نے رسول اللہ ﷺ کا وہ مکتوب پھاڑ دیا تھا جو آپ نے دعوت اسلام قبول کرنے کے لیے اس کو لکھا تھا، تو آپ نے اس کے حق میں بددعا فرمائی کہ اس کی حکومت بھی اسی طرح پارہ پارہ ہو جائے۔

«فَدَعَا عَلَيهِمُ النَبيُّ ﷺ أَنْ يُمَزَّقُوا كُلَّ مُمَزَّقٍ»(صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب دعوة اليهود والنصارى، وعلى ما يقاتلون عليه ... الخ، ح:۲۹۳۹)

اس ارسال دعوت و مکتوب کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ ۷ ہجری کے اوائل کا واقعہ ہے اور امام ابن سعد رحمہ اللہ نے بھی اس سن کو جزم کے ساتھ تسلیم کیا ہے۔

(فتح الباری: ۱۲۷/۸)

اس کے فوراً بعد ہی کسریٰ (خسرو پرویز' شاہ فارس) کو اس کے اپنے بیٹے شیرویہ نے قتل کر دیا۔ یہ شیرویہ قباد دوم کے نام سے تخت طاؤس پر فروکش ہوا۔ اس ظالم نے صرف اپنے باپ ہی کو نہیں مارا' بلکہ اپنے سولہ بھائیوں کو بھی اس اندیشے کے پیش نظر موت کے گھاٹ اتار دیا کہ مبادا کوئی اس کی حکومت چھیننے کے لیے کھڑا ہو جائے۔

بالآخر چھ مہینے کے بعد ایک وبائی مرض (پلیگ) کا شکار ہو کر اپنے باپ اور بھائیوں کا یہ قاتل حکمران بھی لقمۂ اجل بن گیا۔ جس کے بعد اس کی بہن بوران دخت بنت کسریٰ تخت فارس کی وارث اور ملک فارس کی حکمران بنی' جس کی خبر جب رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ نے زیر بحث مذکورہ فرمان ارشاد فرمایا' جس کی صداقت بھی چند سالوں ہی میں دنیا نے دیکھ لی کہ فارس سے یہ مجوسی حکومت ہی ختم ہو گئی اور اس کی جگہ وہاں اسلام کا جھنڈا لہرانے لگا۔

⑦ مولانا مودودی مرحوم کے سیاسی موقف سے استدلال

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر عورت کی سربراہی کی گنجائش اسلام میں نہ ہوتی تو ایوب خان کے دور کے صدارتی انتخاب میں علماء فاطمہ جناح کی حمایت نہ کرتے۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب اور بہت سے علماء نے اس وقت ایوب خان کے مقابلے میں فاطمہ جناح کی حمایت کی تھی۔

بلاشبہ اس وقت بعض علماء نے ایوب خان کے مقابلے میں محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کی تھی' جن میں بالخصوص مولانا مودودی مرحوم سرفہرست ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ ان حضرات نے فاطمہ جناح کی حمایت یہ سمجھتے ہوئے نہیں کی تھی کہ عورت کا سربراہ حکومت بننا اسلام میں جائز ہے' بلکہ انہوں نے اسلام کے اصول (کہ مرد و عورت کا دائرۂ کار ان کی فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے الگ الگ ہے) کو تسلیم کرتے ہوئے ایک اضطرار کے طور پر حمایت کی تھی۔ جیسا کہ ان کے بیانات' تقاریر اور مضامین وغیرہ اور اس دور کے مخصوص پس منظر سے واضح ہے۔ علاوہ ازیں مولانا مودودی مرحوم کی تو ایک مفصل

کتاب "پردہ" اس موضوع پر موجود ہے جس میں انہوں نے پوری تفصیل اور مکمل دلائل سے اسلام کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے اور اپنی تفسیر "تفہیم القرآن" میں بھی متعدد جگہ مغربی نظریۂ مساوات مرد و زن کی بھرپور تردید کی ہے۔ اس لیے ان کے ایک عارضی' وقتی اور سیاسی موقف کو' جو ان کے خیال میں ایک اضطراری اقدام تھا' بنیاد بنا کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے نزدیک عورت سربراہ حکومت ہو سکتی ہے یا چونکہ انہوں نے ایک عورت کی حمایت کی تھی تو گویا یہ اس بات کی سند ہے کہ اسلام میں عورت کے سربراہ ہونے کی اجازت موجود ہے۔

ایسا دعویٰ خود مولانا مودودی مرحوم پر بھی ظلم ہے اور اسلام پر بھی ظلم ہے' کیوں کہ یہ واقعات کے سراسر خلاف ہے۔ رہ گیا مسئلہ ان کے اضطرار کے طور پر حمایت کرنے کا' کہ اس کی کیا حیثیت ہے؟ تو اس کے بارے میں اب سکوت زیادہ بہتر ہے' کیونکہ اب ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہو چکا ہے۔ اگر ان کی دینی بصیرت' ملی درد اور سیاسی فہم نے اسے "اضطرار" سمجھنے میں ٹھوکر نہیں کھائی' تو یقیناً عنداللہ وہ مجرم نہیں ہوں گے' بلکہ امید ہے کہ وہ دگنے اجر کے مستحق ہوں گے اور اگر ان سے اس موقعے پر اجتہادی غلطی ہوئی ہے' تب بھی وہ ایک اجر کے مستحق بہرحال قرار پائیں گے اور اگر اسے ایک اجتہادی امر نہ سمجھا جائے' بلکہ ان کے موقف کو "سیاسی مصلحت" باور کیا جائے' پھر تو مسئلہ بالکل ہی واضح ہو جاتا ہے' کیونکہ سیاسی مصلحت کے طور پر بھی بعض کام انہوں نے غلط کیے ہیں جس سے ان کا جواز ثابت نہیں ہو سکتا' مثلاً "عید میلاد" کے جلوس کے مولانا مودودی مرحوم قائل نہیں تھے اور اسے صریحاً غلط اور ناجائز ہی سمجھتے تھے۔ (ملاحظہ ہو' روداد جماعت اسلامی' پنجم' ۵/۱۳۲' طبع جون ۱۹۸۲ء)

لیکن ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے موقع پر' جب ان کو "شوکت اسلام" کا جلوس نکالنے کی ضرورت پیش آئی تھی' تو اس وقت انہوں نے ایک سوال کے جواب میں جلوس میلاد کا جواز بھی اس اندیشے کے پیش نظر تسلیم کر لیا تھا کہ اس موقعے پر اگر میں نے جلوس میلاد کے عدم جواز کا فتویٰ دے دیا تو اس کا اثر کہیں "شوکت اسلام" کے جلوس پر نہ پڑ جائے۔

(ملاحظہ ہو اخبار روزنامہ "ندائے ملت" لاہور' ۱۸ مئی ۱۹۷۰)

خیال رہے شوکت اسلام کے جلوس کی تاریخ ۳۱ مئی ۱۹۷۰ء تھی جب کہ اس سال "یوم میلاد" ۱۹ اپریل کو پڑا تھا۔

ایک اور عبرت آموز اور دلچسپ لطیفہ: یہ لطیفہ بھی بڑا دلچسپ اور عبرت آموز ہے کہ اس وقت جماعت اسلامی کے اعلان کردہ جلوس "شوکت اسلام" کو ناکام بنانے کے لیے دیوبندی علماء کے ترجمان اخبارات (خدام الدین' لاہور' وغیرہ) نے جلوس میلاد کی حمایت و تائید فرمائی اور لوگوں کو یہ باور کرایا کہ اصل جلوس تو "میلاد" کا ہے جس میں شریک ہونا چاہیے یہ "شوکت اسلام" کا جلوس کیا ہے؟ درآں حالیکہ علمائے دیوبند خود بھی "جلوس میلاد" کے قائل نہیں ہیں۔

اس سے بہرحال یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بعض علماء سیاسی مصلحت کا شکار ہو کر شریعت کے تقاضوں کو بھی بعض دفعہ نہایت بے دردی سے پامال کر دیتے ہیں۔ اس لیے اس قسم کے اقدامات زلات اور لغزشیں ہیں جن سے استدلال نہیں کیا جا سکتا' کیونکہ شریعت تو نام ہے قرآن و حدیث کا' علماء کے قول و عمل کا نام شریعت نہیں ہے۔ ان کے قول و عمل کو بھی شریعت کی روشنی ہی میں دیکھا جائے گا' جو اس کے مطابق ہو گا' وہ ٹھیک ہے۔ جس میں شریعت سے انحراف ہو گا' وہ مردود ہے۔

بہرحال جن علماء نے ایوب خان کے دور میں فاطمہ جناح کی حمایت کی ہے' اس کے مختلف اسباب ہیں' جن کی وجہ سے ان کے طرز عمل سے اسلام کا مسلمہ اصول باطل قرار نہیں پا سکتا۔

ایک باخبر صحافی کی طرف سے توضیح مزید: فاطمہ جناح کو صدارتی امیدوار نامزد کرتے وقت سیاسی استبداد کی جو صورت تھی اور فاطمہ جناح کے جو وجوہ انتخاب تھے اس کی ضروری تفصیل ایک باخبر صحافی جناب محمد صلاح الدین صاحب مدیر "تکبیر" کراچی کے حسب ذیل اقتباس میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے' وہ لکھتے ہیں۔

"اس وقت معاملہ یہ تھا کہ ایوب خان کی آمریت سے نجات پانے کی کوئی مناسب صورت

تلاش کی جارہی تھی پہلے اعظم خان کا انتخاب کیا گیا۔ لیکن اس کی بھنک پڑتے ہی خصوصی پیغامبر مولوی فرید احمد کو لاہور ائیرپورٹ پر گرفتار کرلیا گیا اور اعظم خاں بھی گرفت میں لے لیے گئے۔ چودھری محمد علی' نواب زادہ نصراللہ خان اور دیگر حضرات نے مادر ملت کی شخصیت میں ایوب خان کا توڑ تلاش کیا۔ ان پر ہاتھ ڈالنا آسان نہ تھا۔ مولانا مودودی اس وقت جیل میں تھے' فتوے کے لیے پہلے مولانا مفتی محمد شفیع سے رجوع کیا گیا۔ ان پر دباؤ بڑھا تو دو سطر کا فتویٰ جاری کر دیا کہ "دو برائیوں میں سے کم تر برائی کا انتخاب کر لیا جائے۔"

ایوب خاں اپنی پرویز نوازی' رویت ہلال اور عائلی قوانین کی وجہ سے دینی حلقوں میں خاصے ناپسندیدہ قرار پا چکے تھے' مادر ملت صرف عورت نہیں تھیں' قائداعظم محمد علی جناح کی بہن تھیں' پختہ کردار' نیک نام اور انتہائی محترم خاتون تھیں' سن رسیدہ تھیں' متنازعہ نہ تھیں' ان کے کردار پر کسی حرف گیری کی گنجائش نہ تھی' ان کی ذات سے کوئی اسکینڈل وابستہ نہ تھا' ان سے قوم کی گہری عقیدت تھی۔

مولانا مودودی کی رہائی سے قبل ہی وہ رائے عامہ کی ترجمان بن چکی تھیں' مولانا نے رہائی پاتے ہی ان کے حق میں رائے دی--- وہ عمر کے اس حصے میں تھیں جہاں شریعت پردے وغیرہ کی پابندیوں کو خود ہی نرم کر دیتی ہے۔ جہاں وہ قباحتیں باقی نہیں رہتیں جن کے پیش نظر ٹک کر گھر بیٹھنے اور پردے کے حدود قائم رکھنے کا حکم دیا گیا۔ اس سب کے باوجود مولانا مودودی کی رائے سے اختلاف کیا گیا۔ ان کی اپنی جماعت کے لوگوں نے اختلاف کیا--- یہ ایسی رائے نہیں تھی جسے علمائے کرام اور عام مسلمان آسانی سے ہضم کر لیتے۔ خود مولانا کے فیصلے میں خصوص تھا' عموم نہیں۔

اس معاملے کا دوسرا اور زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ مادرِ ملت سربراہ حکومت بننے کی امیدوار نہیں تھیں۔ انہوں نے مذاکرات کرنے والے لوگوں سے صاف کہہ دیا تھا کہ میں تحریک کی قیادت کر سکتی ہوں' ملک کی صدارت مجھے منظور نہیں۔ انہیں جب بتایا گیا کہ موجودہ نظام میں امیدواریٔ صدارت کے بغیر کوئی تحریک نہیں چل سکتی' تو انہوں نے عبوری مدت کا سوال اٹھایا اور پوچھا کہ میری جگہ اصل صدر لانے میں تمہیں کتنا عرصہ لگے

گا' تو جواب دیا گیا کہ تقریباً ایک سال۔ مگر انہوں نے اس "طویل عرصے" کو مسترد کر دیا اور صرف تین ماہ کے اندر اندر نیا صدر منتخب کرنے کی مہلت دی۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو وہاں حصول حکومت کا محرک ہی موجود نہیں تھا۔ وہ کسی خواہش اقتدار کے بغیر محض آمریت سے نجات دلانے کے لیے میدان میں نکلنے پر آمادہ ہوئی تھیں۔ اب ان کی عمر' مخصوص حالات' محدود اور متعین مقصد' حصول اقتدار کے محرک کی عدم موجودگی اور صفاتِ کردار سب کو ذہن میں رکھا جائے تو اس مثال سے عورت کی حکمرانی کا عام جواز نکال لینے کا کوئی قرینہ نہیں بنتا' اس کا کہیں اور اطلاق ہو گا تو عمر' صفاتِ کردار اور مخصوص و محدود مقصد سب ہی کو پیش نظر رکھا جائے گا' محض ہم جنس ہونا کافی نہیں ہو گا۔ کہا جا سکتا ہے کہ اب بھی تو آمریت سے نجات پانے کے لیے ایک طاقتور حریف کی ضرورت تھی' جواباً عرض ہے کہ وہ "آمر" تو جنگ اقتدار سے قبل ہی اللہ کو پیارا ہو گیا' اب اس کے مقابل آنے کی کیا ضرورت؟ دوسرے مادر ملت کی طرح خواہش اقتدار ترک کیجیے' قوم کی قیادت کا حق ادا ہو گیا۔ جمہوریت کی منزل سر ہو گئی۔ اب اپنا متبادل آگے لائیے۔ یہاں کوئی ایسی ہنگامی یا اضطراری صورت حال نہیں کہ عورت کی سربراہی کے بغیر ملک و ملت کا کام ہی نہ چل سکے۔" (ہفت روزہ "تکبیر" کراچی' ص:۱۲-۱۳' ۱۵ دسمبر ۱۹۸۸ء)

⑧ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ اور اس پر تبصرہ

عورت کی سربراہی کے مسئلے میں مولانا اشرف علی تھانوی کی رائے سے بھی استدلال کیا جاتا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نقطۂ نظر بھی واضح کر دیا جائے۔ مولانا تھانوی مرحوم نے حکومت کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں۔

پہلی قسم : وہ جو تام بھی ہو اور عام بھی۔ تام سے مراد یہ ہے کہ حاکم بانفرادہ خود مختار ہو' یعنی اس کی حکومت شخصی ہو اور اس کے حکم میں کسی حاکم اعلیٰ کی منظوری کی ضرورت نہ ہو۔ گو اس کا حاکم ہونا اس پر موقوف ہو۔ اور عام یہ کہ اس کی محکوم کوئی محدود قلیل جماعت نہ ہو' مثلاً کسی عورت کی سلطنت یا ریاست بطرز مذکور شخصی ہو۔

دوسری قسم : وہ جو تام ہو مگر عام نہ ہو جیسے کوئی عورت کسی مختصر جماعت کی منتظم بلا شرکت ہو۔

تیسری قسم : وہ جو عام ہو مگر تام نہ ہو۔ جیسے کسی عورت کی سلطنت جمہوری ہو کہ اس میں والیٔ صوری در حقیقت والی نہیں ہے۔ بلکہ ایک رکن مشورہ ہے اور مشیروں کا مجموعہ والیٔ حقیقی ہے۔

مولانا تھانوی صاحب فرماتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں مراد پہلی قسم یعنی شخصی حکومت ہے جس میں سربراہ حکومت کو مکمل اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ بخلاف قسم ثانی و ثالث کے کہ وہاں حاکمیت کامل نہیں ہے بلکہ وہ مشورۂ محضہ ہے گو اس مشورے کو دوسرے منفرد مشوروں پر ترجیح حاصل ہو' لیکن اس میں ولایت کاملہ کی شان نہیں ہے۔ علاوہ ازیں مولانا یہ بھی فرماتے ہیں' کہ ایسی حکومت کی حقیقت محض مشورہ ہے اور عورت مشورے کی اہل ہے اس بنا پر اگر سلطنت شخصی بھی ہو مگر ملکہ التزاماً اپنی انفرادی رائے سے کام نہ کرتی ہو تو وہ بھی اس حدیث میں داخل نہیں ہو گی' کیونکہ عدم فلاح (ناکامیابی) کی علت نقصان عقل ہے اور جب مردوں کے مشورے سے اس کا انجبار (ازالہ) ہو گیا تو علت مرتفع ہو گئی' تو معلول یعنی عدم فلاح بھی منفی ہو گیا۔ اس طرح ایسی ریاستیں' جو عورتوں کے زیر فرمان ہیں' عدم فلاح کے حکم سے بری ہیں۔ (ملخص از "امداد الفتاویٰ" ۵/۹۹-۱۰۱' مطبوعہ کراچی)

مولانا تھانوی رحمہ اللہ نے یہ ساری گفتگو ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے ضمن میں فرمائی ہے جو ہندوستان میں قائم تھیں اور ان میں بعض مسلمان ریاستوں میں عورت کے ہاتھ میں ریاست کی زمام تھی' جیسے بھوپال۔

یہ مسلم حکمران عورتیں' اسلام کی پابند اور شریعت کے ضابطوں کو نہ صرف تسلیم کرنے والی تھیں' بلکہ اپنی ریاست میں بھی اسلامی شریعت کی بالادستی انہوں نے قائم کی ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں حکمران خاندان میں موزوں مرد نہ ہونے کی وجہ سے بعض جگہ یہ صورت رونما ہوئی کہ موروثی طور پر کسی عورت کو انتظام ریاست سنبھالنا پڑا۔ بنابریں حکمران ہونے کے

باوجود ان خواتین نے بے پردگی اختیار نہیں کی۔ مردوں کے ساتھ بے محابا اور بے باکانہ اختلاط کا راستہ اختیار نہیں کیا اور سب سے بڑھ کر اپنے آپ کو عقل کل بھی نہیں سمجھا اور تمام معاملات ریاست سمجھدار اہل علم و اہل دانش کے مشورے سے چلاتی رہیں۔ یوں ان کے دور حکمرانی میں بالعموم اسلامی اصول و ضوابط کی پابندی رہی۔ تاہم حدیث مذکور کی بنا پر ایک خلش ان کے اندر پھر بھی موجود رہی جس کا حل مولانا تھانوی نے مذکورہ توجیہ کے ذریعے سے پیش کیا ہے۔

یہ ان کی ایک تاویل اور توجیہ ہی ہے جس کے علماء پابند نہیں ہیں۔ تاہم اسے کسی درجے میں تسلیم کر لیا جائے تب بھی اسے صرف اسی دائرے اور حالات میں رہ کر ہی تسلیم کیا جا سکتا ہے' جو مولانا تھانوی کے پیش نظر تھے۔

اور یہ حالات موجودہ حالات سے یکسر مختلف ہیں جس کے وجوہ درج ذیل ہیں۔

سابقہ ریاستوں میں سے کسی ریاست کے سربراہ بننے کی لیے کسی عورت کو گھر سے باہر نکل کر سیاسی جلسوں' انتخابی مہم اور دیگر بے شمار سرگرمیوں میں حصہ لینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ گھر بیٹھے ہی موروثی طور پر ان کو حکمرانی مل گئی جب کہ بے نظیر بھٹو کو سربراہ حکومت بننے سے پہلے اس سربراہی کے لیے جو پاپڑ بیلنے پڑے' جو کھکھیڑیں مول لینی پڑی ہیں اور جس جاں گسل انتخابی مہم سے انہیں گزرنا پڑا ہے' وہ محتاج وضاحت نہیں ہے۔ یہ ساری سرگرمیاں اسلامی اصول اور ضابطوں کے خلاف ہیں۔ اس میں مردوں سے بے باکانہ اختلاط بھی ہے' اپنی آواز اور شخصیت کا جادو جگانا بھی ہے' اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنا بھی ہے اور اپنے جسمانی حسن کی نمائش کرنا بھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسلام کی رو سے ایک مسلمان عورت کے لیے یہ تمام کام جائز ہیں؟ اگر یہ ناجائز ہیں اور یقیناً ناجائز ہیں' تو پھر اسے کسی سابقہ ریاست کی حکمران عورت پر کس طرح قیاس کیا جا سکتا ہے جسے مذکورہ ناجائز کاموں میں سے کوئی بھی کام کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔

علاوہ ازیں دونوں میں فرق اس سے بھی واضح ہے کہ سابقہ مسلمان ریاست کی حکمران والیہ کبھی کسی بیرونی دورے پر بھی نہیں گئی۔ غیر ملکی سفیروں سے ملنے کی ضرورت بھی اسے

لاحق نہیں ہوئی اور ہر کہ ومہ سے ملنے کا اہتمام بھی اس نے کبھی نہیں کیا۔ جب کہ اس وقت صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے۔

اب بننے والی وزیرۂ عظمیٰ کو بیرونی دوروں پر بھی جانا پڑے گا۔ غیر ملکی سفراء اور رجال سے ملاقاتیں ہوں گی اور ہر ایک سے ملنے کا اہتمام بھی کرنا پڑے گا۔ اس صورت میں اسلامی اصول و تعلیمات کی جو مٹی پلید ہو گی وہ کس سے مخفی ہے؟ پھر آخر دونوں کو یکساں کس طرح سمجھا جا سکتا ہے؟

بنیادی استدلال اور بیان علت میں خامی: ان سب سے بڑھ کر مولانا تھانوی کا بنیادی استدلال اس نقطے پر ہے کہ عدم فلاح (ناکامیابی) کی علت نقصان عقل ہے جس کا انجبار (ازالہ) جمہوری حکومت میں مشورۂ رجال سے ہو جاتا ہے اور یوں اس علت کے مرتفع ہو جانے کی وجہ سے عورت کی حکومت نقصان دہ نہیں رہتی۔

لیکن یہ نقطۂ نظر بھی سخت محل نظر ہے۔ نقصان عقل کو علت فرض کر کے مشورۂ رجال سے اس کا انجبار ہی صحیح نہیں ہے۔ حدیث رسول "لن یفلح قوم" میں کوئی علت بیان نہیں کی گئی ہے' اس لیے اپنے طور پر ایک علت فرض کر کے اس کی بنیاد پر صغریٰ کبریٰ ملا کر ایک نتیجہ اخذ کرنا کوئی صحیح طرز عمل نہیں ہے۔ اس دور کے متجددین کی روش بھی یہی ہے کہ وہ فرضی علتیں تلاش کر کے شریعت اسلامیہ کے منصوص احکام میں تبدیلیوں کی گنجائش نکالنے کی مذموم سعی کرتے ہیں۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مولانا تھانوی کی مذکورہ فقاہت کے ڈانڈے بھی متجددین سے جا ملتے ہیں۔

اس عدم فلاح کی اصل علت کیا ہے؟ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے تاہم اس کی کوئی نہ کوئی علت اگر تلاش کرنی ہی ہے' تو زیادہ قرین قیاس علت تو اس کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ اسلام نے مرد و عورت کی جداگانہ فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے الگ الگ ایک دوسرے سے مختلف ان کا دائرہ عمل تجویز کیا ہے' تاکہ دونوں اپنے اپنے مقصد تخلیق کو پورا کریں۔ عورت کی سربراہی اس فطری نظام سے بغاوت ہے اور جو قوم فطرت کے نظام سے بغاوت کر کے عورت کو سربراہ کار بنائے گی' یقیناً وہ فوز و فلاح سے ہمکنار نہیں ہو گی۔ کیونکہ

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

اگر محض نقصان عقل کو علت تسلیم کیا جائے تو پھر تو زیر بحث فرمان رسول ﷺ کی ساری اہمیت ہی ختم ہو جاتی ہے' کیونکہ دنیا میں کوئی بھی حکمران (چاہے بادشاہ ہی ہو) مشاورت کے بغیر نہ حکومت کرتا ہے اور نہ حکومت چلا ہی سکتا ہے۔ بادشاہی نظام میں بھی مشاورت کا اہتمام ہوتا ہے۔ پھر تو مولانا تھانوی کو ''جمہوری حکومت'' کی قید لگانے کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے' کیونکہ اپنے اپنے انداز میں مشاورت کا اہتمام تو ہر حکومت میں ہوتا ہے۔ قرآن کریم سے بھی یہ نکتہ واضح ہے کہ ملکۂ سبا نے بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف سے خط آنے کے بعد اعیان حکومت سے مشورہ طلب کیا تھا' لیکن اس مشورۂ رجال کے باوجود اسے حضرت سلیمان علیہ السلام کی تابعداری اختیار کرنی پڑی تھی اور یہ مشورۂ رجال اسے عدم فلاح (ناکامیاب ہونے) سے بچا نہیں سکا۔ ملکۂ سبا کے اس پہلو (مشورۂ رجال) کی وضاحت کے باوجود جب رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا:

''وہ قوم ہرگز فلاح یاب نہیں ہو گی جس نے ایک عورت کو اپنا سربراہ بنا لیا۔''

تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس کی علت یہ ہرگز نہیں ہے کہ عورت ناقص العقل ہے' بلکہ اس کی اصل علت نظام فطرت سے بغاوت ہے جو قوم بھی اس نظام فطرت سے بغاوت کرے گی وقتی طور پر چاہے کچھ کامیابی بھی حاصل کر لے' تاہم حقیقی فوز و فلاح سے وہ محروم ہی رہے گی۔

مولانا تھانوی کی تاویل بھی ہمارے لیے چنداں مفید نہیں: بالفرض اگر تھوڑی دیر کے لیے ہم تسلیم کر لیں کہ ((لَنْ يُفْلِحَ -- الحديث)) کی علت نقصان عقل ہے جس کا انجبار مشورۂ رجال سے ہو جاتا ہے۔ تب بھی سوچنے والی بات یہ ہے کہ کیا ہمارے ہاں کی صورت حال بھی ایسی ہی ہے؟ ہمارے ملک کے حکمران کیا جمہوری مزاج رکھتے ہیں یا نقصان عقل کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہاں تو عقل کل ہونے کا دعویٰ اور غرہ ہے۔ یہاں تو مرد بھیگی بلی بنے ہوئے ہیں' مشورہ دینا تو کجا کسی کو اس بت طناز کے سامنے مجال دم زدنی نہیں ہے۔ وہ خود

کسی سے مشاورت کی ضرورت سمجھے تو اور بات ہے ورنہ کسی بھی مرد کو مشورہ دینے کی جرأت و ہمت نہیں۔ بنابریں حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جمہوریت کا صرف نام ہے' ورنہ یہاں ہر جمہوری حکمران بدترین آمر ہی ثابت ہوا ہے اور بے نظیر کے تیور اور کس بل بھی اسی بات کے غماز ہیں کہ وہ بھی جمہوریت کے معاملے میں اپنے پیش رووں سے مختلف ثابت نہیں ہوں گی۔

بلاشبہ برطانیہ وغیرہ میں صحیح معنوں میں جمہوریت قائم ہے اور وہاں جمہوری اقدار و روایات کی پاسداری کا پورا اہتمام ہے' وہاں تمام ادارے اپنی اپنی جگہ مستحکم اور فعال ہیں۔ عدلیہ' انتظامیہ' مقننہ اور صحافت اپنے اپنے دائرے میں آزاد اور مؤثر ہیں۔ ایسے ملک میں وزیراعظم یقیناً آمرانہ اختیارات نہیں رکھتا اور اس کی حیثیت ایک مشیر سے زیادہ نہیں۔ اصل اختیارات کی مالک وہاں کی کابینہ ہے۔ وزیراعظم اس کے مشورے اور رائے کے بغیر کوئی اہم اقدام کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ ایسے ملک میں اگر وزیراعظم عورت ہو تو شاید وہاں وقتی طور پر اس کے وہ نقصانات ظاہر نہ ہوں جن کی طرف حدیث زیر بحث میں اشارہ کیا گیا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ مسز تھیچر عورت ہونے کے باوجود وہاں بظاہر قدرے کامیاب رہی' کیونکہ مطلق العنان اختیارات سے وہ محروم رہی جس سے بقول مولانا تھانوی عدم فلاح کی علت مرتفع ہو گئی' لیکن ہمارے ہاں صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں جمہوری اقدار و روایات کی پاسداری ہے نہ جمہوری ادارے مستحکم و فعال ہیں اور نہ برسراقتدار آنے والے حکمران اور پارٹیاں جمہوری مزاج کی حامل ہیں۔ اس قسم کے ملک میں عورت کی حکمرانی بالخصوص اپنے اندر خطرات کے وہ تمام پہلو رکھتی ہے جن سے حدیث رسول ﷺ میں انتباہ کیا گیا ہے۔ اس لیے ہمیں اس حدیث رسول کی صداقت پر پورا یقین ہے اور ہم پورے اذعان سے یہ کہتے ہیں کہ اسلام کے اصول کو پامال کرتے ہوئے جب بھی اور جہاں بھی ایک عورت کی حکمرانی کو قبول کیا جائے گا' یہ فعل ملک و ملت کے لیے ہرگز نیک فال نہیں ہو گا۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے ملکۂ سبا کے مشاورتی کردار سے بھی استدلال کیا ہے لیکن

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر آئے ہیں کہ ملکۂ سبا مشرکہ اور کافرہ تھی' اس کا کوئی بھی عمل و کردار ہمارے لیے حجت نہیں۔ اس لیے مولانا تھانوی کے اس نکتے کو ہم نے نظرانداز کر دیا ہے کیونکہ اس پر بحث ہو چکی ہے تاہم استدلال کی یہ سطحیت مولانا تھانوی کے کلام میں دیکھ کر سخت تعجب ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی یہ لغزش معاف فرمائے۔

مولانا تھانوی کا تضاد یا رجوع؟: یہاں تک لکھا جا چکا تھا کہ اچانک مولانا تھانوی کی تفسیر "بیان القرآن" دیکھنے کا خیال آیا' تو یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ مولانا تھانوی نے اپنی تفسیر میں ملکہ سبا کے قرآن کریم میں ذکر کرنے سے عورت کی حکمرانی کے جواز پر جو استدلال کیا جاتا ہے' اسے غلط قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"ہماری شریعت میں عورت کو بادشاہ بنانے کی ممانعت ہے' پس بلقیس کے قصے سے کوئی شبہ نہ کرے۔ اوّل تو یہ فعل مشرکین کا تھا۔ دوسرے اگر شریعت سلیمانیہ نے اس کی تقریر بھی کی' تو شرع محمدی ﷺ میں اس کے خلاف ہوتے ہوئے وہ حجت نہیں۔"

(تفسیر بیان القرآن' پارہ:۱۹' ۸/۴۷' طبع مجتبائی' دہلی ۱۳۴۶ھ)

مولانا تھانوی کا مذکورہ فتویٰ ۱۳۳۰ھ کا ہے جب کہ تفسیر اس کے ۴ سال بعد ۱۳۳۴ھ میں طبع ہوئی ہے۔ جیسا کہ اس کے طبع اوّل میں یہ تاریخ طبع (مطبع مجتبائی دہلی میں) موجود ہے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مولانا تھانوی نے جو فتویٰ ۱۳۳۰ھ میں دیا تھا' اس کے بعد تفسیر میں اس کے برعکس اپنی رائے کا اظہار کر کے اس سے رجوع فرما لیا تھا' کیونکہ اگر اسے رجوع نہیں کہا جائے گا تو یہ تضاد ہو گا۔ تضاد کی بہ نسبت رجوع کہنا مولانا تھانوی رحمہ اللہ کی شان کے انسب ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

⑨ حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے واقعے سے استدلال اور اس کی حقیقت

ایک اور واقعے سے استدلال کیا جاتا ہے جو حدیث کی بعض کتابوں میں درج ہے اور وہ واقعہ ہے حضرت ام ورقہ بنت نوفل رضی اللہ عنہا کا۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب لکھتے ہیں:

"حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے متعلق لکھا ہے کہ جنگ بدر (۲ھ) میں رسول اللہ ﷺ

مدینے سے روانہ ہوئے تو انہوں نے اپنی خدمات پیش کیں کہ یا رسول اللہ! مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیں۔ میں اسلام کے دشمنوں سے جنگ کرنا چاہتی ہوں۔ ان کے متعلق ایک اور روایت ہے جو اس سے بھی زیادہ عملی یا علمی دشواریاں پیدا کرے گی۔ وہ یہ کہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسجد کا امام مامور فرمایا تھا جیسا کہ سنن ابی داود اور مسند احمد بن حنبل میں ہے اور یہ بھی کہ ان کے پیچھے مرد بھی نماز پڑھتے تھے اور یہ کہ ان کا مؤذن ایک مرد تھا۔ ظاہر ہے کہ مؤذن بھی بطور مقتدی ان کے پیچھے نماز پڑھتا ہوگا۔"

(خطبات بہاول پور' ص:۲۶' مطبوعہ اسلام آباد)

ڈاکٹر صاحب کی اس سلسلے میں مزید گفتگو اور بعض لوگوں کا اس سے استدلال نقل کرنے سے پہلے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ نفس حدیث پر گفتگو کر لی جائے۔ یہ روایت مسند احمد اور سنن ابی داؤد وغیرہ میں موجود ہے۔ البتہ اس میں خط کشیدہ الفاظ نہیں ہیں۔ بلکہ پہلے خط کشیدہ الفاظ کی جگہ أُمَرِّضُ مَرْضَاكُمْ کے الفاظ ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ میں بیماروں کی تیمارداری' یا زخمیوں کی مرہم پٹی کروں گی۔ اسی طرح روایت میں یہ الفاظ بھی نہیں ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک مسجد کا امام مامور فرمایا تھا اور یہ کہ ان کے پیچھے مرد بھی نماز پڑھتے تھے۔" حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

«فَاسْتَأْذَنَتِ النَّبِيَّ ﷺ أَنْ تَتَّخِذَ فِي دَارِهَا مُؤَذِّنًا، فَأَذِنَ لَهَا»(سنن أبي داود، الصلوة، باب إمامة النساء، ح:٥٩١)

"انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے گھر میں مؤذن رکھنے کی اجازت طلب کی' تو آپ نے انہیں اس کی اجازت دے دی۔"

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کو ان کی خواہش کے مطابق جنگ پر لے جانے کے لیے آمادہ نہیں ہوئے بلکہ ان سے یہ فرمایا قَرِّيْ فِي بَيْتِكِ "تم اپنے گھر ہی میں رہو" تب انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے گھر میں ایک مؤذن رکھنے کی اجازت طلب فرمائی اور آپ نے انہیں ایسا کرنے کی اجازت عنایت فرمادی۔ دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

«وَجَعَلَ لَهَا مُؤَذِّنًا يُؤَذِّنُ لَهَا، وَأَمَرَهَا اَنْ تَؤُمَّ أَهْلَ دَارِهَا»(سنن أبي

داود، الصلوة، باب إمامة النساء، ح: ٥٩٢)

"نبی ﷺ نے ان کے لئے ایک مؤذن مقرر فرمادیا جو ان کیلئے اذان دیا کرتا تھا اور نبی اکرم ﷺ نے حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کو حکم دیا کہ اپنے گھر والوں کی امامت کرایا کرے۔"

اسی روایت میں مؤذن کے بارے میں بھی صراحت موجود ہے کہ وہ ایک "شیخ کبیر" بہت بوڑھا آدمی تھا۔ یہ روایت سنن ابی داود کے علاوہ صحیح ابن خزیمہ: ۸۹/۳' سنن دار قطنی: ۱/۴۰۳' مستدرک حاکم: ۱/ ۲۰۳ اور مسند احمد: ۶/ ۴۰۵ میں موجود ہے۔

لیکن ایک تو یہ روایت سند کے لحاظ سے ضعیف ہے اس میں دو راوی مجہول ہیں۔ دوسرے' سند میں اضطراب بھی ہے۔ تیسرے اس میں کہیں بھی وہ خط کشیدہ الفاظ نہیں ہیں جو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی عبارت میں ہیں۔ چوتھے' محدثین نے اسے جس باب کے تحت ذکر کیا ہے' اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی اس سے یہی بات اخذ کی ہے کہ اس میں صرف ایک عورت کے عورتوں کی امامت کرانے کا بیان ہے۔ یہ نہیں ہے کہ عورت نے مردوں کی امامت یا کسی مسجد کی امامت کرائی ہے' چنانچہ سنن ابی داود' میں یہ روایت باب إمامة النساء میں' سنن دارقطنی میں باب صلاة النساء جماعة میں' صحیح ابن خزیمہ میں باب إمامة المرأة النساء في الفريضة میں اور مستدرک حاکم میں امامة المرأة النساء في الفرائض میں بیان ہوئی ہے جس سے صرف یہی بات ثابت ہو سکتی ہے کہ ایک عورت' عورتوں کی فرائض میں امامت کر سکتی ہے۔ جیسا کہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا امامت کراتی رہی ہیں۔ اس حدیث میں کہیں بھی ایسے الفاظ نہیں ہیں جن کا یہ مفہوم نکل سکتا ہو کہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کسی مسجد میں امامت کرایا کرتی تھیں یا ان کے پیچھے عام مرد بھی نماز پڑھا کرتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی کچھ کہہ سکتا ہے تو یہ کہ مؤذن اور ایک مدبر غلام ان کے پیچھے نماز پڑھتے ہوں گے۔ اگرچہ ان کی نماز پڑھنے کی صراحت بھی حدیث میں موجود نہیں ہے تاہم قرائن کی رو سے زیادہ سے زیادہ ان دو مردوں کی بابت کہا جا سکتا ہے کہ گھر کے افراد اس قسم کی مخصوص صورت میں عورت کے

پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ محلے کے عام مردوں کا عورت کے پیچھے نماز پڑھنے کا جواز اس سے پھر بھی نہیں نکل سکتا۔

بلاشبہ عربی زبان میں "دار" کا لفظ "بیت" سے زیادہ وسعت رکھتا ہے اور "دار" کو حویلی یا محلے کے مفہوم میں لیا جا سکتا ہے' مؤذن مقرر کرنے سے بھی اس مفہوم کی تائید نکلتی ہے۔ تاہم اس کے باوجود یہ ماننا سخت مشکل ہے کہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے پیچھے حویلی یا محلے کے عام مرد بھی نماز پڑھتے ہوں گے' بلکہ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ حویلی یا محلے کی دوسری خواتین بھی حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے پیچھے آکر نماز پڑھتی ہوں گی۔

اس حدیث سے پھر بھی یہ قطعاً ثابت نہیں ہوتا کہ مردوں کی طرح عورتیں بھی عام مساجد میں امام بن سکتی ہیں اور پھر اس ردے پر ایک اور ردہ یہ چڑھا دیا جائے جب عورت مسجد میں مردوں کی امام بن سکتی ہے' تو پھر ملک کی سربراہ بھی بن سکتی ہے۔ ایسا دعویٰ "بنائے فاسد علی الفاسد" ہی کہلائے گا۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی توجیہ اور ایک عملی مثال: ڈاکٹر حمید اللہ صاحب جنہوں نے "دار" کے لفظ کی وسعت کے پیش نظر حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کو ایک مسجد کا امام قرار دیا ہے' وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک استثنائی صورت ہو سکتی ہے' ورنہ عام حالات میں ایک عورت مردوں کی امام نہیں بن سکتی۔ چونکہ بعض لوگ ڈاکٹر صاحب کی عبارت کو سیاق و سباق سے کاٹ کر اپنے مطلب کے لیے استعمال کرتے ہیں' اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی توجیہ اور ان کا وہ موقف جو حدیث ام ورقہ رضی اللہ عنہا کی روشنی میں انہوں نے اختیار کیا ہے' اسے انہی کے الفاظ میں پیش کر دیا جائے' چنانچہ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

"یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عورت کو امام بنایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس حدیث کے متعلق یہ گمان ہو سکتا ہے کہ یہ شاید ابتدائے اسلام کی بات ہو اور بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منسوخ کر دیا ہو' لیکن اس کے برعکس یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک زندہ رہیں اور اپنے فرائض سرانجام دیتی رہیں اس لیے بعض اوقات عام قاعدے میں استثناء کی ضرورت پیش آتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استثنائی

ضرورتوں کے لیے یہ استثنائی تقرر فرمایا ہو گا۔ چنانچہ میں اپنے ذاتی تجربے کی ایک چیز بیان کرتا ہوں۔ پیرس میں چند سال پہلے کا واقعہ ہے۔ ایک افغان لڑکی طالب علم کے طور پر آئی۔ ہالینڈ کا طالب علم جو اس کا ہم جماعت تھا۔ اس پر عاشق ہو گیا۔ عشق اتنا شدید تھا کہ اس نے اپنا دین بدل کر اسلام قبول کر لیا۔ ان دونوں کا نکاح ہوا۔ اگلے دن وہ لڑکی میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ بھائی صاحب میرا شوہر مسلمان ہو گیا ہے اور وہ اسلام پر عمل بھی کرنا چاہتا ہے لیکن اسے نماز نہیں آتی اور اسے اصرار ہے کہ میں خود امام بن کر نماز پڑھاؤں۔ کیا وہ میری اقتداء میں نماز پڑھ سکتا ہے؟ میں نے اسے جواب دیا کہ اگر کسی عام مولوی صاحب سے پوچھیں گی تو وہ کہے گا کہ یہ جائز نہیں۔ لیکن میرے ذہن میں رسول اللہ کے طرز عمل کا ایک واقعہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کا ہے' اس لیے استثنائی طور پر تم امام بن کر نماز پڑھاؤ۔ تمہارے شوہر کو چاہیے کہ مقتدی بن کر تمہارے پیچھے نماز پڑھے اور جلد از جلد قرآن کی ان سورتوں کو یاد کرے جو نماز میں کام آتی ہیں۔ کم از کم تین سورتیں یاد کرے اور تشہد وغیرہ یاد کرے' پھر اس کے بعد وہ تمہارا امام بنے اور تم اس کے پیچھے نماز پڑھا کرو۔ دوسرے الفاظ میں ایسی صورتیں جو کبھی کبھار امت کو پیش آ سکتی تھیں' ان کی پیش بندی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتخاب فرمایا تھا۔ شاید اس واقعے کی یہ وجہ ہو۔

(خطبات بہاول پور' ص:۲۶-۲۷)

یہ اس واقعے کی نہایت معقول توجیہ ہے جو خود ڈاکٹر صاحب موصوف نے بیان فرما دی ہے۔ جزاہ اللّٰہ احسن الجزاء۔

⑩ علامہ اقبال کی ایک تقریر سے استدلال

بعض لوگوں کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹ میں علامہ اقبال کی ایک تقریر کے اقتباسات بھی ان کے فرزند جاوید اقبال کی تصنیف "زندہ رود" سے نقل کیے گئے ہیں' لیکن نقل میں صریح بددیانتی کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ بعض ایسے فقرے تو لے لیے گئے ہیں جن سے مرد و زن کی اس مساوات کی تائید ہو جو یورپ کے مغربی نظام میں ہے' لیکن وہ

تمام فقرے حذف کر دیے گئے ہیں' جن سے مغربی نظریۂ مساوات مرد و زن کی نفی ہوتی ہے' حالانکہ علامہ اقبال کی اس تقریر میں مرد و زن کے درمیان شہری حقوق میں مساوات کی بات کہی گئی ہے۔ جو فی الواقع اسلام کے مطابق ہے۔ لیکن جہاں تک فرائض کا تعلق ہے' وہ دونوں کے الگ الگ ہیں' جسے علامہ اقبال نے بھی تسلیم کیا ہے' چنانچہ فرماتے ہیں۔

"عورت کے بحیثیت عورت اور مرد کے بحیثیت مرد' بعض خاص علیحدہ علیحدہ فرائض ہیں' ان فرائض میں اختلاف ہے' مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ عورت ادنی ہے اور مرد اعلیٰ۔ فرائض کا اختلاف اور وجوہ پر مبنی ہے۔ مطلب یہ کہ جہاں تک مساوات کا تعلق ہے' اسلام کے اندر مرد و زن میں کوئی فرق نہیں۔ تمدنی ضروریات کی وجہ سے فرائض میں اختلاف ہے۔" (زندہ رود ۳/۳۵۸)

یہی وہ بات ہے جو علماء بھی کہتے ہیں' علماء بھی یہ نہیں کہتے کہ عورت ادنی یا حقیر ہے' بلکہ اصل بات فطری صلاحیتوں اور اس کے مطابق الگ الگ فرائض کی ہے۔ ان فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے مرد کو ایک گونہ برتری حاصل ہے جس کا ذکر قرآن میں بھی کیا گیا ہے ﴿ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ﴾ (البقرة : ۲/۲۲۸) "مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ برتری حاصل ہے" اس انتظامی برتری کی بنیاد پر حقوق میں مساوات کا انکار کرنا صحیح نہیں ہے اور یہ اختلاف فرائض علامہ اقبال بھی تسلیم فرماتے ہیں۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ علامہ اقبال بھی عورت کی مساوات کے تو قائل ہیں' لیکن اسی دائرے میں جو اسلام کی رُو سے اسے حاصل ہے مغربی نظریۂ مساوات مرد و زن کے وہ بھی حامی نہیں ہیں جس کی رو سے مرد و عورت کے درمیان کوئی فطری فرق نہیں ہے۔ اس لیے مغرب کے نزدیک دونوں کے حقوق جس طرح یکساں ہیں' فرائض بھی دونوں کے یکساں ہیں۔

پمفلٹ مذکور میں علامہ اقبال کی بابت یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ وہ عورتوں کے لیے پردے کے قائل نہیں تھے' لیکن علامہ اقبال اپنی اس تقریر میں آگے چل کر فرماتے ہیں:

"دیکھنا یہ ہے کہ جن باتوں کو لفظی قیود سے تعبیر کیا جاتا ہے' وہ اپنی اصل میں قیود ہیں یا نہیں؟ پردے کے متعلق اسلام کے احکام واضح ہیں "غض بصر" کا حکم ہے اور وہ اس لیے

کہ زندگی میں ایسے بھی وقت آتے ہیں جب عورت کو غیر محرم کے سامنے ہونا پڑتا ہے---
پردے کے سلسلے میں اسلام کا عام حکم عورت کو یہ ہے ہ وہ اپنی زینت کو ظاہر نہ کرے۔"
(زندہ رود: ۳۵۹/۳)

فرمایئے! اس اقتباس میں مسلمان عورت کے لیے پردے کی تاکید ہے یا اسے نعوذ باللہ عورتوں کے لیے "قید" سے تعبیر کیا گیا ہے؟ جس طرح کہ پمفلٹ مذکور میں باور کرایا گیا ہے۔

اقبال کے نزدیک سوشلزم اور مغربی جمہوریت دونوں مردود ہیں: پھر علامہ اقبال کے کلام سے استشہاد کرنے والوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ علامہ کے نزدیک بالشویک' کمیونسٹ یا سوشلسٹ عقیدہ رکھنا دائرہ اسلام سے خارج ہونے کے مترادف تھا۔ (زندہ رود: ۶۵۹/۳)

اسی طرح اقبال "مغرب کے سیکولر جمہوری نظام" کے بھی حامی نہیں تھے' بلکہ ان کے نزدیک: "کسی بھی پس ماندہ ملک میں' جس کے عوام زیادہ تر ان پڑھ' غیر منظم اور فاقہ کش ہوں' وہاں جمہوریت کا تعارف' سیاسی ابتری' معاشی تباہی' قومی انتشار اور ملک کے ٹوٹنے کا سبب بن سکتا ہے۔" (زندہ رود: ۶۶۱/۳)

کلام اقبال کو سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کرنے والے اقبال کے مذکورہ واضح اور دو ٹوک موقف کو ماننے کے لیے اور اس کی روشنی میں اپنے منشور اور نظریات کا جائزہ لینے کے لیے تیار ہیں؟ حتی کہ مسلمان عورت کے بارے میں علامہ اقبال نے اپنے شعری کلام میں جو وضاحت کی ہے (جو کتاب کے آخر میں شامل ہے) اسے بھی قبول کرنا ان کے لیے ممکن ہے؟

(۱۱) مقصد تخلیق اور دائرۂ کار کی وضاحت' توہین نہیں

۱۱ دسمبر ۱۹۸۸ء کے "جنگ" میں احمد ندیم قاسمی صاحب نے فرمایا کہ عورت کی سربراہی کو موضوع بحث بنا کر لوگ اپنی ہی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کی مذمت کر رہے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی اونچے درجے کے شاعر' ادیب اور اہل قلم ہیں' لیکن مذکورہ ارشاد میں انہوں نے سطحیت کا مظاہرہ بھی کیا ہے اور مسلمان عورتوں کو گمراہ کرنے کی مذموم سعی

بھی۔ حالانکہ اس بحث سے مقصود عورت کی مذمت اور اہانت قطعاً نہیں ہے۔ بات صرف فطری صلاحیتوں اور اسلام کے اصول و ضوابط کی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ مرد عورت کے مقابلے میں زیادہ بہادر ہے' تو اس میں عورت کی تذلیل و اہانت کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت کا اظہار ہے جو مرد و عورت کے درمیان فطری فرق و صلاحیت پر مبنی ہے۔ اسی طرح جب یہ کہا جاتا ہے کہ مرد و عورت کا دائرہ کار بھی الگ الگ اور ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ عورت کا دائرہ عمل گھر کی چار دیواری ہے جب کہ بیرونی سرگرمیاں مرد کے دائرۂ عمل میں داخل ہیں' تو یہ بھی ایک حقیقت ہی کا اظہار ہے جو دونوں کے درمیان صلاحیتوں اور دونوں کے جداگانہ مقصد تخلیق پر مبنی ہے۔

آج بھی یورپ میں فوج کے تمام جرنیل مرد ہیں۔ کیوں؟ جب کہ وہاں ہر شعبے میں مرد و زن کے درمیان کامل مساوات تسلیم کی جاتی ہے تمام پائلٹ مرد ہیں۔ بیشتر کلیدی مناصب پر مرد ہی فائز ہیں۔ کیا ان کا یہ رویہ عورت کی تذلیل و اہانت پر مبنی ہے؟ نہیں یقیناً نہیں' بلکہ کامل مساوات کا دعویٰ کرنے کے باوجود وہ مردوں کی برتری کو قائم کیے ہوئے ہیں' کیونکہ یہ فطرت کا نظام اور اس کا عین تقاضا ہے۔ جسے خواہش کے باوجود بدلا نہیں جا سکتا۔ اس لیے اسلام جب یہ کہتا ہے کہ عورت بیرونی سرگرمیوں سے مجتنب رہے۔ تو یہ بات فطرت کے عین مطابق اور اس کا تقاضا ہے۔ علاوہ ازیں اسلامی تعلیمات کا بھی عین اقتضاء ہے۔ کیونکہ اس نے مرد و عورت کے اختلاط کو سخت ناپسند کیا ہے اور اس کے لیے اس نے بہت سی پابندیاں عائد کی ہیں۔ اس لیے اسے عورت کی توہین قرار دینا سخت بددیانتی ہے یا اسلام پر حرف گیری۔ اور ہم دونوں باتوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

(۱۲) ایک پروفیسر کے جواب میں

۱۳ دسمبر ۱۹۸۸ء کے ہفت روزہ "ندا" لاہور میں پروفیسر محمد اسلم صاحب استاذ شعبۂ تاریخ جامعہ پنجاب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے یہ "فتویٰ" صادر فرمایا ہے کہ عورت کے حکمران بننے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے اور "دلیل" یہ ارشاد فرمائی

ہے کہ تاریخ میں فلاں فلاں عورتیں حکمران رہی ہیں اور نہایت کامیابی سے انہوں نے حکومت کی ہے۔ اس لیے یہ ماننے بغیر چارہ نہیں ہے کہ نبی ﷺ کا فرمان صرف فارس کی بوران دخت نامی عورت کے لیے تھا۔ آپ کا یہ فرمان بطور اصول اور کلیے کے نہیں تھا۔ ورنہ آپ کی صداقت مشکوک ٹھہرے گی۔ (یہ ان کے سارے مضمون کا خلاصہ ہے)

پروفیسر صاحب نے مضمون کے آغاز میں پہلے تو اس بات پر اظہار افسوس فرمایا ہے کہ آج قرنِ اوّل کے برعکس جس کا جی چاہتا ہے' ہرکس و ناکس فتویٰ صادر کرنا شروع کر دیتا ہے۔ حالانکہ ہمارے ہاں وفاقی شرعی عدالت' اسلامی نظریاتی کونسل اور ادارۂ تحقیقات اسلامی موجود ہیں اور ان اداروں کی موجودگی میں کسی فرد واحد یا خود ساختہ مفتی کو فتویٰ جاری کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ اس ضمن میں انہوں نے یہ دعویٰ بھی فرمایا کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں چند عالم صحابہ کے علاوہ کسی کو فتویٰ دینے یا حدیث بیان کرنے کی ممانعت تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد کی بابت جو دعویٰ کیا گیا ہے' وہ تو خلاف واقعہ ہے (جس کی تفصیل کی اس وقت گنجائش نہیں) تاہم یہ بات نہایت تعجب انگیز ہے کہ جن علماء کی ساری عمر قرآن و حدیث کی تعلیم و تدریس اور افتاء و ارشاد میں گزری ہے وہ تو "کس و ناکس" اور "خود ساختہ" مفتی قرار پائے ہیں' جنہیں فتویٰ دینے کا کوئی حق نہیں ہے اور خود موصوف جو تاریخ کے پروفیسر ہیں اور شاید عربی زبان سے بھی نابلد ہیں۔ وہ مذکورہ اداروں کی موجودگی میں بھی "فتویٰ" صادر کرنے کے مجاز ٹھہرے ہیں اور ان کے مضمون کا عنوان ہی ایک مکمل فتویٰ ہے کہ:

"عورت کے حکمران بننے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے"

گویا ؎

تمہاری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو مرے نامۂ سیاہ میں ہے

اس تضاد یا دو عملی پر ہم سوائے اس کے کیا عرض کریں

آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی

دوسری بات یہ ہے کہ پروفیسر صاحب موصوف کے "الواح الصنادید" اور سفرنامے قسم کے مضامین پڑھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں بزرگوں کے ساتھ بڑی عقیدت ہے' لیکن اس مضمون سے معلوم ہوا کہ ان کی ساری عقیدت فوت شدہ بزرگوں سے ہے' زندہ بزرگوں سے نہیں۔ کراچی کے جن ۱۵ اکابر علماء نے عورت کی سربراہی کے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ اختلاف مسلک کے باوجود علم و فضل' اپنی دینی خدمات اور زہد و تقویٰ کے لحاظ سے نہایت برگزیدہ اور سربر آوردہ بزرگ ہیں۔ لیکن پروفیسر صاحب نے ان کے ہم مسلک ہونے کے باوجود ان مفتیان کرام کا ذکر انتہائی تمسخر و استہزاء کے انداز میں کیا ہے۔ بقول غالب ؎

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

تیسری بات یہ ہے کہ پروفیسر صاحب نے فارس کی حکمران عورت بوران دخت کا سالِ حکمرانی ۶۴۹ء بتلایا ہے جب کہ نبی ﷺ کا سال وفات ۶۳۲ء ہے۔ پروفیسر صاحب نے غور نہیں فرمایا کہ کیا یہ عورت نبی ﷺ کی وفات کے ۱۶ سال بعد حکمران بنی تھی؟ پھر نبی ﷺ نے اس کے عدم فلاح کی خبر کس طرح دی؟ کیا یہی وہ تاریخ دانی ہے جس کی بنیاد پر ایک صحیح اور مسلمہ حدیث کی تکذیب کی سعی کی جا رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی یہ ایک غلطی ہی ان کی ساری تاریخ دانی کا بھرم کھول دیتی ہے اور ان کی تاریخی مثالوں کو مشکوک بنا دیتی ہے۔

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

⑬ بعض مسلمان عورتوں کی حکمرانی کی حقیقت

بہرحال اب پروفیسر صاحب کی اس "درایت" پر ہم غور کرتے ہیں جس کی بنا پر انہوں نے مفتیانِ کرام کی رائے کو "سہو" پر مبنی قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"ان مفتیوں کو حدیث مبارکہ کا مفہوم سمجھنے میں سہو ہوا ہے۔ اس حدیث کا جائزہ لینے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس کا اطلاق صرف ایران کی ملکہ بوران دخت پر ہوتا ہے اور اسے بوجوہ قاعدہ کلیہ نہیں بنایا جاسکتا' کیونکہ درایت مفتیوں کے فتویٰ کی تائید اور تصویب نہیں کرتی۔"

اس کے بعد انہوں نے "درایت" کی تفصیل روس کی ملکہ کیتھرائن' برطانیہ کی ملکہ وکٹوریا اور دیگر بعض حکمران عورتوں کی مثالیں دے کر بیان کی ہے کہ یہ سب عورتیں نہایت کامیاب حکمران رہی ہیں' اس لیے ان پر عدم فلاح کا اطلاق نہیں ہو سکتا' بنابریں حدیث زیر بحث کو اگر کلیہ کے طور پر منوانے کی کوشش کی جائے گی تو اس سے رسول اللہ ﷺ کی صداقت غیر معتبر ٹھہرے گی' کیونکہ تاریخ سے اس کے برخلاف عورتوں کی کامیاب حکمرانی کی مثالیں ثابت ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جو مثالیں دی گئی ہیں۔ وہ زیادہ تر دور ملوکیت کی دی گئی ہیں' جس کو ہمارے جمہوریت مآب حضرات تسلیم ہی نہیں کرتے۔ بالخصوص اسلامی تاریخ کی جو مثالیں (رضیہ سلطانہ' چاند بی بی اور شاہ جہاں بیگم رئیسہ ریاست بھوپال) دی گئی ہیں' وہ سب ملوکیت کے نتیجے میں برسراقتدار آئی تھیں' جو ایک تو اضطرار کا نتیجہ تھا کہ خاندان میں اس وقت کوئی اہل مرد نہیں تھا مسلمان شاہی خاندان میں اہل مردوں کی موجودگی میں کہیں بھی کسی عورت کو سربراہ نہیں بنایا گیا ہے۔ جیسا کہ خود پروفیسر صاحب موصوف نے بھی تسلیم کیا ہے کہ:

"رضیہ سلطانہ کے بیس بھائیوں کی موجودگی میں اس کا درویش صفت باپ سلطان شمس الدین التمش یہ کہا کرتا تھا کہ اس کے بیٹے نکمّے اور نااہل ہیں اور اس کی بیٹی نظم مملکت چلانے کی پوری طرح اہل ہے۔ ("ندا" ۱۳ دسمبر ۱۹۸۸ء)

کیا سلطان التمش کے اس تبصرے سے' جسے خود پروفیسر صاحب نے نقل فرمایا ہے' ثابت نہیں ہوتا کہ رضیہ سلطانہ کا اقتدار بطور اضطرار اور بہ امر مجبوری تھا۔ بیجاپور اور احمد نگر دکن کی حکمران عورت چاند بی بی کا اقتدار بھی اسی قسم کی اضطراری صورت حال کا نتیجہ تھا۔ چاند بی بی بیجاپور کے حکمران علی عادل شاہ کی ملکہ تھی۔ عادل شاہ ایک سازش کے تحت

ہلاک کر دیے گئے' ان کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ وارثوں میں صرف ایک بھتیجا تھا' جس کی عمر ۹ سال تھی' اسی کو وارث تخت بنا دیا گیا اور چاند بی بی اس کی نگران مقرر ہوئی۔ چاند بی بی ایک مرتبہ اپنے باپ سین شاہ کی ریاست احمد نگر آئی تو وہاں اس کا اکلوتا بھائی ذہنی امراض کا شکار ہو گیا۔ مجبوراً یہ ریاست بھی چاند بی بی کو سونپ دی گئی اور وہ بیجاپور اور احمد نگر کی مشترکہ حکمران بن گئی۔

والیۂ بھوپال کا معاملہ بھی اضطراری ہے جس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ بھوپال کے چھٹے حکمران نواب وزیر محمد خان کے بیٹے نظر محمد خان نے ۱۸۱۶ء میں جانشین بنتے ہی انگریزوں سے ایک معاہدہ کیا۔ جس کی رو سے انگریزوں نے یہ ذمہ داری قبول کی کہ ریاست بھوپال کا علاقہ اس کے اور اس کی اولاد کے لیے محفوظ رہے گا اور اس دوسرے خاندان میں یہ سلسلہ منتقل نہیں ہو گا جو ریاست کی حکمرانی کا امیدوار تھا اور جس کے بعض افراد اس سے قبل ریاست کے حکمران بھی رہ چکے تھے' نیز ایک موقعے پر ان دونوں خاندانوں میں باہمی جنگ اور خون ریزی بھی ہو چکی تھی۔

--- اس کے صلے میں نواب نظر محمد خان نے بطور والی ریاست بھوپال بعض انگریزی مفادات کے تحفظ کا وعدہ کیا۔

اس معاہدے کی رُو سے اب ریاست کی حکمرانی صرف اسی ایک خاندان میں محصور ہو گئی جس نے انگریزوں سے معاہدہ کیا تھا اور اس مجبوری کی وجہ سے پھر اولاد نرینہ نہ ہونے کی صورت میں سکندری بیگم' شاہ جہاں بیگم اور سلطان جہاں بیگم بالترتیب حکمران بنیں' پھر جب سلطان جہاں بیگم کے ہاں اولاد نرینہ ہوئی تو ان کے لڑکے نواب حمید اللہ خاں کو ریاست کا ولی عہد قرار دیا گیا۔

اس مقام پر یہ بات بھی خاص طور پر نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ نواب سکندری بیگم کے بعد جب ان کی غیر شادی شدہ صاحبزادی شاہ جہاں بیگم کو مسند نشین ریاست تسلیم کیا گیا تو بایں الفاظ ان کو اطلاع دی گئی کہ

"موافق رسم بھوپال کے نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ کی مسند نشینی اسی طرح منظور ہوئی

جس طرح کہ آپ باتفاق رؤسا و امراء بھوپال و رضامندی سرکار انگلشیہ مسند نشین ریاست کی گئی تھیں۔ جس وقت شاہ جہاں بیگم کتخدا (شادی شدہ) ہوں گی' ان کا شوہر رئیس ہو گا۔" (حیاتِ شاہ جہانی' ص:۴)

پھر جب موصوفہ شادی کی عمر کو پہنچی اور خاندان میں موزوں اور مناسب رشتے کی تلاش شروع کی گئی تو حکمران خاندان کا کوئی رشتہ پسند نہ آیا اور مجبوراً دوسرے خاندانوں میں رشتے کی تلاش شروع ہو گئی اور کچھ رشتے پسند کیے گئے' ابھی کسی ایک کے بارے میں حتمی فیصلہ بھی نہیں کیا گیا تھا کہ اس سے قبل ہی انگریز گورنمنٹ کو ریاست کی طرف سے حسب ذیل درخواست پیش کی گئی کہ:

"خاندان میں نواب شاہ جہاں بیگم کی شادی کے لائق کوئی نظر نہیں آتا اور جب غیر خاندان میں شادی ہو گی تو نہ معلوم انجام کیا ہو؟ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ریاست نواب شاہ جہاں بیگم کے نام رہے' ان کا شوہر امور ریاست میں بے اختیار ہو' صرف مرتبہ و نام و عزت میں نواب رہے مگر ان سے جو اولاد ہو وہ مستقل نواب اور مالک قرار پائے۔" (حیات شاہ جہانی' ص:۶' مطبوعہ آگرہ۔ ۱۹۱۴ء' مؤلفہ سلطان جہاں بیگم)

چنانچہ انگریز گورنمنٹ نے اس سے اتفاق کر کے اس کے مطابق عملدرآمد کی یقین دہانی کرائی اور فی الواقع اس کے مطابق ہی عمل ہوا۔ اس لحاظ سے گویا بیگمات بھوپال کی حکمرانی اضطرار در اضطرار کا نتیجہ قرار پاتی ہے۔

علاوہ ازیں بیگمات بھوپال کی مثالیں دینے والوں کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ان بیگمات نے حکمرانی کے باوجود پردے تک کی پابندی سختی کے ساتھ کی تھی' بلکہ سلطان جہاں بیگم نے پردے کی حمایت میں ایک پُرزور کتاب بھی لکھی ہے جس کا نام "عفت المسلمات" ہے جس میں پردے کے شرعی احکام' بے پردگی کے نقصانات اور بے پردگی کی حمایت میں پیش کیے جانے والے دلائل کا دندان شکن جواب دیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو "تذکرہ بیگمات بھوپال" ص:۷۷-۷۸' دارالاشاعت' لاہور ۱۹۳۲ء)

کیا بیگمات بھوپال کا نام لینے والے اپنی حکمران بیگمات کو بھی پردے کی تاکید فرمائیں گے؟

ایوب خان کے دور میں محترمہ فاطمہ جناح کے صدارتی امیدوار نامزد کرنے سے بھی استدلال کیا جا رہا ہے' لیکن واقفانِ حال اور خلوتیان راز جانتے ہیں کہ ان کی نامزدگی بھی سن و سال کے علاوہ اضطراری صورت حال ہی کا نتیجہ تھی چونکہ پروفیسر صاحب نے اپنے مضمون میں اس مثال کا ذکر نہیں کیا ہے' اس لیے ہم بھی فی الحال اس کی ضروری تفصیل سے گریز کر رہے ہیں' علاوہ ازیں اس پر ضروری بحث گزر بھی چکی ہے۔

بہرحال اسلامی تاریخ کے گزشتہ چودہ صد سالہ دور میں عورت کی حکمرانی کی بعض ریاستی دائروں میں جو چند مثالیں ملتی ہیں ان سب کی حکمرانی کسی نہ کسی "اضطرار" پر مبنی تھی اور کسی بھی اضطراری صورت سے عام نارمل حالات کے لیے استدلال کرنا صحیح نہیں' کیوں کہ مسلمہ اصول ہے (الضرورات تبیح المحظورات) "بعض (اضطراری) ضرورتیں ممنوعات کو بھی جائز کر دیتی ہیں۔" گویا مذکورہ مثالیں آج کل کی اصطلاح کے مطابق نظریۂ ضرورت کی پیداوار تھیں' جنہیں عام حالات میں بطور مثال اور نمونہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔

دوم : پروفیسر صاحب نے بھی جتنی مثالیں اپنوں اور غیروں کی پیش کی ہیں۔ زمانۂ حال کی چند مثالوں سے قطع نظر' سب کی سب دور ملوکیت کی ہیں' یعنی وہ عورتیں وراثۃً شاہی حکومتوں اور ریاستوں کی حکمران بنی تھیں' جن میں عوام کی رائے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوگ جو آج عورت کی حکمرانی کا جواز چند ملوکانہ مثالوں سے کشید کر رہے ہیں۔ کیا وہ ملوکیت کے جواز یا استحسان کے قائل ہیں؟ اگر نہیں ہیں تو پھر ان کے لیے ان مثالوں سے استدلال کرنے کا جواز کیا ہے؟

رہ گئی مثالیں زمانۂ حال کی' جیسے اندرا گاندھی' مسز بندرا نائیکے اور مسز گولڈا میئر وغیرہ۔ یہ مثالیں یقیناً عصر حاضر کی ہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ "دور کے ڈھول سہانے" کے مصداق پروفیسر صاحب کو ان کا دور بڑا کامیاب نظر آیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان "نیلم پریوں" کی جمہوری قبا میں دیو استبداد ہی پائے کوب رہا ہے۔ اندرا گاندھی کا دور محض اس لیے کامیاب نہیں قرار دیا جا سکتا کہ اس کے دور میں ہمیں ہزیمت کا داغ برداشت کرنا پڑا تھا' کیونکہ اس میں اس کے ناخن تدبیر کی گرہ کشائی سے زیادہ ہماری اپنی حماقتوں' کوتاہیوں اور

بعض طالع آزماؤں کی حد سے زیادہ اقتدار پسندی کا دخل تھا۔ اندرا کا دور ابھی زیادہ پرانا نہیں ہوا ہے۔ ذرا اہل ہند سے اس کی کامیابیوں کی کارگزاریاں جاکر سن لیں اور پھر اس کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ کریں۔

سوم: روس' برطانیہ اور دیگر ممالک کی ملکاؤں [1] کے ادوارِ حکومت کو بھی جو نہایت کامیاب بتلایا گیا ہے' وہ بھی خلاف واقعہ ہے۔ موصوف نے صرف تصویر کا ایک ہی پہلو سامنے رکھا ہے' امید ہے کہ دیگر اہل علم و اہل تاریخ ان ملکاؤں کے ادوار حکومت کی پوری تفصیل اہل ملک کے سامنے پیش کریں گے جس سے ان کے "روشن اور کامیاب" ادوار کی حقیقت سامنے آجائے گی۔

ہمارے سامنے تو اسلامی تاریخ کے جو دو نمونے رضیہ سلطانہ اور چاند بی بی کے ہیں' انہیں عبرت انگیز ہی کہا جا سکتا ہے۔ کامیاب کسی طرح بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اوّل الذکر کی حکمرانی کو اس کی ریاست کے اکثر امراء ہی نے تسلیم نہیں کیا۔ رضیہ سلطانہ نے انہیں زیر کرنے کی کوشش کی مگر ان کے ہاتھوں شکست کھاتی رہی۔ داروغہ اصطبل یاقوت حبشی کو دیا جانے والا "امیرالامراء" کا خطاب اس کے لیے مزید مصیبت بن گیا۔ بالآخر اس نے ایک بہادر حاکم اختیارالدین التونیہ سے شادی کر کے اپنا اقتدار تسلیم کرانا چاہا مگر وہ اس میں بھی کامیاب نہ ہوئی اور بالآخر التونیہ اور رضیہ دونوں کو قتل کر دیا گیا۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ' ۱۰/۳۱۰-۳۱۱۔ شائع کردہ دانش گاہ' پنجاب اور "لاہور و تاریخ عالم اسلام" مؤلفہ محمد عبداللطیف انصاری' المؤتمرالاسلامی' کراچی' ص:۱۴۶)

ثانی الذکر کو بھی مسلسل بغاوت اور سازشوں کا سامنا کرنا پڑا اور بالآخر اپنی فوج کے باغی سپاہیوں کے ہاتھوں ماری گئی۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ' ۷/۶۱۴)

---

[1] پروفیسر صاحب کو اسی برطانیہ کی ملکہ میری (Mary) کا ذکر "فلاح" کے سلسلے میں کرنا چاہیے تھا جس کو تاریخ نے "خونی میری" (Bloody Mary) قرار دیا ہے۔ اسی طرح مصر کی ملکہ قلوپطرہ کو سامنے رکھنا چاہیے تھا جس کے حجلۂ تعیش میں روم کے مرد آہن سیزر اور پھر انتونی داد عیش دیتے رہے اور ملکہ سمیت ہلاکت کو پہنچے۔

البتہ بھوپال کی بعض بیگمات بالخصوص شاہ جہاں بیگم کا دورِ حکومت قدرے کامیاب قرار دیا جا سکتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بلاشبہ قانوناً ریاست کی حکمران یہی بیگمات تھیں' لیکن ایک تو ان بیگمات نے شریعت کی پابندی سختی کے ساتھ برقرار رکھی' حتیٰ کہ پردے تک سے انحراف نہیں کیا' دوسرے اسی شرعی پردے کی پابندی کی وجہ سے اپنے اختیارات کا استعمال وہ زیادہ تر اپنے دیندار مشیروں اور خاوندوں کے ذریعے سے کرتی رہی ہیں۔ شاہ جہاں بیگم کے شوہر اوّل (نواب امراء الدولہ باقی محمد خان) کی وفات تو شاہ جہاں بیگم کی تخت نشینی سے قبل ہی ہو گئی تھی' لیکن جب ان کا دوسرا نکاح والا جاہ نواب سید صدیق حسن خان سے ہوا' تو نواب صاحب کے ذریعے ہی سے زیادہ اختیارات کا استعمال ہوا' چنانچہ چند تصریحات اس ضمن میں پیش ہیں۔ "مآثر صدیقی" کے مصنف لکھتے ہیں:

"رئیسہ عالیہ (شاہ جہاں بیگم) احکام شرعِ متین کے مطابق ایک پردہ نشین خاتون تھیں اور وسیع رقبۂ مملکت پر حکمران اور کثیر التعداد مخلوق کے سیاہ و سفید کی مالک تھیں۔ اس لیے ضروری تھا کہ ان کے دست و بازو ایسے مشیران ریاست اور عمال متدین ہوں جو آغاز دور جدید میں اپنی خداداد قابلیت اور دیانت و تدبر اور خدا ترسی اور خدا پرستی سے حسن انتظام ریاست و ترقی مالیات' سرسبزی ملک' رفاہ خلق' تہذیب اخلاق رعایا اور ازدیادِ مراتب ریاست میں کافی امداد و اعانت کر سکیں۔"

اور ان کے شوہر والا جاہ نواب صدیق حسن کے متعلق مصنف مذکور لکھتے ہیں:

"والا جاہ مرحوم ریاست بھوپال میں نہ صرف وزیر بااختیار کی حیثیت رکھتے تھے' بلکہ رئیسۂ عالیہ کی اصل منشا اور احکام گورنمنٹ برطانیہ کی تصریح کے مطابق (جن کا حال مطالعۂ واقعات سے ظاہر ہو گا) وہ اپنی تجویز و مشورہ سے رئیسۂ عالیہ کے صدور حکم کے بعد تمام کلاً و جزءاً انتظامی اور اصلاحی امور ریاست انجام دیتے تھے۔" (مآثر صدیقی ۲/۳' طبع نول کشور لکھنو۔ ۱۹۲۴ء)

بلکہ نواب سید صدیق حسن خان پر جو الزامات لگائے گئے تھے' جن کی بنا پر انگریزوں نے ان کے تمام خطابات و اعزازات سلب کر لیے تھے' ان میں ایک الزام یہ بھی تھا کہ

انہوں نے رئیسہ عالیہ شاہ جہاں بیگم کو اپنے حبالۂ عقد میں لینے کے بعد پردہ نشین بنا کر ریاست کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں۔ (مآثر صدیقی' ۴۷/۳ و "نواب حسن خان" مؤلفہ ڈاکٹر رضیہ حامد' ص:۱۱۶' طبع بھوپال ۱۹۸۳ء)

پروفیسر صاحب نے اہل حدیث علماء سے نواب صدیق حسن خان کا فتویٰ طلب فرمایا ہے' لیکن ہم عرض کریں گے کہ نواب صاحب کا مذکورہ کردار ان کے کسی فتویٰ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ انہوں نے عملاً والیۂ ریاست شاہ جہاں بیگم کے اختیارات حکمرانی خود اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔ یقیناً اس میں وہی خیال و رائے کارفرما ہو گی جس کی رو سے عورت کا مقصد تخلیق سربراہیٔ ریاست سے مختلف ہے اور اگر موصوف کو فتویٰ ہی پر اصرار ہے تو پروفیسر صاحب اَلرِّجَالُ قَوّٰمُونَ عَلَى النِّسَآءِ اور آیت وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ کی تفسیر میں ان کی عربی تفسیر "فتح البیان" اور اردو تفسیر "ترجمان القرآن" ملاحظہ فرمالیں جہاں انہوں نے مرد کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہوئے حدیث لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَهُمْ امْرَاَةً کا بھی حوالہ دیا ہے۔

⑭ "فلاح" محض ظاہری خوشحالی کا نام نہیں ہے

چہارم: پروفیسر موصوف نے "فلاح" کا مفہوم صرف ظاہری خوش حالی ہی سمجھا ہے درآں حالیکہ "فلاح" کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے' نیز اس کا تعلق ظاہر سے کہیں زیادہ باطن سے ہے۔ ظاہری خوش حالی کے باوجود ایک قوم "ناکام" قرار دی جا سکتی ہے۔ یورپی حکومتیں اکثر ظاہری لحاظ سے نہایت آسودہ حال ہیں۔ سیاسی و اقتصادی استحکام بھی انہیں حاصل ہے لیکن اس کے باوجود عورت کی بے قید آزادی اور ہر شعبۂ زندگی میں مرد و عورت کے دوش بدوش والے نظریے نے جس طرح جنسی انارکی پورے معاشرے میں پیدا کر دی ہے اور عائلی نظام کو جس بری طرح برباد کیا ہے۔ کیا مادی خوش حالی اور دنیاوی آسائشوں کی فراوانی اس کا بدل کہلا سکتی ہے؟ اور جس قوم کا عائلی نظام تباہ ہو چکا ہو' بڑھتے ہوئے جرائم نے ہر شخص کو وہاں خوف زدہ کر رکھا ہو اور جنسی ہیجان انگیزی نے وہاں تمام

اخلاقی قدروں کو پامال کر دیا ہو۔ کیا اس قوم اور معاشرے کو کامیاب (فلاح یافتہ) کہا جا سکتا ہے؟ اگر نہیں کہا جا سکتا اور یقیناً نہیں کہا جا سکتا تو کسی بھی دور کی محض ظاہری خوش حالی اور چمک دمک سے اسے "کامیاب" قرار نہیں دیا جا سکتا۔ عام لوگ تو آج بھی یورپی قوم اور معاشرے کو بڑا "کامیاب" باور کراتے ہیں' لیکن الحمدللہ اہل نظر اور باخبر اہل علم کبھی اس مغالطے کا شکار نہیں ہوئے۔ وہ خوش حالی کے اس ساکن سمندر کی تہہ میں موجود خطرناک موجوں اور اس کی ہلاکت خیزیوں سے آگاہ ہیں۔ وہ مادی خوش حالی کو کامیابی نہیں سمجھتے' اخلاقی اقدار کی سربلندی اور قلب و نظر کی عفت و پاکیزگی کو کامیابی سمجھتے ہیں اور وہ خوف اور دہشت سے بھرپور معاشرے کو کبھی "فلاح یاب" ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے۔

⑮ ظاہری خوش حالی بطور "استدراج" بھی ہو سکتی ہے

پنجم: قرآن کریم اور فرمان رسول ﷺ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بعض دفعہ بطور استدراج قوموں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ صرف مہلت عمل ملتی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ان پر دنیاوی آسائشوں کے دروازے بھی کھول دیتا ہے جس طرح حدیث میں ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

"جب تم یہ دیکھو کہ معصیت کاریوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کسی فرد یا قوم کو اس کی خواہش کے مطابق دنیاوی مال و دولت سے نواز رہا ہے' تو یہ استدراج (ڈھیل دینا) ہے (مسند احمد: ۱۴۵/۴) پھر آپ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً فَإِذَا هُمْ مُبْلِسُونَ ﴿٤٤﴾ ﴾ (الأنعام٦/ ٤٤)

"جب وہ لوگ وہ سب باتیں بھلا بیٹھے جن کی ان کو نصیحت کی جاتی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے۔ یہاں تک کہ جب وہ ان چیزوں کو پا کر اترانے لگے تو ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا۔ تب وہ بالکل ناامید ہو گئے۔"

اس لیے اللہ کی نافرمانیوں کے باوجود اگر کوئی فرد یا قوم ظاہری طور پر پھل پھول رہی ہو

تو جلد ہی یہ فیصلہ نہیں کر لینا چاہیے کہ یہ فرد یا قوم تو بہت کامیاب ہے' کیونکہ یہ وقتی ظاہری خوش حالی کامیابی کا معیار نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اس فرد یا قوم کے لیے مہلت عمل ہو' جس کی بابت نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مہلت کب ختم ہو جائے اور پھر وہ مواخذۂ الٰہی سے دوچار ہو کر نشان عبرت یا داستان پارینہ بن کر رہ جائے۔

اس کی ایک اور مثال سامنے رکھنی چاہیے کہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَوٰا وَيُرْبِي الصَّدَقَٰتِ ﴾ (البقرة۲/ ۲۷۶)

"اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔"

اس کے ظاہری مفہوم کی رو سے ہوتا تو یہ چاہیے کہ سودی کاروبار کرنے والے افراد اور قومیں مادی خوشحالی سے ہمکنار نہ ہوں' لیکن ظاہر میں اس کے برعکس ہو رہا ہے۔ سارے یورپ میں سودی نظام ہے لیکن اس کے باوجود وہاں دولت دنیا (کم ہونے کی بجائے) خوب فراواں ہے۔ ہمارے ملک میں بھی جو بڑے بڑے لوگ بنکوں سے سودی لین دین کرتے ہیں۔ وہ سود سے بچنے والوں کی نسبت زیادہ خوش حال ہیں کیا پروفیسر صاحب یہاں بھی اپنی "درایت" کا استعمال فرماتے ہوئے یہی ارشاد فرمائیں گے کہ واقعات سے قرآن کریم کے اس بیان کی تصدیق نہیں ہوتی۔ لہٰذا قرآن کریم کی اس آیت کا تعلق بھی صرف عہد رسالت کے اس معاشرے سے ہی ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا تھا' کیونکہ اگر اس کو بطور قاعدۂ کلیہ ہم لیں گے تو قرآن کریم کی تکذیب لازم آئے گی؟ یا موصوف یہاں اس بات کو تسلیم کریں گے کہ اللہ کے اس فرمان کا تعلق ظاہری بڑھوتری سے نہیں ہے بلکہ معنوی بڑھوتری اور روحانی برکت سے ہے۔

ہم پروفیسر صاحب موصوف سے پوچھتے ہیں کہ یہاں ان کا موقف کیا ہے؟ کیا یہاں اس "درایت" کا استعمال صحیح ہے جو آپ نے زیر بحث حدیث کے ردّ کرنے یا اسے محدود کرنے کے لیے استعمال فرمائی ہے یا آپ اس کی وہی توجیہ فرمائیں گے؟ جو ہم نے علمائے کرام کی ہمنوائی کرتے ہوئے مذکورہ سطور میں پیش کی ہے؟ اگر آپ کو اپنی "درایت" کی صحت پر اصرار ہے' تو پھر اس کی روشنی میں اس آیت کا مفہوم بھی واضح فرمائیے! اور اگر

آپ یہاں معنوی فوز و فلاح اور روحانی برکت مراد لیتے ہیں' تو یہی مفہوم حدیث لَنْ یُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَهُمْ امْرَاَةً میں کیوں نہیں لیا جا سکتا؟ علاوہ ازیں اگر "فلاح" کا وہی مفہوم صحیح ہے جو پروفیسر صاحب کے ذہن میں ہے تو اس لحاظ سے تو خود بوران دخت کے دور کو بھی ناکام قرار نہیں دیا جا سکتا' کیونکہ اس کے دور میں بھی بظاہر عدم فلاح والی بات نظر نہیں آتی۔ ۶ مہینے اس کی حکمرانی رہی اور پھر ایک بیماری میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئی۔ بیماری کی وجہ سے فوت ہونے کو ناکامی نہیں کہا جا سکتا' لیکن اس کے باوجود نبی ﷺ نے اس قوم کے فلاح کی نفی فرمائی ہے تو یقیناً اس کے کچھ باطنی اور روحانی اثرات ایسے ہیں جن کا پورا اندازہ ظاہری پیمانوں سے نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۶) ایک قطعی الثبوت بات کو کسی مؤرخ کے بیان سے مشکوک نہیں ٹھہرایا جا سکتا

ششم: کسی بھی دور کو کامیاب یا ناکامیاب قرار دینا اتنا آسان نہیں ہے' جتنا پروفیسر صاحب نے سمجھ لیا ہے اور خواتین کے پیش کردہ ادوارِ حکومت کو کامیاب قرار دے دیا ہے۔ موصوف سے زیادہ کون اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اہل تاریخ کے بیانات آپس میں مختلف اور متضاد ہوتے ہیں۔ کوئی کسی عہد کو کامیاب قرار دیتا ہے تو کوئی اور اسی عہد کو ناکام بلکہ بدترین باور کراتا ہے۔ زیادہ دور نہ جائیے۔ اپنی آنکھوں دیکھا دور ہی سامنے رکھ لیجیے۔ کئی لوگ مصر کے جمال عبدالناصر کو اسلام کا "بطل جلیل" کہتے ہیں' جب کہ کئی دوسرے اسے اسلام کا دشمن قرار دیتے ہیں۔ کئی لوگ صدر ایوب خان کے دور کو زریں دور باور کراتے ہیں اور کئی دوسرے اس کے برعکس رائے رکھتے ہیں۔ یہی معاملہ جنرل ضیاء الحق اور جناب بھٹو کے عہد ہائے حکومت کا ہے۔

اس کے کئی اسباب ہیں' بعض دفعہ مؤرخین کے اپنے ذہنی رجحانات و نظریات ہوتے ہیں جو تاریخ میں راہ پا جاتے ہیں اور بعض دفعہ بعد میں برسراقتدار آنے والے حکمرانوں کے مخصوص مفادات اور پروپیگنڈا اس میں اثر انداز ہوتا ہے۔ بعض دفعہ کچھ اور اسباب اس میں کارفرما ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی بھی تاریخی بیان کو سوفی صد صحیح نہیں سمجھا جا سکتا

اور نہ اس کی بنیاد پر کسی قطعی الثبوت بات کو رد ہی کیا جا سکتا ہے۔

کیا موصوف کو پتہ نہیں کہ بنو اُمیہ کا دورِ حکومت (بہ حیثیت مجموعی) تاریخ اسلام کا بہترین دور ہے' لیکن مسلم مؤرخین نے اسے کس طرح مسخ کیا ہے؟ ہم پوچھتے ہیں کہ اگر مورخین کے بیانات اتنے ہی صحیح اور مقدس ہیں کہ ان کی بنیاد پر قرآن و حدیث کے مسلمات بھی مشکوک قرار پا جائیں تو پھر موصوف کو دور اموی کو بھی تاریخ کا بدترین دور باور کر لینا چاہیے۔ جس طرح کہ ہمارے اکثر مورخین یہی کچھ باور کراتے ہیں' موصوف بنی امیہ کے بارے میں مورخین کے مبینہ تاثر کے برعکس کیوں رائے رکھتے ہیں؟ اگر بنو اُمیہ کے بارے میں مورخین کی رائے کا تجزیہ کر کے ان کو غلط کہا جا سکتا ہے' تو کیا ان مورخین کی رائے کی تغلیط و تردید نہیں کی جا سکتی جنھوں نے برخلاف واقعہ مذکورہ خواتین کے عہد ہائے حکومت کو کامیاب قرار دیا ہے؟

⑰ استثنائی صورتوں سے اُصول اور کلیہ نہیں ٹوٹتا

ہفتم: یہ مسلمہ بات ہے کہ اصول و کلیات میں بھی استثنائی صورتیں ہوتی ہیں اور ان سے اصول اور کلیہ نہیں ٹوٹتا' کیونکہ کلیہ عموم اور اکثریت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اس لیے بعض استثنائی صورتوں سے وہ متاثر نہیں ہوتا' مثلاً ایک مسلمہ اصول اور کلیہ ہے کہ مرد عورت کے مقابلے میں زیادہ بہادر اور قوی ہے۔ اس کلیے کے برعکس اگر چند عورتیں نسبتاً مردوں سے زیادہ بہادر نکل آئیں' تو کیا لاکھوں اور کروڑوں مردوں میں ۱۰۔ ۲۰ عورتوں کے بہادر ہونے سے مردوں کی مردانگی و بہادری والا کلیہ ختم ہو جائے گا؟ نہیں' یقیناً نہیں' اسی طرح اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ پروفیسر صاحب موصوف کی پیش کردہ حکمران خواتین بڑی کامیابی سے حکومت کرتی رہی ہیں' تب بھی ہزاروں اور لاکھوں مرد حکمرانوں کے مقابلے میں ان کامیاب خواتین کا تناسب ہی کیا ہے؟ اس لیے موصوف کی بات ماننے کے باوجود حدیث زیر بحث میں جو کلیہ حکمران عورتوں کی بابت بیان کیا گیا۔ وہ اپنی جگہ بالکل صحیح اور واقعات کے بالکل مطابق ہے۔ چند عورتوں کی کامیاب حکمرانی سے یہ کلیہ ختم نہیں ہو گا۔

اگر اصول اور کلیے اس طرح ٹوٹنے لگیں جس طرح موصوف نے اس کلیے کے ٹوٹنے کا دعویٰ کیا ہے' تو پھر دنیا کا کوئی اصول اور کلیہ بطور اصول اور کلیہ کے باقی ہی نہیں رہے گا۔ کیونکہ بیشتر اصول اور کلیے ایسے ہی ہوتے ہیں جن میں استثنائی صورتیں بھی ہوتی ہیں' لیکن اس کے باوجود کلیوں کو کلیہ ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔ بعض استثنائی صورتوں سے اس کے ٹوٹنے کا دعویٰ نہیں کیا جاتا۔

⑱ عورت کی سربراہی اسلام کی صریح تعلیمات کے خلاف ہے

ہشتم: پروفیسر صاحب نے سارا زور حدیث مذکور کو مشکوک بنانے یا اس کے معنی و مفہوم کے بدلنے پر صرف کیا ہے اور سمجھ لیا ہے کہ اس کے بعد عورت کی سربراہی کا جواز ہر قسم کے شک و شبہے سے بالا ہو گیا ہے۔ حالانکہ موصوف کا ایسا سمجھنا اس وقت تو صحیح ہو سکتا تھا جب کہ اس مسئلے میں حدیث مذکور ہی واحد نص ہوتی جب کہ واقعہ یہ ہے کہ عورت کی سربراہی و حکمرانی کا مسئلہ ایسا ہے کہ قدم قدم پر اس کا ٹکراؤ قرآن و حدیث کی واضح نصوص اور اس کی صریح تعلیمات سے ہوتا ہے۔

مثلاً عورت کی حکمرانی ﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُونَ عَلَى النِّسَاءِ ﴾ (النساء: ۳۴/۴) "مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔" کے خلاف ہے۔ ﴿ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ﴾ (البقرہ ۲۲۸/۲) "مردوں کو عورتوں پر ایک لحاظ سے برتری حاصل ہے۔" سے متصادم ہے۔ ﴿ وَقَرْنَ فِیْ بُیُوتِكُنَّ ﴾ (الاحزاب ۳۳/۳۳) "عورتیں اپنے گھروں میں ٹک کر رہیں" کی صریح خلاف ورزی ہے۔

قرآن نے معاشی ذمے داریوں کا کفیل صرف مرد کو بنایا ہے عورت کو اس سے مستثنیٰ رکھا ہے۔ قرآن نے یہ تصریح کر کے کہ "ہم نے تمام نبی مرد ہی بنائے" (الانبیاء:۷/۲۱) یہ واضح کر دیا ہے کہ امامت و قیادت کی قبا مردوں کے قامت زیبا ہی پر راست آتی ہے۔ علاوہ ازیں دیگر دلائل شرعیہ کی رو سے:

- عورت' مردوں کی امامت نہیں کر سکتی' کسی مسجد کی مؤذن یا خطیب نہیں ہو سکتی۔
- عورت کسی نکاح میں ولی نہیں بن سکتی۔ حتیٰ کہ خود اس کا اپنا نکاح بھی بغیر ولی کے صحیح نہیں۔

- خلوت میں کسی نامحرم سے ملاقات نہیں کر سکتی۔
- عورت کو جہاد کی ذمے داریوں سے مستثنٰی رکھا گیا ہے۔
- عورت کو اپنی آواز تک کو کنٹرول کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔
- کسی بھی موقعے پر مرد و عورت کے اختلاط اور بے محابا میل جول یا آپس میں بے باکانہ گفتگو کو پسند نہیں کیا گیا اور اس طرح کی بہت سی باتیں ہیں جن سے مرد و زن کی اس کامل مساوات کی نفی ہوتی ہے جو مغرب کا نظریہ ہے اور جس پر عورت کی سربراہی کی اصل بنیاد قائم ہے۔

کیا ان تعلیمات اور واضح تصریحات کے بعد اس امر میں کوئی شک و شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ ایک مسلمان مملکت میں کسی عورت کے سربراہ بننے کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے ہمارے ملک میں اب ایک محترمہ اس منصب پر فائز ہو گئی ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب ایسا کرنا جائز ہو گیا ہے۔ قطعاً نہیں' ہرگز نہیں' بلکہ مسلمانوں کا عمل و کردار ایک الگ چیز ہے اور قرآن و حدیث کی تصریح ایک شے دیگر ہے۔ مسلمانوں کے ایک غلط عمل کے اختیار کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اس غلط عمل کو سند جواز مل گئی ہے۔ اس منطق کی رو سے تو پھر تمام "منکرات" معروفات میں' سیئات' حسنات میں اور محرمات' حلال میں تبدیل ہو جائیں گے۔

بنابریں ہم سیاسی دانشوروں سے عرض کریں گے کہ اگر آپ کو "مغربی جمہوریت" کا یہ تحفہ اچھا لگتا ہے' تو آپ یقیناً اسے پسند فرمائیں' لیکن قرآن و حدیث کو بازیچۂ اطفال بنانے سے گریز فرمائیں اور پروفیسر اسلم صاحب سے بالخصوص عرض ہے کہ آپ نے اسلام کے ایک مسلمہ اصول کو مشکوک بنانے کے لیے جو سعی و کاوش فرمائی ہے اور جو دور کی کوڑی آپ لائے ہیں' ہو سکتا ہے کہ بہت سے "دانشوروں" نے اس پر آپ کو خوب داد دی ہو' لیکن ہم اپنی گزشتہ گزارشات کے پیش نظر ان سے یہی عرض کریں گے۔

اے اہل نظر! ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شئی کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا

⑲ بعض غزوات میں بعض عورتوں کی شرکت کی حقیقت

بعض لوگ اس سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ عہد رسالت مآب ﷺ میں عورتیں غزوات میں شریک ہوتی رہی ہیں جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ عورتیں مردوں کے دوش بدوش سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لے سکتی ہیں' لیکن اصل بات یہ ہے کہ بعض غزوات میں بعض عورتوں کی شرکت ایک اتفاقی معاملہ تھا یعنی کسی وجہ سے بعض عورتیں اپنے خاندوں یا بیٹوں یا دیگر عزیزوں کے ساتھ میدان جنگ میں چلی گئیں۔ جس سے ان کا مقصود زخمیوں کی مرہم پٹی' ستو وغیرہ گھول کر پلانا اور تیر پکڑانا تھا۔ اسلامی فوج کے ساتھ ان کی یہ شرکت اس اصول کا نتیجہ ہرگز نہیں تھی کہ عورتوں پر بھی جہاد مردوں کی طرح فرض ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر عورتوں کی شرکت کے اِکے دُکے واقعات ہی احادیث و سیر کی کتابوں میں نہ ملتے' بلکہ ہر غزوے میں مردوں کے دوش بدوش عورتوں کا ذکر بھی ہوتا' نیز عورتوں کو بھی جہاد کی دعوت دی جاتی' لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ عام غزوات میں عورتیں شریک نہیں ہوئیں اور نبی ﷺ نے بھی عورتوں کو جہاد میں شریک ہونے کا کبھی حکم نہیں دیا۔ بعض عورتوں نے اجازت مانگی تو آپ نے انہیں اجازت بھی نہیں دی۔ جیسا کہ ام ورقہ بنت نوفل رضی اللہ عنہا کا واقعہ پہلے گزر چکا ہے کہ انہوں نے جنگ بدر میں شرکت کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن نبی ﷺ نے اجازت نہیں دی اور فرمایا تم گھر ہی میں رہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں وہیں شہادت سے ہمکنار فرمادے گا (اس کا حوالہ گزر چکا ہے) بعض اور عورتوں نے بھی جہاد میں شریک ہونے کا ارادہ ظاہر فرمایا تو آپ نے ان کو یہ فرمایا کہ تمہارا جہاد حج ہے۔ (صحیح بخاری' الجهاد والسير' باب جهاد النساء' حديث:۲۸۷۵)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے کبھی بھی عورتوں کو جہاد میں شریک ہونے کا حکم نہیں دیا۔ اگر کسی غزوے میں وہ شریک ہوئی ہیں' تو محض اپنے جذبے اور کسی اصول کے بغیر ہوئی ہیں۔ چنانچہ نبی ﷺ کی عورتوں کے بارے میں ان ہدایات کا نتیجہ ہم دیکھتے ہیں کہ عہد خیرالقرون اور مابعد ادوار میں کسی بھی اسلامی معاشرے میں عورتیں مردوں کے

دوش بدوش نظر نہیں آتیں۔ بالخصوص سیاست و جہانبانی کا شعبہ عورتوں سے بالکل خالی رہا ہے۔ اس لیے مذکورہ استدلال بھی اپنے اندر کوئی قوت نہیں رکھتا۔

⑳ فوجی یا لیگی حکومتوں کا رویہ کوئی شرعی دلیل نہیں

ایک استدلال یہ کیا جاتا ہے کہ پاکستان میں شروع ہی سے عورتیں ہر شعبے میں مردوں کے دوش بدوش حصہ لیتی آ رہی ہیں اور ہر حکومت نے اس کی حوصلہ افزائی ہی کی ہے' چاہے وہ لیگی حکومت ہو یا فوجی' اس وقت یہ علماء کہاں تھے؟ اور اب ایک عورت کا سربراہ حکومت بن جانا کیوں ناجائز ہے؟

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ہر حکومت یہاں مغرب کے نظریۂ مساواتِ مرد و زن کو فروغ اور اس کی ترویج کرتی رہی ہے' بلاشبہ صحیح ہے حتی کہ جنرل ضیاء الحق تک کے گیارہ سالہ دور میں بھی یہ پالیسی نہ صرف برقرار بلکہ روز افزوں رہی ہے' لیکن یہ کہنا کہ اس وقت علماء کہاں تھے؟ وہ کیوں خاموش رہے؟ یہ تاثر خلاف واقعہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علماء نے ہر دور میں مذکورہ پالیسی کی مذمت ہی کی ہے اس پر خاموش نہیں رہے' وہ اسے برابر ہدف تنقید بناتے رہے ہیں' لیکن

کون سنتا ہے فغان درویش

کے مصداق ان کی آواز صدا الصحراء ہی ثابت ہوتی رہی ہے۔ اس لیے علماء کو مطعون کرنا صحیح ہے نہ گزشتہ حکومتوں کی پالیسیوں کو بطور حجت پیش کرنا درست ہے' کیوں کہ ان کا عمل شرعی دلیل نہیں ہے اور علماء کی بابت یہ کہنا کہ وہ خاموش رہے' واقعات کے خلاف ہے۔

آئین میں ترمیم کی ضرورت: بہرحال ہم پھر عرض کریں گے کہ قرآن و حدیث کی واضح نصوص کی رو سے عورت کا دائرہ عمل گھر سے باہر نہیں۔ صرف گھر کے دائرے تک محدود ہے اور عارضی اور اضطراری صورتوں کے علاوہ عورتوں کا ہر شعبۂ زندگی میں مردوں کے دوش بدوش حصہ لینا کسی طرح بھی اسلامی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ حکومتوں کا عمل چاہے کچھ بھی رہا ہو' ان کی کج فکریوں کی وجہ سے اسلام کا مسلمہ اصول نہیں ٹوٹ

سکتا۔ بنابریں ہم حکومت سے بالخصوص اپیل کریں گے کہ وہ عورتوں کے بارے میں از سرنو پالیسی وضع کرے اور اسے اسلامی اصولوں پر استوار کرے اور مغرب کی پیروی و نقالی سے اجتناب کرے' نیز آئین میں وزارتِ عظمیٰ و صدارت وغیرہ کلیدی مناصب کے لیے مسلمان مرد کی وضاحت کی بھی ضرورت ہے۔ وما علینا الا البلاغ المبین۔

(۲۱) حدیث ابی بکرہ رضی اللہ عنہ کو موضوع ثابت کرنے کیلئے ایک اور مفروضہ اور اس کی حقیقت

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حدیث لَنْ یُفْلِحَ قومٌ ولّوا اَمْرَھُمُ امرأۃً موضوع ہے اس لیے کہ اس حدیث کے راوی حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ ہیں' جو طائف کے محاصرہ کے دوران مشرف بہ اسلام ہوئے تھے اور ایران کی ملکہ اس سے کافی عرصہ پہلے تخت شاہی پر بیٹھی تھی' یعنی یہ حدیث تو کسی ایسے صحابی سے مروی ہونی چاہیے تھی جو اس وقت سے پہلے مسلمان ہو چکا ہوتا' جب ملکہ حکمران بنی اور پھر جب ان کی تخت نشینی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوتی تو آپ یہ فرماتے' لیکن راوی کافی عرصہ بعد مسلمان ہوا' لہٰذا انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہی نہیں۔

مغالطۂ مذکورہ کی وضاحت: یہ دعویٰ کہ ایرانی کی ملکہ کی تخت نشینی کا واقعہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کے مشرف بہ اسلام ہونے سے کافی عرصہ قبل کا ہے' صحیح نہیں' کیونکہ:

① محاصرۂ طائف' جس میں حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے۔ ۸ ہجری کا واقعہ ہے اور ملکہ فارس کا واقعہ بھی ۸ ہجری ہی کا ہے' کسریٰ (شاہ فارس) کا اپنے بیٹے (شیرویہ) کے ہاتھوں قتل ہونے کا واقعہ بقول واقدی ۱۰ جمادی الآخرۃ ۷ ھ میں پیش آیا ہے۔ (ملاحظہ ہو۔ البدایۃ والنہایۃ' ۲۷۰/۴)

اس کے بعد اس کا قاتل بیٹا (شیرویہ) تخت فارس پر متمکن ہوا۔ اس کا اقتدار چھ مہینے رہا' پھر بیمار ہو کر مر گیا۔ اس کے بعد بوران دُخت بنت کسریٰ حکمران بنی جو تاریخی اعتبار سے ۸ ہجری ہی کا واقعہ بنتا ہے۔ پھر کچھ عرصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک اس خبر کے پہنچنے میں بھی یقیناً لگا ہو گا۔ بنابریں حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کا اس حدیث کے سماع میں کوئی ایسا اشکال نہیں رہتا کہ جس کی بنیاد پر اس حدیث کو ردّ کیا جا سکے۔

② دوسرے' مسند احمد کی روایت میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ جب عورت کے حکمران بننے کی خبر رسول اللہ ﷺ کو پہنچائی گئی تو اس وقت آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھے اور آپ نے عورت کی اطاعت کو مردوں کی ہلاکت کا باعث بتلایا۔ (ملاحظہ ہو' الفتح الربانی' ج:۲۳' ص:۳۵)

جس کا مطلب یہ ہوا کہ عورت کی حکمرانی کی بابت جو وعید نبی ﷺ نے بیان فرمائی وہ حضرت عائشہ کی موجودگی میں فرمائی تھی۔ پھر جب جنگ جمل کے موقع پر حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کے حوالے سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عدم تعاون کا فیصلہ کیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس حدیث پر کوئی نکیر نہیں کی۔ علاوہ ازیں اور بھی کسی صحابی نے اس کا انکار نہیں کیا۔ یوں گویا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سمیت اصحاب رسول نے اس حدیث کی صحت میں کوئی شک نہیں کیا' بلکہ سب نے اسے تسلیم کیا۔ اس لیے اس روایت کو اس بنا پر رد کر دینا کہ حضرت ابوبکرہ کے سوا اسے کوئی اور روایت کرنے والا نہیں ہے' سراسر غیر معقول رویہ ہے کیونکہ جنگ جمل میں اس روایت کی بازگشت نے اس روایت کو متعارف کروا دیا تھا اور اس پر کسی بھی طرف سے نکیر نہ ہونے کی وجہ سے اس پر گویا صحابہ رضی اللہ عنہم کا اتفاق ہو گیا۔

③ تیسرے' مجمع الزوائد میں طبرانی کے حوالے سے حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت جابر بن سمرہ سے بھی بایں الفاظ ایک روایت مروی ہے۔ ((لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ يَمْلِكُ رَأْيَهُمُ امْرَأَةٌ)) (مجمع الزوائد' ۲۰۹/۵)

اس کے بارے میں حافظ ہیثمی نے یہ کہا ہے کہ اس میں ایک راوی طبرانی کے شیخ ابو عبیدۃ عبدالوارث بن ابراہیم ہیں جنہیں میں نہیں جانتا۔ تاہم ان کے علاوہ --- اس کے بقیہ رجال ثقات ہیں' لیکن طبرانی کے غیر معروف مشائخ کے بارے میں حافظ ہیثمی کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ثقہ ہیں۔ (ملاحظہ ہو: مقدمہ مجمع الزوائد ۸/۱)

اس لحاظ سے یہ روایت سنداً صحیح قرار پاتی ہے۔ تاہم اگر ضعف تسلیم کر لیا جائے تب بھی بطور شاہد اور تائید کے طبرانی کی مذکورہ روایت قابل قبول ہو گی۔

④ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی روایت مسند احمد' ترمذی' نسائی وغیرہ کے علاوہ صحیح بخاری میں

دو جگہ آئی ہے۔ اس لیے اہل سنت کے نزدیک صحیح بخاری کی یہ روایت شک و شبہ سے بالا ہے۔ تاہم مذکورہ وجوہ کے بعد تو اس کی صحت میں اب ان حضرات کے لیے بھی شک کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے جو اس حدیث صحیح کو رد کرنے کے لیے دور دور کی کوڑی لا رہے ہیں۔

(۲۲) نواب صدیق حسن خان کی صراحت

ایک صاحب نے ہمیں ایک خط تحریر کیا ہے اور انہوں نے اس میں مطالبہ کیا ہے کہ "نواب صدیق حسن خان قنوجی کا فتویٰ فراہم کرنا اہل حدیث کے ذمے ہے' اہل حدیث یہ بتائیں کہ نواب صاحب نے عورت کی حکمرانی کو کہاں حرام کہا ہے؟"

اس مطالبے سے موصوف کا مطلب اگر یہ ہے کہ لفظ "حرام" کی نشاندہی کی جائے تو شاید ہم یہ لفظ اسی طرح دکھانے سے معذور ہوں جس طرح شراب کو حلال باور کرانے والے "جدید مجتہدین" کے مطالبے پر' کہ قرآن میں شراب کو "حرام" کہاں کہا گیا ہے؟ علماء لفظ "حرام" دکھانے سے معذور ہیں۔ تاہم اگر موصوف کا مطلب عورت کی سرابرہی کی شرعی حیثیت کی وضاحت ہے' تو اس کے لیے ہم پہلے ہی ان کی عربی اور اردو دونوں تفاسیر کا حوالہ پیش کر چکے ہیں۔ تاہم مزید اتمام حجت کے لیے ان کی تفاسیر کی اصل عبارتیں اور ان کی ایک اور کتاب سے اس کی صراحت ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔ وَاللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ۔

نواب صاحب کی ایک عربی کتاب کا اقتباس اور اس کا ترجمہ:

«وَمِنْهَا كَوْنُهُ ذَكَرًا، وَوَجْهُهُ أَنَّ النِّسَاءَ نَاقِصَاتُ عَقْلٍ وَدِينٍ، كَمَا قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، وَمَنْ كَانَ كَذٰلِكَ لاَ يَصْلُحُ لِتَدْبِيرِ الأُمَّةِ وَلِتَوَلِّي الْحُكْمِ بَيْنَ عِبَادِ اللهِ، وَفَصْلِ خُصُومَاتِهِمْ بِمَا تَقْتَضِيهِ الشَّرِيعَةُ الْمُطَهَّرَةُ وَيُوجِبُهُ الْعَدْلُ، فَلَيسَ بَعْدَ نُقْصَانِ الْعَقْلِ وَالدِّينِ شَيءٌ وَلاَ تُقَاسُ الإِمَامَةُ وَالْقَضَاءُ عَلَى الرِّوَايَةِ فَإِنَّهَا تَرْوِي مَا بَلَغَهَا وَتَحْكِي مَا قِيلَ لَهَا، وَأَمَّا الإِمَامَةُ وَالْقَضَاءُ فَهُوَ يَحْتَاجُ

إِلَى اجْتِهَادِ الرَّأْيِ وَكَمَالِ الإِدْرَاكِ وَالتَّبَصُّرِ فِي الأُمُورِ وَالتَّفَهُّمِ لِحَقَائِقِهَا، وَلَيْسَتِ الْمَرْأَةُ فِي وِرْدٍ وَّلاَ صَدْرٍ مِنْ ذٰلِكَ وَلاَ تَقْوِي عَلَى تَدْبِيرِ أَمْرِ الْعِبَادِ وَالْبِلاَدِ، بَلْ هِيَ أَضْعَفُ مِنْ ذٰلِكَ وَأَعْجَزُ، وَيُؤَيِّدُ هٰذَا مَا ثَبَتَ فِي الصَّحِيحِ لِلْبُخَارِيِّ مِنْ حَدِيثِ أَبِي بَكْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ مِنْ قَوْلِهِ ﷺ: لَنْ يُّفْلِحَ قَومٌ وَلَّوا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً، قَالَهُ لَمَّا بَلَغَ أَنَّ أَهْلَ فَارِسَ قَدْ مَلَّكُوا عَلَيهِمْ بِنْتَ كِسْرٰى يَعْنِي بُورَانَ بِنْتِ شِيرُويه بنِ كِسْرٰى، فَلَيس بَعْدَ نَفْيِ الْفَلاَحِ شَيءٌ مِنَ الْوَعِيدِ الشَّدِيدِ وَرَأْسُ الأُمُورِ هُوَ الإِمَامَةُ، وَالْقَضَاءُ وَبِحُكْمِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ فَدُخُولُهُ فِيهَا يَكُونُ دُخُولاً اَوَّلِيًّا»(اكليل الكرامة في تبيان مقاصد الامامة، ص: ٦٦-٦٧)

”حکمران کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ مرد ہو‘ کیوں کہ عورتیں عقل اور دین میں ناقص ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے اور جو عقل و دین میں ناقص ہو وہ تدبیر امت‘ فصل خصومات اور اللہ کے بندوں کے درمیان فیصلہ کرنے کی اس طرح اہلیت سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا جو شریعت الٰہیہ کا اقتضاء اور عدل و انصاف کے لحاظ سے ضروری ہے۔ پس عقل و دین میں نقصان کے بعد کچھ نہیں۔

علاوہ ازیں امامت (حکمرانی) اور قضاء کو روایت (حدیث رسول بیان کرنے) پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ روایت میں تو عورت وہی کچھ بیان کرتی ہے جو اسے پہنچتا اور وہی کچھ نقل کرتی ہے جو اس سے کہا گیا ہوتا ہے‘ لیکن حکمرانی اور قضاء کا مسئلہ اس سے بالکل مختلف ہے‘ اس کے لیے تو اجتہادِ رائے‘ کمال ادراک‘ معاملات میں گہری بصیرت اور حقائق تک پہنچنے کے لیے قوت فہم نہایت ضروری ہیں‘ جبکہ عورت ان خوبیوں سے متصف ہے نہ وہ بندوں اور شہروں کے معاملات کی تدبیر کی قوت رکھتی ہے‘ بلکہ وہ ان امور میں نہایت کمزور اور حد درجہ

عاجز ہے۔ اس کی تائید صحیح بخاری کی اس حدیث ابی بکرۃ رضی اللہ عنہ سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ قوم ہرگز فلاح یاب نہیں ہو گی جس نے اپنے معاملات ایک عورت کے سپرد کر دیے۔" یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت ارشاد فرمائی تھی جب آپ کو یہ خبر پہنچی کہ اہل فارس نے اپنا حکمران بنت کسریٰ یعنی بوران بنت شیرویہ بن کسریٰ کو بنالیا ہے۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسی قوم سے فلاح کی نفی کر دینا بہت شدید وعید ہے اور معاملات کی اصل بنیاد اللہ کے حکم کے مطابق امامت و قضاء ہی ہے۔ پس یہ معاملہ اس میں سب سے پہلے داخل ہو گا۔"

اردو تفسیر "ترجمان القرآن" میں وضاحت: نواب صاحب اپنی اردو تفسیر "ترجمان القرآن" میں آیت ﴿ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ﴾ (البقرۃ ۲/۲۲۸) کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"مردوں کو عورتوں پر درجہ حاصل ہے یعنی خلق و خلق میں فضیلت رکھتے ہیں۔ منزلت و طاعت۔ امر و انفاق و قیام مصالح میں بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ اہل جہاد و عقل و قوت ہیں۔ ان کا حصہ میراث میں دوگنا ہے۔ ان کی اطاعت عورت پر واجب ہے عورت موافق ان کی رضامندی کے رہے سہے۔ گواہی' ولایت' صلاحیت' امامت و قضا میں بھی مقدم ہیں۔ یہ ایک عورت پر دوسری' تیسری' چوتھی جورو اور بے گنتی لونڈیاں لاسکتے ہیں۔ عورت دوسرا شوہر ان کی موجودگی میں نہیں کر سکتی۔ طلاق و رجعت بھی انہیں کے ہاتھ میں ہے نہ عورت کے۔ اگر اور کچھ فضیلت مرد کو عورت پر نہ ہوتی' تو یہ کیا کم بزرگی ہے کہ عورت مرد سے پیدا ہوئی ہے کیونکہ پیدا ہونا حوا علیہا السلام کا آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے ثابت ہو چکا ہے۔ فرمایا کہ اگر میں کسی کو کہتا کہ کسی کو سجدہ کرو' تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کیا کرے اس کو بغوی نے اپنی سند سے روایت کیا ہے یہ بات حدیث معاذ بن جبل میں آئی ہے۔ یہ فضیلت مرد کی عورت پر دنیا و آخرت دونوں جگہ میں ثابت ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ "الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَبِمَا اَنْفَقُوا مِنْ اَمْوَالِهِمْ اطلاق فضیلت مفید عموم ہے۔" (ترجمان القرآن' ۲۹۹/۱)

اور آیت ﴿ الرجال قوامون علی النساء ﴾ کے تحت فرماتے ہیں۔

"یعنی اللہ نے مرد کا درجہ اوپر بنایا تو عورت کو اس کی حکم برداری چاہیے اور اگر ایک عورت بد خوئی کرے' تو مرد پہلے درجے سمجھائے دوسرے درجے جدا سووے' لیکن اسی گھر میں' پھر آخر درجے مارے بھی' لیکن نہ ایسا کہ ضرب پہنچے' پھر اگر مطیع ہو جاوے تو کرید نہ کرے تقصیروں پر اللہ سب پر حاکم ہے۔ باقی ہر تقصیر کی ایک حد ہے' مارنا آخر کا درجہ ہے۔

ف: اللہ نے اس آیت میں یہ ارشاد کیا کہ مرد عورت پر قیم ہے' یعنی اس کا رئیس کبیر حاکم مؤدِب ہے جب عورت کجروی کرے' یہ اس کو ادب دے' اس لیے کہ مرد افضل ہیں عورتوں سے' اسی لیے نبوت مختص ہے ساتھ رجال کے' بادشاہی اعظم خاص ہے ساتھ مردوں کے ((لِقَوْلِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوا اَمْرَهُمْ امْرَأَةً)) (رواه البخاری من حديث ابی بكرة رضی الله عنه) اسی طرح منصب قضا وغیرہ مخصوص ہے ساتھ مردوں کے۔ علاوہ اس کے مرد اپنا مال عورت پر صرف کرتے ہیں جیسے مہور و نفقات وغیرہ۔ حقوق جو کتاب و سنت میں آئے ہیں اس لیے مرد فی نفسہ عورت سے افضل ہے' فضل و افضال میں اس پر مقدم ہے۔ اسی سبب سے قیم ہونا مرد کا مناسب ٹھہرا۔ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا مراد قَوَّامُونَ سے امراء ہیں۔ یعنی عورت کو لازم ہے کہ جس امر میں اللہ نے اطاعت مرد کا حکم اسے دیا ہے اس امر میں اس کی مطیع رہے۔ اطاعت یہ ہے کہ گھر والوں سے نیکی کرے۔ شوہر کی نگہبان ہو۔ یہی قول ہے مقاتل' سدی و ضحاک کا۔ (تفسیر ترجمان القرآن: ۲/۶۴۲)

آگے چل کر مزید فرماتے ہیں:

"فتح البیان کا بیان ہے کہ مرد مسلط ہیں عورتوں پر یعنی جس طرح حکام و امراء حفاظت رعیت کرتے ہیں اسی طرح مرد عورت کا نگہبان ہوتا ہے۔ پھر علاوہ اس کے گھر بار روٹی' کپڑا دیتا ہے قوام صیغہ ہے مبالغے کا۔ اس میں بیان دلیل ہے اس بات پر کہ مرد اصل میں اس کام میں قائم ہیں ساتھ مصالح و تدبیرات خانگی و تادیب کے' جس طرح کہ بادشاہ رعیت کے کاموں پر قائم و دائم ہوتے ہیں۔ یہ فضیلت مردوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی ہے۔ انبیاء و خلفاء و سلاطین و حکام و ائمہ و غزاۃ سب مرد ہی ہوتے ہیں۔ عقل و دین و شبہات و

جمعہ و جماعت میں عورت سے بڑھ کر ہیں۔ مرد چار جورو کر سکتا ہے' عورت ایک شوہر سے زیادہ نہیں کر سکتی' مرد کا حصہ میراث میں زیادہ ہے' طلاق و رجعت ہاتھ میں مرد کے ہے' نسب باپ کا ہوتا ہے نہ ماں کا۔ ان کے سوا اور بہت امور ہیں جن میں مرد کو عورت پر فضیلت حاصل ہے۔" (تفسیر "ترجمان القرآن" ۲/۶۴۴)

عربی تفسیر "فتح البیان" میں صراحت: عربی تفسیر میں مسئلہ زیر بحث میں ان کی صراحت حسب ذیل ہے۔

﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ أَي مَنْزِلَةٌ لَيستْ لَهُنَّ وَهِيَ قِيَامُهُ عَلَيْهَا فِي الإِنْفَاقِ وَكَونُهُ مِنْ أَهْلِ الْجِهَادِ وَالْعَقْلِ وَالْقُوَّةِ، وَلَهُ مِنَ الْمِيرَاثِ أَكْثَرُ مِمَّا لَهَا، وَكَوْنُهُ يَجِبُ عَلَيْهَا امْتِثَالُ أَمْرِهِ وَالْوُقُوفُ عِنْدَ رِضَاهِ وَالشَّهَادَةُ وَالدِّيَـةُ وَصَلاَحِيَّةُ الإِمَامَةِ وَالْقَضَاءِ، وَلَهُ أَنْ يَتَـزَوَّجَ عَلَيهَا وَيَتَسَرَّى، وَلَيْسَ لَهَا ذٰلِكَ، وَبِيَدِهِ الطَّلاَقُ وَالرَّجْعَةُ وَلَيْسَ شَيْءٌ مِّنْ ذٰلِكَ بِيَدِهَا، وَلَوْ لَمْ يَكُنْ مِنْ فَضِيلَةِ الرِّجَالِ عَلَى النِّسَاءِ إِلاَّ كَوْنُهُنَّ خُلِقْنَ مِنَ الرِّجَالِ لِمَا ثَبَتَ أَنَّ حَوَّاءَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلْعِ آدَمَ لَكَفٰى، وَقَدْ أَخرَجَ أَهْلُ السُّنَنِ عَنْ عَمْرِو بْنِ الأَحْوَصِ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: أَلاَ إِنَّ لَكُمْ عَلٰى نِسَاءِكُمْ حَقًّا، وَلِنِسَاءِكُمْ عَلَيكُمْ حَقًّا، فَأَمَّا حَقُّكُمْ عَلٰى نِسَائِكُمْ فَلاَ يُوطِئْنَ فُرُشَكُمْ مَنْ تَكْرَهُونَ، وَلاَ يَأْذَنَّ فِي بُيُوتِكُمْ لِمَنْ تَكْرَهُونَ أَلاَ وَحَقُّهُنَّ عَلَيكُمْ أَنْ تُحْسِنُوا إِلَيهِنَّ فِي كِسْوَتِهِنَّ وَطَعَامِهِنَّ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمَذِيُّ وَأَصْلُهُ عِنْدَ مُسْلِمٍ فِي الصَّحِيحِ وَأَخْرَجَ أَحْمَدُ وَأَبُودَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَابْنُ جَرِيرٍ وَالْحَاكِمُ وَصَحَّحَهُ وَالْبَيْهَقِيُّ عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ حَيْدَةَ الْقُشَيْرِيِّ: أَنَّهُ سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ مَا حَقُّ الْمَرْأَةِ عَلَى الزَّوجِ قَالَ أَنْ تُطْعِمَهَا إِذَا طَعِمْتَ، وَتَكْسُوهَا إِذَا اكْتَسَيتَ وَلاَ تَضْرِبِ الْوَجْهَ وَلاَ تَهْجُرْ إِلاَّ

فِي الْبَيْتِ، وَعَنِ ابْنِ أَبِي ظِبْيَانَ أَنَّ مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ خَرَجَ فِي غَزَاةٍ بَعَثَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِيهَا ثُمَّ رَجَعَ فَرَأَى رِجَالاً يَسْجُدُ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ، فَذَكَرَ ذٰلِكَ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ فَقَالَ: لَو أَمَرْتُ أَحَدًا أَنْ يَسْجُدَ لأَحَدٍ لأَمَرْتُ الْمَرْأَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا، رَوَاهُ الْبَغَوِيُّ بِسَنَدِهِ»(فتح البيان: ۱/ ۳۲۲، ۳۲۳)

اور آیت ﴿ الرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ﴾ کے تحت فرماتے ہیں:

﴿اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ﴾ مُسَلَّطُونَ ﴿عَلَى النِّسَاءِ﴾ كَلاَمٌ مُسْتَأْنِفٌ سِيقَ لِبَيَانِ سَبَبِ اسْتِحْقَاقِ الرِّجَالِ الزِّيَادَةَ فِي الْمِيرَاثِ تَفْصِيلاً إِثْرَ بَيَانِ تَفَاوُتِ اسْتِحْقَاقِهِمْ إِجْمَالاً، وَعُلِّلَ ذٰلِكَ بِأَمْرَيْنِ، أَوَّلُهُمَا: وَهْبِيٌّ، وَالثَّانِي: كَسْبِيٌّ، وَالْمَعْنَىٰ أَنَّهُمْ يَقُومُونَ بِالذَّبِّ عَنْهُنَّ كَمَا يَقُومُ الْحُكَّامُ وَالأُمَرَاءُ بِالذَّبِّ عَنِ الرَّعِيَّةِ، وَهُمْ أَيْضًا يَقُومُونَ بِمَا يَحْتَجْنَ إِلَيهِ مِنَ النَّفَقَةِ وَالْكِسْوَةِ وَالْمَسْكَنِ، وَجَاءَ بِصِيغَةِ الْمُبَالَغَةِ لِتَدُلَّ عَلَى إِصَالَتِهِمْ فِي هٰذَا الأَمْرِ وَهُوَ جَمْعُ قَوَّامٍ وَهُوَ الْقَائِمُ بِالْمَصَالِحِ وَالتَّدْبِيرِ وَالتَّأْدِيبِ، يُشِيرُ بِهِ إِلَى أَنَّ الْمُرَادَ قِيَامُ الْوُلاَةِ عَلَى الرَّعَايَا قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: أُمَرُّوا عَلَيْهِنَّ فَعَلَى الْمَرْأَةِ أَنْ تُطِيعَ زَوْجَهَا فِي طَاعَةِ اللهِ، ﴿بِمَا﴾ اَلْبَاءُ، سَبَبِيَّةٌ، وَ(مَا) مَصْدَرِيَّةٌ ﴿فَضَّلَ اللهُ﴾ وَالضَّمِيرُ فِي قَوْلِهِ ﴿بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ﴾ لِلرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ أَي إِنَّمَا اسْتَحَقُّوا هٰذِهِ الْمَزِيَّةَ لِتَفْضِيلِ اللهِ إِيَّاهُمْ عَلَيهِنَّ بِمَا فَضَّلَهُمْ بِهِ مِنْ كَونِ فِيهِمُ الأَنْبِيَاءُ وَالْخُلَفَاءُ وَالسَّلاَطِينُ وَالْحُكَّامُ وَالأَئِمَّةُ وَالْغُزَاةُ، وَزِيَادَةُ الْعَقْلِ وَالدِّينِ وَالشَّهَادَةِ وَالْجُمُعَةِ وَالْجَمَاعَاتِ، وَأَنَّ الرَّجُلَ يَتَزَوَّجُ بِأَرْبَعِ نِسْوَةٍ وَلاَ يَجُوزُ لِلْمَرْأَةِ غَيرَ زَوْجٍ وَاحِدٍ، وَزِيَادَةُ النَّصِيبِ وَالتَّعْصِيبِ فِي الْمِيرَاثِ وَبِيَدِهِ الطَّلاَقُ وَالنِّكَاحُ وَالرَّجْعَةُ وَإِلَيْهِ الاِنْتِسَابُ،

وَغَيْرِ ذٰلِكَ مِنَ الأُمُورِ فَكُلُّ هٰذَا يَدُلُّ عَلَى فَضْلِ الرِّجَالِ عَلَى النِّسَاءِ»(فتح البيان : ٢/ ٦٧)

عربی تفسیر کی مذکورہ دونوں عبارتوں کا وہی مفہوم ہے جو انہوں نے اردو تفسیر میں بیان کیا ہے اور پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ اس لیے ان عربی عبارات کے ترجمہ کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

بہرحال نواب صدیق حسن خان کی ان واضح تصریحات کے بعد اس امر میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہ جاتا ہے کہ نواب صاحب علیہ الرحمۃ کے نزدیک بھی عورت امامت کبریٰ (حکمرانی) کی اہل نہیں ہے' اس معاملے میں بھی مرد کو بعض دیگر امتیازی خوبیوں کے ساتھ عورت پر ایک گونہ فضیلت حاصل ہے۔

اسلامی مملکت میں خاتون کی حکمرانی' کسی طور پر جائز نہیں

شیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ

سوال اگر کوئی خاتون ملک کی وزیر اعظم' وزارت یا کسی اور بڑے منصب کے لیے بنفس نفیس خود کو پیش کرے تو شرع اسلامی الحنیف کا اس سلسلے میں کیا موقف ہے۔ ازراہ کرم جواب دے کر ممنون فرمائیں؟

جواب کسی خاتون کا ملک کا وزیر اعظم بننا یا بنایا جانا یا کسی اور بڑے منصب پر تعین' اسلام میں جائز نہیں ہے۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم' سنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع کی وضاحتیں بصراحت موجود ہیں۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ﴿ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ اس آیت میں حکم عام ہے۔ مرد کو اللہ تعالیٰ نے قوام بنایا ہے۔ خاندان میں بھی' ریاست میں بھی' اس آیت کریمہ سے صاف واضح ہے کہ مرد کو اللہ تعالیٰ نے عورت پر افضیلت عطا فرمائی ہے۔ اس میں عقل کی' رائے کی اور ہر طرح کی افضیلت شامل ہے---

اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیں بخاری شریف کی یہ حدیث ملتی ہے کہ "وہ قوم تباہ و برباد ہوئی جس نے عورت کو اپنا حاکم اور سربراہ بنایا۔" اس حدیث صحیح کے بعد اس بات میں کوئی شک نہیں رہتا کہ کسی خاتون کو صاحب امر بنانا یا اس کی تولیت میں مملکت کی زمام کار دے دینا احکام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی بڑی خلاف ورزی اور جسارت کی بات ہے۔ اس حدیث کی خلاف ورزی میں کئی ایسی حدیثوں کا متن بھی شامل ہو جاتا ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ جانتے بوجھتے سنت رسول کا بطلان کفر کی حدوں تک پہنچتا ہے اور صورت حال سے واقف ہونے کے بعد کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ احکام رسول کی خلاف ورزی کرے۔

اجماع کے سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ خلفائے راشدین ؓ اور ان کے بعد کی تین صدیوں تک علمائے کرام کا عمل یہ رہا کہ کسی خاتون کو امارت یا عہدۂ قضا پر مامور نہیں کیا گیا۔ اس دور کی خواتین میں اکثر ایسی تھیں جنھوں نے کتاب و سنت کی روشنی میں خود اس بات کی وضاحت فرمائی کہ خواتین کے لیے یہ مناصب مناسب نہیں ہیں---

اس کے علاوہ بھی شرعی احکام واضح ہیں۔ حکام وقت کا بیشتر وقت دیگر مردوں اور اعمال حکومت سے گفت و شنید' دوروں' ملاحظوں' افواج کی قیادت و اجتماعات میں شرکت اور ان کی رہبری و رہنمائی اور خطبات و تقاریر میں گزرتا ہے۔ انہیں دیگر ممالک کے دورے بھی کرنے ہوتے ہیں۔ مختلف ممالک سے پیکٹ (Pact) ہوتے ہیں اور دوسرے ملکوں کے صدور و وزراء اور سفراء سے معانقے' دعوتیں' غرض ایسے بے انتہا کام ہیں جن میں وزیراعظم' صدر مملکت یا ملک کے اہم مناصب پر فائز لوگوں کو دن رات مشغول رہنا ہوتا ہے' اس لیے دینی' عقلی اور علمی کسی طرح مناسب نہیں کہ کسی خاتون یا خواتین کو ایسے مناصب دیے جائیں جو ان کے لیے مناسب نہیں ہیں۔

مزید برآں اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی عقل کی روشنی میں بھی یہ بات بالکل واضح ہے کہ عورت کے مقابلے میں مرد کی عقل' فہم' حسن تدبیر اور دیگر سارے قوائے جسمانی زیادہ بہتر ہیں۔ لہٰذا ملک کے متذکرہ بالا اعلیٰ مناصب کے لیے مرد ہی زیادہ مناسب ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں دین حنیف اور سنت رسول ﷺ کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے۔ (عربی مجلہ "المجتمع" کویت سے تلخیص و ترجمہ۔ بشکریہ ہفت روزہ "تکبیر" کراچی)

عورت کی سربراہی کے عدم جواز پر امت کا اجماع ہے

مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی

قرآن و سُنّت کے دلائل کی وجہ سے چودہ صدیوں کے ہر دور میں امت مسلمہ کا اس بات پر اجماع رہا ہے کہ اسلام میں سربراہ حکومت کی ذمہ داری کسی عورت کو نہیں سونپی جا سکتی اور اجماع امت شریعت کی ایک مستقل دلیل ہے۔

اجماع کے ثبوت کے لیے ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تحریر بڑی واضح ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

«وَاتَّفَقُوا أَنَّ الإِمَامَةَ لاَ تَجُوزُ لِامْرَأَةٍ»(مراتب الاجماع، ص:۱۲۹)

"اس بات پر تمام علماء متفق ہیں کہ حکومت کی سربراہی کا منصب کسی عورت کے لیے جائز نہیں ہے۔"

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے باخبر عالم نے "نقد مراتب الاجماع" کے نام سے علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ کتاب پر ایک تنقید لکھی ہے اور بعض ان مسائل کا ذکر فرمایا جنہیں علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے اجماعی قرار دیا ہے لیکن علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے مطابق وہ اجماعی نہیں ہیں' بلکہ ان میں کسی نہ کسی کا اختلاف موجود ہے۔ اس کتاب میں بھی انہوں نے عورت کی سربراہی کے مسئلے میں علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ (دیکھیے نقد مراتب الاجماع' ص:۱۲۶)

ان حضرات کے علاوہ جن علماء و فقہاء اور اسلامی ریاست کے ماہرین نے اسلام کے سیاسی نظام پر کتابیں لکھی ہیں' ان میں سے ہر ایک نے اس مسئلے کو ایک متفقہ مسئلے کے طور پر ذکر کیا ہے۔

علامہ ماوردی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب اسلامی سیاست کا اہم ترین ماخذ سمجھی جاتی ہے۔ اس میں انہوں نے حکومت کی سربراہی تو کجا' عورت کو وزارت کی ذمہ داری سونپنا بھی ناجائز قرار

دیا ہے، بلکہ انہوں نے وزارت کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک وزارت تفویض، جس میں پالیسی کا تعین بھی وزیر کا کام ہوتا ہے اور دوسری وزارتِ تنفیذ، جو پالیسی کا تعین نہیں کرتی، بلکہ طے شدہ پالیسی کو نافذ کرتی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ وزارتِ تنفیذ میں اہلیت کی شرائط وزارت تفویض کے مقابلے میں کم ہیں۔ اس کے باوجود وہ عورت کو وزارتِ تنفیذ کی ذمہ داری سونپنا بھی جائز قرار نہیں دیتے، وہ لکھتے ہیں۔

«وَأَمَّا وِزَارَةُ التَّنْفِيذِ فَحُكْمُهَا أَضْعَفُ وَشُرُوطُهَا أَقَلُّ ... وَلاَ يَجُوزُ أَنْ تَقُومَ بِذٰلِكَ امْرَأَةٌ وَأَنَّ خَبَرَهَا مَقْبُولٌ لِمَا تَضَمَّنَهُ مَعْنَى الْوِلاَيَاتِ الْمَصْرُوفَةِ عَنِ النِّسَاءِ لِقَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ مَا أَفْلَحَ قَوْمٌ أَسْنَدُوا أَمْرَهُمْ إِلَى امْرَأَةٍ وَلأَنَّ فِيهَا مِنْ طَلَبِ الرَّأْيِ وَثَبَاتِ الْعَزْمِ مَا تَضْعُفُ عَنْهُ النِّسَاءُ وَمِنَ الظُّهُورِ فِي مُبَاشَرَةِ الأُمُورِ مَا هُوَ عَلَيْهِنَّ مَحْظُورٌ»(الاحکام السلطانية، ص:٢٥-٢٧)

”جہاں تک وزارت تنفیذ کا تعلق ہے وہ نسبتاً کمزور ہے اور اس کی شرائط کم ہیں--- لیکن یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی عورت اس کی ذمہ دار بنے، اگرچہ عورت کی خبر مقبول ہے، کیونکہ یہ وزارت ایسی ولایتوں پر مشتمل ہے جن کو (شریعت نے) عورتوں سے الگ رکھا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ”جو قوم اپنے معاملات کسی عورت کے سپرد کرے وہ فلاح نہیں پائے گی۔“ نیز اس لیے بھی کہ اس وزارت کے لیے جو اصابت رائے اور اولوالعزمی درکار ہے، عورتوں میں اس کے لحاظ سے ضعف پایا جاتا ہے۔ نیز اس وزارت کے فرائض انجام دینے کے لیے ایسے انداز سے لوگوں کے سامنے ظاہر ہونا پڑتا ہے جو عورتوں کے لیے شرعاً ممنوع ہے۔“

اسلام کے سیاسی نظام پر دوسرا اہم ماخذ امام ابو یعلیٰ حنبلی رحمہ اللہ ہیں۔ انہوں نے بھی اپنی کتاب میں لفظ بہ لفظ یہی عبارت تحریر فرمائی ہے۔

امام الحرمین علامہ جوینی رحمہ اللہ نے اسلام کے سیاسی نظام پر بڑے معرکے کی کتابیں لکھی

ہیں۔ وہ نظام الملک طوسی جیسے نیک نام حاکم کے زمانے میں تھے اور انہی کی درخواست پر انہوں نے اسلام کے سیاسی احکام پر اپنی مجتہدانہ کتاب ''غیاث الامم'' تحریر فرمائی ہے اس میں وہ سربراہ حکومت کی شرائط بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

«وَمِنَ الصِّفَاتِ اللاَّزِمَةِ الْمُعْتَبَرَةِ، الذُّكُورُ وَالْحُرِّيَّةُ وَالْعَقْلُ وَالْبُلُوغُ وَلاَ حَاجَةَ إِلَى الإِطْنَابِ فِي نَصْبِ الدَّلاَلاَتِ عَلَى اِثْبَاتِ هٰذِهِ الصِّفَاتِ»(غياث الامم للجويني، ص: ٨٢ مطبوعه قطر)

''اور جو لازمی صفات سربراہ کے لیے شرعاً معتبر ہیں ان میں سے اس کا مذکر ہونا' آزاد ہونا اور عاقل و بالغ ہونا بھی ہے اور ان شرائط کو ثابت کرنے کے لیے تفصیلی دلائل پیش کر کے طول دینے کی ضرورت نہیں۔''

یہی امام الحرمین رحمہ اللہ اپنی ایک دوسری کتاب ''الارشاد'' میں تحریر فرماتے ہیں:

«وَأَجْمَعُوا أَنَّ الْمَرْأَةَ لاَ يَجُوزُ أَنْ يَّكُونَ إِمَامًا وَإِنِ اخْتَلَفُوا فِي جَوَازِ كَونِهَا قَاضِيَةً فِيمَا يَجُوزُ شَهَادَتُهَا فِيهِ»(الإرشاد في أصول الأعتقاد للجويني، ص: ٣٧٩ و٤٢٧، طبع مصر)

''اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ عورت کے لیے سربراہ حکومت بننا جائز نہیں' اگرچہ اس میں اختلاف ہے کہ جن امور میں اس کی گواہی جائز ہے ان میں وہ قاضی بن سکتی ہے یا نہیں۔''

علامہ قلقشندی رحمہ اللہ ادب و انشاء اور تاریخ و سیاست کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے اسلام کے اصول سیاست پر جو کتاب لکھی ہے اس میں انہوں نے سربراہ حکومت کی چودہ صفات اہلیت بیان کی ہیں' ان شرائط کے آغاز ہی میں وہ فرماتے ہیں:

«الأَوَّلُ الذُّكُورَةُ ... وَالْمَعْنٰى فِي ذٰلِكَ أَنَّ الإِمَامَ لاَ يَسْتَغْنِي عَنِ الاخْتِلاَطِ بِالرِّجَالِ وَالْمُشَاوَرَةِ مَعَهُمْ فِي الأُمُورِ، وَالْمَرْأَةُ مَمْنُوعَةٌ مِنْ ذٰلِكَ، وَلأَنَّ الْمَرْأَةَ نَاقِصَةٌ فِي أَمْرِ نَفْسِهَا، حَتّٰى لاَ تَمْلِكُ النِّكَاحَ فَلاَ تُجْعَلُ إِلَيْهَا الْوِلاَيَةُ عَلٰى غَيرِهَا»

"پہلی شرط مذکر ہونا ہے--- اور اس حکم کی حکمت یہ ہے کہ سربراہ حکومت کو مردوں کے ساتھ اختلاط اور ان کے ساتھ مشوروں وغیرہ کی ضرورت پیش آتی ہے اور عورت کے لیے یہ باتیں ممنوع ہیں' اس کے علاوہ عورت اپنی ذات کی ولایت میں بھی کمزور ہے' یہاں تک کہ وہ نکاح کی ولی نہیں بن سکتی' لہٰذا اس کو دوسروں پر بھی ولایت نہیں دی جا سکتی۔"

امام بغوی رحمہ اللہ پانچویں صدی ہجری کے مشہور مفسر' محدث اور فقیہ ہیں' وہ تحریر فرماتے ہیں:

«اِتَّفَقُوا عَلٰی أَنَّ الْمَرْأَةَ لَا تَصْلُحُ أَنْ تَكُونَ إِمَامًا . . . لِأَنَّ الإِمَامَ يَحْتَاجُ إِلَى الْخُرُوجِ لِإِقَامَةِ أَمْرِ الْجِهَادِ، وَالْقِيَامِ بِأُمُورِ الْمُسْلِمِينَ . . . وَالْمَرْأَةُ عَوْرَةٌ لَا تَصْلُحُ لِلْبُرُوزِ»(شرح السنة، الامارة والقضاء، باب كراهية تولية النساء: بعد حديث:٢٤٨٦)

"اس بات پر امت کا اتفاق ہے کہ عورت سربراہ حکومت نہیں بن سکتی--- کیونکہ امام کو جہاد کے معاملات انجام دینے اور مسلمانوں کے امور نمٹانے کے لیے باہر نکلنے کی ضرورت پڑتی ہے--- اور عورت پوشیدہ رہنی چاہیے۔ اس کا مجمع عام میں ظاہر ہونا درست نہیں۔"

قاضی ابوبکر ابن العربی رحمہ اللہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

«وَهٰذَا نَصٌّ فِي أَنَّ الْمَرْأَةَ لَا تَكُونُ خَلِيفَةً وَلَا خِلَافَ فِيهِ»(احكام القرآن لابن العربي: ٣/ ٤٤٥ سورة النمل)

"اور یہ حدیث اس بات پر نص ہے کہ عورت خلیفہ نہیں ہو سکتی اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔"

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بھی اپنی تفسیر میں ابن العربی رحمہ اللہ کا یہ اقتباس نقل کر کے اس کی تائید کی ہے اور بتایا ہے کہ اس مسئلے میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں [1] اور امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

[1] تفسیر القرطبی: ۱۳/ ۱۸۳' سورۃ النمل۔

«الرابع: الذُّكُورِيَّةُ فَلَا تَنْعَقِدُ الإِمَامَةُ لامْرَأَةٍ وَإِنِ اتَّصَفَتْ بِجَمِيعِ خِلَالِ الْكَمَالِ وَصِفَاتِ الاسْتِقْلَالِ»(فضائح الباطنية للغزالي، ص: ۱۸۰ ماخوذ از عبدالله الدميجي، الامامة العظمي، ص: ۲٤٥)

"سربراہی کی چوتھی شرط مذکر ہونا ہے' لہٰذا کسی عورت کی امامت منعقد نہیں ہوتی' خواہ وہ تمام اوصاف کمال سے متصف ہو اور اس میں استقلال کی تمام صفات پائی جاتی ہوں۔"

عقائد و کلام کی تقریباً تمام کتابیں امامت و سیاست کے احکام سے بحث کرتی ہیں اور سب نے مذکر ہونے کی شرط کو ایک اجماعی شرط کے طور پر ذکر کیا ہے۔ علامہ تفتازانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

«يُشْتَرَطُ فِي الإِمَامِ أَنْ يَكُونَ مُكَلَّفًا، حُرًّا، ذَكَرًا، عَدْلاً»(شرح المقاصد: ۲/ ۲۷۷)

"سربراہ حکومت کیلئے شرط یہ ہے کہ وہ عاقل بالغ ہو' آزاد ہو' مذکر ہو اور عادل ہو۔"

فقہاء و محدثین اور اسلامی سیاست کے علماء کے یہ چند اقتباسات محض مثال کے طور پر پیش کر دیے گئے ہیں' ورنہ جس کتاب میں بھی اسلام میں سربراہی کی شرائط بیان کی گئی ہیں' وہاں مذکر ہونے کو ایک اہم شرط کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اگر کسی نے یہ شرط ذکر نہیں کی' تو اس بنا پر کہ یہ عاقل و بالغ ہونے کی شرط کی طرح اتنی مشہور و معروف شرط تھی کہ اسے باقاعدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ ورنہ اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

عہد حاضر کے بعض محققین جنہوں نے اسلامی سیاست کے موضوع پر کتابیں لکھی ہیں' وہ اس بات پر متفق ہیں کہ عورت کے سربراہ بننے کے عدم جواز پر امت کا اجماع ہے۔ چند اقتباسات ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد منیر عجلانی لکھتے ہیں:

«لَا نَعْرِفُ بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ مَنْ أَجَازَ خِلَافَةَ الْمَرْأَةِ، فَالإِجْمَاعُ ـ فِي هٰذِهِ الْقَضِيَّةِ ـ تَامٌّ لَمْ يَشُذَّ عَنْهُ أَحَدٌ»(عبقرية الاسلام في اصول

الحکم، ص: ۷۰، مطبوعۃ دارالنفائس، بیروت ۱٤۰۵ھ)

"ہمیں مسلمانوں میں کوئی ایسا عالم معلوم نہیں ہے۔ جس نے عورت کی خلافت کو جائز کہا ہو' لہٰذا اس مسئلے میں مکمل اجماع ہے جس کے خلاف کوئی شاذ قول بھی موجود نہیں۔"

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین الریس نے اسلام کے سیاسی احکام پر بڑی تحقیق کے ساتھ مبسوط کتاب لکھی ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:

«إِذَا كَانَ قَدْ وَقَعَ بَيْنَهُمْ خِلاَفٌ فِيمَا يَتَعَلَّقُ بِالْقَضَاءِ، فَلَمْ يُرْوَ عَنْهُمْ خِلاَفٌ فِيمَا يَتَعَلَّقُ بِالإِمَامَةِ، بَلِ الْكُلُّ مُتَّفَقٌ عَلٰى أَنَّهُ لاَ يَجُوزُ أَنْ تَلِيَهَا امْرَأَةٌ»(النظريات السياسة الاسلامية، ص: ۲۹٤، طبع قاهره)

"اگرچہ فقہاء کے درمیان قضاء کے بارے میں تو اختلاف ہوا ہے (کہ عورت قاضی بن سکتی ہے یا نہیں) لیکن حکومت کی سربراہی کے بارے میں کوئی اختلاف مروی نہیں' بلکہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ کسی عورت کا سربراہی کے منصب پر فائز ہونا جائز نہیں۔"

ڈاکٹر ابراہیم یوسف مصطفیٰ عجو لکھتے ہیں:

«مِمَّا اجْمَعَتْ عَلَيهِ الأُمَّةُ عَلٰى أَنَّ الْمَرْأَةَ لاَ يَجُوزُ لَهَا أَنْ تَلِيَ رِيَاسَةَ الدَّوْلَةِ»(تعليق تهذيب الرياسة وترتيب الساسية للقلعي، ص: ۸۲)

"اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ عورت کے لیے ریاست کی سربراہی سنبھالنا جائز نہیں۔"

عبداللہ بن عمر بن سلیمان الدمیجی لکھتے ہیں:

«مِنْ شُرُوطِ الإِمَامِ أَنْ يَكُونَ ذَكَرًا، وَلاَ خِلاَفَ فِي ذٰلِكَ بَيْنَ الْعُلَمَاءِ»(الامامة العظمى عند أهل السنة، ص: ۲٤۳)

"سربراہ حکومت کی شرائط میں یہ بات داخل ہے کہ وہ مذکر ہو اور اس میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔"

عہد حاضر کے مشہور مفسر قرآن علامہ محمد امین شنقیطی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

«مِنْ شُرُوطِ الإمَامِ الأَعْظَمِ كَوْنُهُ ذَكَرًا، وَلاَ خِلاَفَ فِي ذٰلِكَ بَيْنَ الْعُلَمَاءِ»(اضواء البيان في تفسير القرآن بالقرآن: ١/٢٦)

"امام اعظم (سربراہ حکومت) کی شرائط میں اس کا مذکر ہونا بھی داخل ہے اور اس میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔"

اگر اس موضوع پر تاریخ اسلام کے ائمہ' مفسرین' فقہاء' محدثین' متکلمین اور اہل فکر و دانش کی تمام عبارتیں جمع کی جائیں' تو یقیناً ان سے ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے' لیکن یہ چند مثالیں یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ اس مسئلے پر علماء اسلام کے درمیان اب تک چودہ صدیوں میں کوئی اختلاف نہیں رہا۔

حافظ ابن جریر طبری رحمہ اللہ کا مسلک: ہمارے زمانے میں بعض لوگوں نے مشہور مفسر قرآن حافظ ابن جریر طبری رحمہ اللہ کی طرف غلط طور پر یہ بات منسوب کی ہے کہ وہ عورت کی سربراہی کے جواز کے قائل ہیں' لیکن کوئی بھی شخص امام ابن جریر رحمہ اللہ کا کوئی اپنا اقتباس پیش نہیں کرتا۔ ان کی تصانیف میں سے تفسیر "جامع البیان" تیس جلدوں میں چھپی ہوئی موجود ہے۔ اس میں سے کہیں کوئی ایک فقرہ بھی کوئی اب تک نہیں دکھا سکا جس سے ان کا یہ موقف معلوم ہوتا ہو۔ خود ہم نے بھی ان کی تفسیر کے ممکنہ مقامات پر دیکھا' لیکن اس میں کہیں کوئی ایسی بات نہیں ملی۔

اس کے علاوہ ان کی ایک کتاب "تہذیب الآثار" کی بھی کچھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں' اس میں بھی کوئی ایسی بات نہیں ملی۔

واقعہ یہ ہے کہ بعض علماء نے ان کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ وہ عورت کو قاضی بنانے کے جواز کے قائل ہیں۔ بعض لوگوں نے اس بات کو غلط طور پر سربراہی کے جواز کے عنوان سے نقل کر دیا ہے۔ چنانچہ قاضی ابوبکر ابن العربی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

«وَهٰذَا نَصٌّ فِي أَنَّ الْمَرْأَةَ لاَ تَكُونُ خَلِيفَةً وَلاَ خِلاَفَ فِيهِ، وَنُقِلَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ جَرِيرِ الطَّبَرِيِّ إِمَامِ الدِّينِ، أَنَّهُ يَجُوزُ أَنْ

تَكُونَ الْمَرْأَةُ قَاضِيَةً وَلَمْ يَصِحَّ ذٰلِكَ عَنْهُ، وَلَعَلَّهُ كَمَا نُقِلَ عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ أَنَّهَا إِنَّمَا تَقْضِي فِيمَا تَشْهَدُ فِيهِ، وَلَيْسَ بِأَنْ تَكُونَ قَاضِيَةً عَلَى الإِطْلَاقِ، وَلَا بِأَنْ يُكْتَبَ لَهَا مَنْشُورٌ، بِأَنَّ فُلَانَةَ مُقَدَّمَةٌ عَلَى الْحُكْمِ إِلاَّ فِي الدِّمَاءِ وَالنِّكَاحِ، فَإِنَّمَا ذٰلِكَ كَسَبِيلِ التَّحْكِيمِ أَوِ الاسْتِبَانَةِ فِي الْقَضِيَّةِ الْوَاحِدَةِ»(احكام القرآن لابن العربي: ۳/ ٤٤٥)

"اور یہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث اس بات پر نص ہے کہ عورت خلیفہ نہیں ہو سکتی اور اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں' البتہ امام محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ ان کے نزدیک عورت کا قاضی ہونا جائز ہے' لیکن اس مذہب کی نسبت ان کی طرف صحیح نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مذہب ایسا ہی ہو گا جیسے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ عورت ان معاملات میں فیصلہ کر سکتی ہے' جس میں وہ شہادت دے سکتی ہے اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ علی الاطلاق قاضی بن جائے۔ اور نہ یہ مطلب ہے کہ اس کو قاضی کے منصب پر مقرر کرنے کا پروانہ دیا جائے اور یہ کہا جائے کہ فلاں عورت کو قصاص اور نکاح کے معاملات کے سوا دوسرے امور میں قاضی بنایا جا رہا ہے' بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو کسی مسئلے میں ثالث بنا لیا جائے یا کوئی ایک مقدمہ جزوی طور پر اس کے سپرد کر دیا جائے۔"

امام ابن العربی کی اس وضاحت سے مندرجہ ذیل امور سامنے آتے ہیں:

1. سربراہی کا مسئلہ علیحدہ ہے اور قاضی بننے کا مسئلہ علیحدہ۔
2. سربراہی کے مسئلے میں امام ابن جریر رحمہ اللہ سمیت تمام علماء کا اتفاق ہے کہ عورت سربراہ نہیں بن سکتی۔
3. امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ سے قاضی بننے کا جواز منقول ہے لیکن ان کی طرف اس قول کی نسبت بھی درست نہیں۔

4 امام ابو حنیفہ یا ابن جریر رحمہما اللہ سے عورت کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کا جواز منقول ہے' وہ اس کو باقاعدہ قاضی بنانے سے متعلق نہیں ہے' بلکہ جزوی طور سے بطور ثالث کوئی انفرادی قضیہ نمٹانے سے متعلق ہے۔

بہرکیف! اگر فقہاء کے درمیان کوئی تھوڑا بہت اختلاف ہے تو وہ عورت کے قاضی بننے کے بارے میں ہے۔ سربراہ حکومت بننے کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں' چنانچہ امام الحرمین جوینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

«وَالذُّكُورَةُ لاَ شَكَّ فِي اعْتِبَارِهَا وَمَنْ جَوَّزَ مِنَ الْعُلَمَاءِ تَوَلِّي الْمَرْأَةِ لِلْقَضَاءِ فِيمَا يَجُوزُ أَنْ تَكُونَ شَاهِدَةً فِيهِ أَحَالَ انْتِصَابَ الْمَرْأَةِ لِلإِمَامَةِ، فَإِنَّ الْقَضَاءَ قَدْ يَثْبُتُ مُخْتَصًّا، وَالإِمَامَةُ يَسْتَحِيلُ فِي وَضْعِ الشَّرْعِ ثُبُوتُهَا عَلَى الاخْتِصَاصِ»(غياث الامم للجويني، ص: ٨٢-٨٣)

"سربراہی کے لیے مذکر ہونے کی شرط میں کوئی شک نہیں ہے اور جن علماء نے ان معاملات میں عورت کے قاضی بننے کو جائز کہا ہے کہ جن میں عورت گواہ بن سکتی ہے' وہ بھی سربراہی کے لیے عورت کی تقرری کو ناممکن قرار دیتے ہیں' اس لیے کہ قضاء کے بارے میں تو یہ ممکن ہے کہ اس کی حدود اختیار کو کچھ معاملات کے ساتھ خاص کر دیا جائے' لیکن حکومت کی سربراہی کو شرعی اصول کے مطابق کچھ محدود معاملات کے ساتھ خاص کرنا ممکن نہیں۔"

عورت --- اقبال کی نظر میں

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف
پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

○○○

یہ کوئی دن کی بات ہے اے مرد ہوش مند
غیرت نہ تجھ میں ہو گی نہ زن اوٹ چاہے گی
آتا ہے اب وہ دور کہ اولاد کے عوض
کونسل کی ممبری کے لیے ووٹ چاہے گی

○○○

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خردمند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند

○○○

نے پردہ نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

○○○

قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بے چارہ زن شناس نہیں

(بانگ درا اور ضرب کلیم سے اقتباسات)

عورت کی عفت و پاکیزگی کا مفہوم

اسلام میں عورت کو جس عفاف و پاکیزگی کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے' وہ اس کا زیور ہے' بلکہ یوں کہیے کہ وہی اس کی فطرت نسوانی کا حسن اور نکھار ہے۔

یہ یاد رہے کہ ہمارے ہاں عفاف و عصمت کے یہی معنی نہیں ہیں کہ مصحف رخ پر ناپاک نگاہیں نہ پڑیں' بلکہ اس سے زیادہ اس کا مفہوم ایک طرح کی ایجابیت لیے ہوئے ہے اور ایک مخصوص طرح کی سیرت و کردار کا مظہر ہے۔

عفاف کے معنی یہ ہیں کہ ایک عورت یہ سمجھتی ہے کہ محبت و تعلق خاطر کے تمام حقوق صرف ایک شخص کو حاصل ہیں اور وہ میرا شوہر ہے۔ صرف اس کی نظریں میرے جمال و زیبائش کا جائزہ لے سکتی ہیں اور اس کی محبت روح و قلب کی زندگی و بالیدگی کا باعث ہو سکتی ہے۔

اور آوارگی کے معنی صرف یہ نہیں کہ عورت بدکردار ہے' بلکہ اس سے زیادہ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ بدنصیب محبت و اخلاص کی اس دولت سے محروم ہے جو عائلی زندگی کی جان اور اساس ہے اور اگر معاشرہ اس بدکرداری کی حوصلہ افزائی کرتا ہے' تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ گھروں کو ان فطری سعادتوں سے اور اخلاص و تودد کی بے بہا نعمتوں سے محروم کر دینا چاہتا ہے اور یہی وہ نقطۂ زوال ہے کہ جو قومیں بھی محرومی و بدبختی کی اس منزل تک پہنچیں' پھر وہ ایسی مٹیں اور اس طرح ختم ہوئیں کہ دوبارہ نہیں ابھر سکیں۔

("الاعتصام" ۲ مارچ ۱۹۵۱ء - از مولانا محمد حنیف ندوی مرحوم)

اے دخترِ اسلام

مظفر وارثی

لگتی ہے کلی کتنی بھلی شاخِ چمن پر
ہاتھوں میں پہنچ کر کوئی قیمت نہیں رہتی
جو شمع سرِعام لٹاتی ہے اجالے
اس شمع کی گھر میں کوئی عزت نہیں رہتی
تسلیم کہ پردہ ہوا کرتا ہے نظر کا
نظروں میں بھی برداشت کی قوت نہیں رہتی
مردوں کے اگر شانہ بشانہ رہے عورت
کچھ اور ہی بن جاتی ہے، عورت نہیں رہتی
جھانک اپنے گریبان میں کیا ہو گیا تجھ کو
حیرت سے تجھے تکتا ہے آئینۂ ایام

اے دخترِ اسلام

خود اپنی جڑوں پر ہی چلاتی ہے درانتی
بربادیٔ احساس نمو مانگ رہی ہے
کب بخشی گئی ہیں تجھے آزادیاں اتنی
جو حق ہی نہیں ہے ترا تو مانگ رہی ہے
میں تو ترے ماتھے پہ پسینہ بھی نہ دیکھوں
مجھ سے مری غیرت کا لہو مانگ رہی ہے

جنت ہے ترے پاؤں میں فرمایا نبیؐ نے
دریا پہ کھڑی ہو کے سبو مانگ رہی ہے
وہ رتبۂ عالی کوئی مذہب نہیں دیتا
کرتا ہے جو عورت کو عطا مذہب اسلام
اے دختر اسلام

--- ۷ ---

عورت اور مسئلہ ولایت نکاح

بے پردگی نے جہاں اور بہت سے مسائل پیدا کیے ہیں' جن میں چند ایک پر ہم گزشتہ صفحات میں ضروری بحث کر آئے ہیں' وہاں نوجوان لڑکی کا والدین کی اجازت اور رضامندی کے بغیر از خود نکاح کرنے کا بھی اہم مسئلہ ہے۔ آج کل یہ مسئلہ کافی شدت اختیار کر گیا ہے اور اس قسم کے بعض معاملات عدالت میں بھی زیر بحث آتے رہتے ہیں اور اخبارات میں آئے دن کے واقعات کی اشاعت سے اندازہ ہوتا ہے کہ نوجوان لڑکیوں میں مغربی معاشرے کی طرح از خود نکاح کرنے کا رجحان فروغ پا رہا ہے اور والدین کے حق ولایت کو ایک ناروا بوجھ اور ظلم سمجھا جا رہا ہے اور بعض لوگ فقہ حنفی کے حوالے سے بالغ لڑکی کے اس قسم کے اقدام کو جائز قرار دے رہے ہیں اور عدالتیں بھی بالعموم انہیں سند جواز مہیا کر رہی ہیں اس لیے ضروری ہے کہ اس بارے میں مسئلے کی صحیح نوعیت کو واضح کیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ مذکورہ تصور اسلام کے احکام کے مطابق ہے نہ فقہ حنفی کی تصریحات کے مطابق' البتہ مغرب کی حیا باختہ تہذیب کے عین مطابق ہے' جس میں جوان ہونے کے بعد اولاد کا کوئی تعلق والدین کے ساتھ باقی نہیں رہتا۔ بالغ لڑکی جو چاہے کرے' والدین کو اس میں مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اگر والدین مداخلت کرتے ہیں تو لڑکی پولیس کے ذریعے سے والدین کو تھانے بھجوا کر جس کے ساتھ چاہے رنگ رلیاں منا سکتی ہے۔

اسلام میں تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد' دوسرے نمبر پر جو حکم ہے' وہ والدین کی اطاعت و فرمانبرداری اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا ہے' قرآن کریم میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ تم والدین کے سامنے (اگر کوئی بات تمہیں ناگوار گزرے تو) اونہہ تک نہ کہو' اس سے زیادہ والدین کے ادب و احترام اور اطاعت و فرماں برداری کی تاکید کیا ہو

سکتی ہے؟

یہ ٹھیک ہے کہ والدین کو سخت تاکید ہے کہ وہ لڑکی کی رضامندی کے بغیر اس کا نکاح نہ کریں۔ حتیٰ کہ اگر کوئی باپ لڑکی کی رضامندی کے بغیر نکاح کر دیتا ہے اور لڑکی کو وہ پسند نہ ہو تو شریعت نے لڑکی کو حق دیا ہے کہ وہ یہ نکاح فسخ کروا لے' لیکن دوسری طرف لڑکی کو قطعاً یہ حق نہیں دیا گیا ہے کہ وہ ولی کی اجازت کے بغیر جہاں چاہے' نکاح کر لے' بلکہ اس کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے ولی (باپ) کی اجازت اور رضامندی سے ہی نکاح کا مسئلہ حل کرے۔ اگر وہ ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے گی تو وہ نکاح ہی نہیں ہو گا۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

«لاَ نِكَاحَ إِلاَّ بِوَلِيٍّ»(سنن أبي داود، النكاح، باب في الولي، ح:٢٠٨٥)

"ولی کے بغیر نکاح نہیں"

دوسری روایت میں ہے:

«أَيُّمَا امْرَأَةٍ نَكَحَتْ بِغَيْرِ إِذْنِ مَوَالِيهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ»

(سنن أبي داود، النكاح، باب في الولي، ح:٢٠٨٣)

"جس عورت نے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا تو اس کا نکاح باطل ہے۔ اس کا نکاح باطل ہے' اس کا نکاح باطل ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام نے دونوں کو ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرنے اور ایک دوسرے کو راضی کرنے کی تاکید کی ہے۔ والدین کو جبر کرنے کی اجازت دی ہے' نہ لڑکی کو والدین کی اجازت اور رضامندی کو نظرانداز کرنے کی' اور جب بھی اور جہاں بھی لڑکی پر جبر کا پہلو پایا جائے' یا والدین کی اجازت کو نظرانداز کر کے من مانی کی جائے' تو دونوں صورتوں میں عدالت کے ذریعے سے اس ظلم و جبر کی تلافی کی جا سکتی ہے۔ یہ ہے اسلام کی صحیح تعبیر و تشریح۔

اس تفصیل سے واضح ہے کہ لڑکی کے مقابلے میں والدین کا حق مقدم اور فائق ہے اور تمام ائمہ اسلام اسی بات کے قائل ہیں۔ کوئی بھی امام لڑکی کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ

والدین کی اجازت اور رضامندی کو نظرانداز کر کے از خود نکاح کر لے' فقہ حنفی سے اس کا جو جواز ثابت کیا جاتا ہے' وہ صحیح نہیں ہے۔ فقہ حنفی میں بیان کردہ جواز کو اس کے پورے سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو فقہ حنفی سے اس کا مطلق جواز ثابت نہیں ہوتا۔

اوّل تو امام ابو حنیفہ کے شاگردان رشید امام ابو یوسف اور امام محمد' جنہیں صاحبین کہا جاتا ہے' فرماتے ہیں کہ عاقل و بالغ لڑکی بھی ولی کی رضامندی اور اجازت کے بغیر نکاح نہیں کر سکتی' البتہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک ایسا کرنا جائز ہے' لیکن امام صاحب کے نزدیک بالغ لڑکی کا یہ اختیار مشروط ہے کفو کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھنے کے ساتھ۔ اگر کسی لڑکی نے ولی کی اجازت کے بغیر "غیر کفو" میں نکاح کر لیا تو ولی کو نہ صرف اعتراض کرنے بلکہ تنسیخ نکاح کے لیے عدالتی چارہ جوئی کا حق حاصل ہے۔

ثانیاً امام ابو حنیفہ کے ایک شاگرد حضرت حسن بن زیاد کی روایت کی رو سے امام ابو حنیفہ کا یہ مسلک ہے کہ اگر لڑکی ولی کی اجازت کے بغیر غیر کفو میں نکاح کر لے گی' تو یہ نکاح ہی باطل ہو گا (یعنی ولی کو فسخ نکاح کرنے کے لیے عدالت میں جانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے فیض الباری' علامہ انور شاہ کشمیری۔ ۴/۲۸۲-۲۸۷)

کفو کا مطلب فقہاء کے ہاں یہ ہے کہ لڑکی کسی ایسی جگہ نکاح نہ کرے جس میں لڑکی کے ولی اور اہل خانہ عار محسوس کریں۔ اس شرط یا حق استرداد (ویٹو پاور) کی موجودگی میں' جو امام ابو حنیفہ کے نزدیک ولی کو حاصل ہے' یہ کہنا کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے کہ حنفی مذہب میں بالغ لڑکی کو ولی کی اجازت کے بغیر شادی کرنے کا غیر مشروط حق حاصل ہے؟ اس شرط کے تو صاف معنی یہ ہیں کہ ولی کی رضامندی اور اجازت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی لڑکی ایسا کرے گی تو ایک روایت کی رو سے یہ نکاح ہی باطل ہو گا اور ایک روایت کی رو سے ولی کو حق مرافعہ حاصل ہے اور وہ اسے فسخ کرانے کا اختیار رکھتا ہے۔

علمائے احناف کو اس نکتے پر غور کرنا چاہیے کہ جب کفو کو نظرانداز کرنے کی صورت میں امام صاحب کے نزدیک ولی کو لڑکی کا اختیار ختم کرنے اور نکاح کے ردّ کرنے اور کروانے کا حق حاصل ہے' یا بقول حسن بن زیاد امام صاحب کے نزدیک سرے سے نکاح

ہی باطل ہے' تو وہ مطلقاً یہ فتویٰ یا رائے کیوں دیتے ہیں کہ بالغ لڑکی کو از خود نکاح کرنے کا حق حاصل ہے؟ وہ مذکورہ شرط کو ساتھ ساتھ بیان کیوں نہیں کرتے؟ جس سے امام صاحب کا موقف دوسرے ائمہ کے موقف کے قریب ہو جاتا ہے۔ احناف کے موجودہ طرز عمل سے لَو میرج' کورٹ میرج اور سیکرٹ میرج (محبت کی شادی' عدالت کے ذریعے سے شادی اور خفیہ شادی) کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔ جج حضرات بھی یہ سمجھتے ہیں کہ مذکورہ قسم کی شادیوں کو' جن میں لڑکی اپنے ولی کی رضامندی اور اجازت کو نظرانداز کر کے اسلامی اقدار و روایات سے انحراف کرتی ہے' فقہ حنفی کی تائید حاصل ہے اور وہ اس کے حق میں فیصلہ کر دیتے ہیں' حالانکہ اس میں کفو کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہوتا ہے۔ جو اس کے جواز کی بنیادی شرط ہے' کیونکہ اگر کفو کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے لڑکی شادی کرے' تو والدین بالعموم اس سے اتفاق نہ کرنے کے باوجود قبول یا گوارا کر لیتے ہیں۔ اس قسم کی شادیوں میں جتنے بھی کیس عدالتوں میں جاتے ہیں وہ سب ایسے ہی ہوتے ہیں کہ والدین کے نزدیک لڑکی ایسی جگہ شادی کر لیتی ہے یا کرنے پر مصر ہوتی ہے۔ جس میں لڑکی کے ولی اور اہل خاندان عار محسوس کرتے ہیں' لیکن بدقسمتی سے عدالتیں لڑکیوں کے حق میں فیصلہ دے دیتی ہیں۔ علمائے احناف سے پوچھا جاتا ہے' تو وہ بھی مذکورہ شرط کو نظرانداز کر کے اس کے جواز کا فتویٰ دے دیتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ فیصلے اور فتوے شریعت اسلامیہ کی نصوص کے بھی خلاف ہیں اور امام ابوحنیفہ کے مسلک کے بھی خلاف۔ علاوہ ازیں ان سے وہ خاندانی روایات شکست و ریخت کا شکار ہو رہی ہیں جو ایک اسلامی معاشرے کی امتیازی خصوصیات کے طور پر صدیوں سے قائم چلی آ رہی ہیں اور ان کی جگہ مغربی معاشرے کی وہ روایات فروغ پا رہی ہیں جن میں حیاء و عفت کا کوئی تصور نہیں ہے اور اس حیا باختہ تہذیب نے وہاں ان کے خاندانی نظام کو تباہ کر دیا ہے۔

بہرحال "کفو" کی شرط کی موجودگی میں امام ابوحنیفہ کا مسلک دوسرے ائمہ سے زیادہ مختلف نہیں رہتا' کیونکہ کفو کی شرط کا مفاد یہ ہے کہ نکاح میں لڑکی اور اس کے ولی دونوں

کی رضا کا اکٹھا ہونا ضروری ہے' کیونکہ اگر ولی لڑکی کی رضامندی کو نظرانداز کرے گا' تو لڑکی کو انکار کرنے کا حق ہے اور اگر لڑکی ولی کی رضامندی کو اہمیت نہیں دے گی تو ولی کو حقِ استرداد حاصل ہے اور یہی مسلک دوسرے ائمہ کا بھی ہے اور نصوص شریعت کا اقتضاء بھی یہی ہے۔ خود نبی کریم ﷺ نے لڑکی کی رضامندی کے بغیر اس کی شادی کرنے سے منع فرمایا ہے اور اگر ولی نے لڑکی کی رضامندی کو نظرانداز کر کے لڑکی کی شادی کر دی ہے تو ہمارے پیغمبر نے لڑکی کو فسخ نکاح کا حق عطا کیا ہے (یہ تمام چیزیں احادیث میں موجود ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں' اس لیے صرف حوالے پر اکتفاء کیا جا رہا ہے۔)

اس لیے مسئلہ یہ نہیں ہے کہ دوسرے ائمہ لڑکی پر جبر کے قائل ہیں اور امام ابو حنیفہ جبر کے قائل نہیں ہیں۔ یہ زندگی بھر کا مسئلہ ہے' اسے جبر کے ذریعے سے حل نہیں کیا جا سکتا' چنانچہ کوئی بھی مکتب فکر جبر کا قائل نہیں ہے۔ سب کے نزدیک دونوں کی رضامندی ضروری ہے۔ شریعت نہ صرف یہ کہتی ہے کہ نوجوان لڑکی' زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ نہیں ہوتی' علاوہ ازیں جوانی کے جذبات اور جوش میں وہ غلط فیصلہ کر سکتی ہے اس لیے ولی کی اجازت اور رضامندی کے بغیر وہ شادی کرنے کا اقدام نہ کرے' اور یہ واقعہ ہے کہ چند بدقماش اور خود غرض افراد کو چھوڑ کر' والدین سے بڑھ کر دنیا میں اولاد کا اور بالخصوص لڑکیوں کا کوئی خیر خواہ نہیں۔ ہر والد اپنی بچی کے لیے بہتر سے بہتر اور موزوں سے موزوں تر رشتے کا خواہش مند ہی نہیں ہوتا' اس کے لیے بھرپور کوشش بھی کرتا ہے اور استثنائی صورتوں میں جہاں ولی کی طرف سے ظلم و جور کا ارتکاب ہو' وہاں شریعت نے خود لڑکی کو عدالت یا پنچائت کے ذریعے سے داد رسی کی اجازت دی ہے۔ اس قسم کے استثنائی کیسوں میں یقیناً لڑکی کے حق میں فیصلہ دیا جا سکتا ہے اور دیا جانا چاہیے' لیکن جہاں ظلم و جبر کا کوئی پہلو نہ ہو' وہاں صرف اس بنیاد پر لڑکی کے حق میں فیصلہ دینا کہ لڑکی عاقل بالغ ہے' یکسر غلط ہے جو اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے اور تمام ائمہ دین کی بھی رائے کے خلاف ہے۔ لڑکیوں کی آزاد روی اور بے راہ روی کی تائید بہت خطرناک ہے۔

مرد کو اللہ تعالیٰ نے قوّام بنایا ہے جس کے معنی ہیں حاکم اور نگران۔ مرد عورت کے

مقابلے میں گھر کا سربراہ اور اس کا محافظ و نگران ہے۔ اس برتری اور ایک گونہ نضیلت کی دو وجہ بیان کی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ نے مرد کو عورت کے مقابلے میں زیادہ عقل و فہم اور زیادہ جسمانی قوت و طاقت عطا کی ہے۔ دوسری' یہ کہ کسب معاش کا ذمے دار صرف اور صرف مرد ہے۔ ہر چھوٹے بڑے ادارے کے حسن انتظام کے لیے ایک سربراہ' منتظم اعلیٰ اور محافظ و نگران کا وجود ضروری ہے' اس کے بغیر کوئی ادارہ قائم ہو سکتا ہے اور نہ باقی ہی رہ سکتا ہے۔ اس اعتبار سے گھر کی سربراہی اللہ تعالیٰ نے مذکورہ دو امتیازی خوبیوں کی وجہ سے' مرد کو عطا کی ہے جو فطری طور پر اسے حاصل ہے۔ اس کو تسلیم کیے بغیر گھر کا نظام صحیح طریقے سے نہیں چل سکتا۔

جب میاں بیوی میں سے حاکمیت و قوّامیت مرد کو حاصل ہے تو اولاد پر بھی حاکمیت کا فطری حق مرد ہی کو حاصل ہے۔ اولاد کے مقابلے میں مرد کے حقِ حاکمیت کا نام قوّامیت کی بجائے ولایت ہے۔ جس طرح قوّامیت کے لغوی مفہوم تک میں بھی حاکمیت کا مفہوم شامل ہے۔ اسی طرح ولایت کے دو لغوی معنی ہیں۔ ایک محبت و نصرت اور دوسرے سلطنت و قدرت۔ ان دونوں مفہوموں کے اعتبار سے ولی کو اولاد پر ہر طرح فوقیت حاصل ہے۔ ولی کو اولاد سے محبت بھی ہوتی ہے اور اس کے اندر اس کی مدد اور اس کے حقوق و مفادات کی حفاظت کا جذبہ بھی۔ علاوہ ازیں اس کو اولاد پر غلبہ و تسلّط بھی حاصل ہے۔ ایک تو فطری طور پر ہی' جیسا کہ ابھی وضاحت گزری۔ دوسرے' باپ کی شفقت و رعایت اور اس کے مالی اور دیگر ہر قسم کے تعاون ہی سے اولاد نشوونما پاتی اور پروان چڑھتی ہے۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ اولاد جوان ہونے کے بعد ولی پر فائق اور برتر ہو جائے؟ یہ فطرت کے بھی خلاف ہے اور جذبۂ ممنونیت و احساسِ تشکر کے بھی برعکس۔ اس لیے منشائے شریعت بھی یہی ہے اور تقاضائے انصاف بھی کہ ولی کا حق ہر لحاظ سے غالب اور مقدم رہے اور ولی اور اولاد میں اختلاف کی صورت میں صرف اولاد کی بلوغت کو دیکھ کر ولی کی ولایت کو نظرانداز کر دینا روح شریعت کے بھی خلاف ہے اور انصاف کے تقاضوں سے بھی انحراف۔ ہاں! اگر ولی اپنے حقِ ولایت کو غلط استعمال کرے اور جبر کے ذریعے سے ظلم و زیادتی کا ارتکاب

کرے' تو اور بات ہے۔ اس قسم کی صورتوں میں خود شریعت نے بھی دوسرے لوگوں کو مداخلت کر کے انصاف کا اہتمام کرنے کی تاکید کی ہے۔ فقہی اصطلاح میں ایسے غیر مشفق باپ کو "ولیٔ عاضل" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کی ولایت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا ہے۔ اس صورت میں چچا' تایا وغیرہ ولی قرار پائیں گے یا پھر وقت کا امام' قاضی اور حاکم۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب "مفرور لڑکیوں کا نکاح اور ہماری عدالتیں' مسئلہ ولایت نکاح کا تحقیقی جائزہ" مطبوعہ دارالسلام' لاہور۔)

حالات کی تبدیلی سے اجتہادی احکام تبدیل ہو سکتے ہیں نہ کہ منصوص احکام: بعض لوگ کہتے ہیں کہ اب حالات بدل گئے ہیں اور معاشرے میں سماجی' سیاسی اور قانونی لحاظ سے عورت کی حیثیت پہلے سے مختلف ہو چکی ہے' للٰذا عورتوں کے حوالے سے نصوص اسلامی کی نئی تشریح یا دوسرے لفظوں میں عورتوں سے متعلق اجتہادی قوانین پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ (نوائے وقت' لاہور' ۲ مئی ۱۹۹۶ء میں شائع شدہ ایک اسلامی دانش ور کے مضمون سے اقتباس)

لیکن ہم عرض کریں گے کہ ایسے اہل علم و فکر اور اصحاب دانش و بینش' یا تو مغربی افکار سے متاثر ہیں' یا ذہنی تضاد کا شکار ہیں۔ ایک طرف یہ حضرات ائمہ کے مسالک اور ان کے دلائل بھی نقل فرماتے ہیں اور دوسری طرف انہیں ان کا اجتہاد قرار دے کر ان میں تبدیلی کا مشورہ بھی دیتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اجتہادی مسائل' ابدی نہیں ہیں' ان میں حالات و ظروف کے مطابق تغیر و تبدل کے تمام علماء قائل ہیں' لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ عورتوں سے متعلقہ احکام و مسائل اجتہادی ہیں' یا نصوص شریعت پر مبنی؟ اجتہادی مسئلہ تو وہ ہوتا ہے جس کی بابت قرآن کریم یا حدیث رسول ﷺ میں کوئی نص نہ ہو اور علماء نے اس سے ملتے جلتے کسی مسئلے پر قیاس کر کے اس کے جواز یا عدم جواز کا حکم اخذ کیا ہو۔ کیا خیارِ بلوغ' یا عاقل بالغ لڑکی کے ولی کی اجازت کے بغیر از خود شادی کر لینے' یا حجاب وغیرہ کے مسائل اجتہادی ہیں' یا نصوص پر مبنی؟ اگر یہ فقہاء کے اجتہادی مسائل ہیں پھر تو یقیناً ان میں حالات کے مطابق تبدیلی کا مشورہ صحیح ہے اور اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں

ہے' کیونکہ خود یہ حضرات بھی ائمہ کے دلائل نقل فرماتے ہیں جو نصوص قرآن و حدیث پر مبنی ہیں نہ کہ وہ اجتہادی اقوال و آراء ہیں تو پھر ان مسائل میں تبدیلی کا مشورہ مغرب زدہ متجد دین کی ہم نوائی کے سوا کیا ہے؟ جو تغیر حالات کے نام پر ساری شریعت ہی کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ حضرات بھی نصوص میں تبدیلی کے قائل ہیں؟ اگر نہیں ہیں تو پھر ان حضرات کی طرف سے اس قسم کا مشورہ ان کے فکری تضاد ہی کا غماز کہلائے گا۔

ان کی ایک دلیل ان کا یہ کہنا بھی ہے کہ مدینہ اور حجاز کا معاشرہ بدوی تھا اور وہاں دوسری تہذیبوں کے اثرات کم تھے۔ یہ وہی بات ہے جو متجد دین بھی کہتے ہیں اور وہ اس حوالے سے عورت کو مغرب کی طرح مادر پدر آزادی دینا چاہتے ہیں اور اسلامی احکام میں ایسی ترمیم و اصلاح کرنا پسند کرتے ہیں جس سے اسلامی تہذیب کی خصوصیات ختم اور مغرب کی حیا باختہ تہذیب کا جواز ثابت ہو جائے۔ حالانکہ اسلام ایک ابدی مذہب ہے اس کے ساتھ ہی نبوت کا خاتمہ بھی کر دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام ایک عالم گیر مذہب ہے' کسی مخصوص علاقے اور ملک کے لیے نہیں ہے اور قیامت تک کے لیے ہے' کسی محدود دور کے لیے نہیں ہے۔ جب ایسا ہے تو اسلامی تعلیمات کے بارے میں یہ کہنا کہ عرب کا معاشرہ بدوی تھا اور ان تعلیمات و احکام میں اس وقت کے معاشرے اور حالات کو ملحوظ رکھا گیا ہے' یہ کہاں تک صحیح ہے؟ اگر ایسا ہے تو اسلام کی عالم گیریت اور اس کا قیامت تک کے لیے ہونے کا اثبات کیوں کر ہو سکتا ہے؟ پھر تو اسلام کو ایک مخصوص علاقے اور محدود دور کے لیے تسلیم کرنا پڑے گا۔

اس لیے جدید مفکرین اور دانش وران عصر کا یہ دعویٰ کہ مدینہ و حجاز کا معاشرہ بدوی تھا' یکسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے احکام کسی معاشرے کے مطابق اور اس کی رعایت میں نازل نہیں فرمائے ہیں' بلکہ انسانی فطرت کے مطابق اتارے ہیں' جس میں کوئی تبدیلی جغرافیائی اعتبار سے آ سکتی ہے نہ لیل و نہار کی کسی گردش سے' یعنی زمان و مکان اور اس کی تبدیلیوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ انسان کسی بھی علاقے اور ملک سے تعلق رکھتا ہو اور قیامت تک کسی بھی زمانے میں وہ وجود پذیر ہو۔ اسلامی احکام و تعلیمات اس کے

لیے مینارۂ نور، مشعل ہدایت اور ضابطہ حیات ہے۔ اس سے انحراف میں اس کے لیے گمراہی، تاریکی اور بربادی ہے۔ امن و سکون اور نجات نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسلامی احکام قیامت تک کے لیے نازل کیے ہیں، انسانی فطرت سے بھی وہ آگاہ ہے، بلکہ صرف وہی آگاہ ہے، کیونکہ وہی انسان کا خالق ہے، اس لیے ہر دور کے انسان کی نجات، چاہے وہ ترقی کر کے چاند پر پہنچ جائے، احکام الٰہی کی پیروی ہی میں ہے۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا نہ کوئی مجاز ہے اور نہ اس سے اصلاح ہی ممکن ہے۔ اس میں اصلاح و ترمیم ایسے ہی ہے جیسے کسی طبیب حاذق کے نسخے میں کوئی عطائی نیم حکیم اپنی طرف سے، بزعم خویش، اسے بہتر بنانے کے لیے رد و بدل کر دے۔

مغرب کی کامیابی، لادینیت کا نہیں، مسلسل عمل اور علم و ہنر کا نتیجہ ہے: ہمیں یہ دیکھ کر کہ مغرب میں عورت، مرد کے دوش بدوش ہر کام میں حصہ لے رہی ہے، اس پر پردے کی یا اپنی عصمت کے تحفظ کی کوئی پابندی نہیں ہے، وہ ہر معاملے میں خود مختار ہے، والدین کا اس پر کوئی دباؤ ہے نہ خاوند کا کوئی اثر اور نہ خاندان کا کوئی نظام۔ وہ والدین کی موجودگی میں بھی اپنے رفیق حیات کے انتخاب میں آزاد ہے اور عقد نکاح میں بندھنے کے باوجود صرف اپنے شوہر کے ساتھ ہی وابستہ رہنے کی پابند نہیں۔ وہ ایک مرد کی بیوی ہونے کے باوصف کئی مردوں سے دوستانہ تعلق قائم کر سکتی اور رکھ سکتی ہے۔ مغرب میں عورت کی یہ آزادی دیکھ کر بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ مغرب کی ترقی کا راز اسی نظریۂ مساوات مرد و زن میں مضمر ہے۔ اس کی خیرہ کن اور محیر العقول ایجادات کی وجہ عورت کی بے پردگی اور اس کی اخلاق باختگی ہے اور مادّی آسائشوں اور سہولتوں کی فراوانی، ہر قسم کی پابندی سے آزادی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے وہ مشورہ دیتے ہیں کہ اب معاشرہ بہت بدل گیا ہے۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ ہمیں بھی مغرب کی طرح عورت کو کچھ نہ کچھ آزادی دینی چاہیے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مغرب کی ترقی لادینیت اختیار کرنے اور عورت کو گھر سے باہر نکال کر بے پردہ کر دینے کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس کی پشت پر اصل چیز ان کی منصوبہ بندی اور اس پر عمل، علم و ہنر کا حصول اور اس کا صحیح استعمال، نظم و ضبط اور قانون

کی پابندی وغیرہ' خوبیاں ہیں۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ' جنھوں نے خود مغرب میں رہ کر ہر چیز کا مشاہدہ کیا تھا' یورپ کی ترقی پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقص دخترانِ بے حجاب
نے ز سحرِ ساحرانِ لالہ رُو است
نے زعریاں ساق و نے از قطع مُو است
محکمیٔ او نہ از لادینی است
نے فروغش از خطِّ لا طینی است
قوتِ افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است
حکمت از قطع و بریدِ جامہ نیست
مانع علم و ہنر عمامہ نیست

بہر حال عورت کے بارے میں اسلام نے جو کچھ بھی احکام دیے ہیں' اس سے ایک تو اسلام کے تصور حیاء و عفت کا تحفظ مقصود ہے۔ مغرب نے عورت کی عفت و تقدس کی رداء کو تار تار کر کے پھینک دیا ہے' اس لیے اس کی حفاظت کی ان کے ہاں کوئی اہمیت باقی نہیں رہی ہے۔ دوسرا مقصد' اسلام کا عورت کی صنفی مجبوریوں اور اس کی فطری استعداد و صلاحیت کا احترام و رعایت ہے۔ اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ مرد اور عورت دونوں کا مقصد تخلیق ایک دوسرے سے جدا ہے اور اسی اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے دونوں کی فطری صلاحیتوں اور قوت عمل میں بھی فرق رکھا ہے۔ شریعت اسلامیہ نے اسی لیے دونوں کا دائرہ کار بھی ایک دوسرے سے الگ رکھا ہے۔ ایک کا دائرہ عمل گھر کی چار دیواری ہے' وہاں خانگی امور ہیں' بچوں کی نگرانی اور دیکھ بھال ہے' خاوند کی خدمت و اطاعت ہے۔ دوسرے کا دائرہ عمل گھر سے باہر ہے' وہ محنت مزدوری کرے یا ملازمت' کھیتی باڑی کرے یا تجارت' کسب معاش اسی کی ذمے واری ہے۔ عورت صرف گھر کی ملکہ ہے' اس کا کام

سڑکوں کی خاک چھانتا نہیں ہے' ملازمت کے لیے دربدر کی ٹھوکریں کھانا نہیں ہے' غیروں کی ناز برداری یا اپنے ناز و ادا سے ان کا دل بہلانا نہیں ہے۔

اس لیے ہمارا پختہ ایمان ہے کہ دیگر تعلیمات کی طرح' عورت کے بارے میں بھی اسلام کا ایک ایک حکم حکمت بالغہ پر مبنی ہے اور انسانی معاشروں کی اصلاح اور انسانیت کی فلاح و بہبود ان احکام کی پابندی ہی میں منحصر ہے۔ ان سے انحراف میں فساد اور بربادی ہی بربادی ہے ان سے صرف نظر' یا گریز و اعراض کر کے کوئی معاشرہ حقیقی فلاح اور امن و سکون سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا' بنابریں اس کے کسی حکم میں حالات و زمانے کے اعتبار سے ترمیم اور حک و اضافہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ اس ذات کے نازل کردہ ہیں جو "عَالِمِ مَا کَانَ وَمَا یَکُون" ہے' جو ماضی اور حاضر و مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات سے باخبر ہے۔

-- ۸ --

تعدُّدِ ازدواج اور اس کی حکمتیں

عورت کے امتیازی مسائل میں ایک مسئلہ تعدُّدِ ازدواج کا بھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مرد بیک وقت ایک سے زیادہ (چار تک) بیویاں رکھ سکتا ہے' جب کہ عورت ایک مرد سے زیادہ تعلق زوجیت قائم نہیں کر سکتی۔ یہ مسئلہ قرآن و حدیث کی نصوص سے ثابت ہے جس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا ﴿٣﴾ ﴾ (النساء٤/ ٣)

"اگر تم اس بات سے ڈرو کہ تم یتیم لڑکیوں سے (نکاح کر کے) انصاف نہیں کر سکو گے' تو تم دوسری عورتوں سے' جو تمہیں زیادہ پسند ہوں' نکاح کر لو' دو دو' تین تین اور چار چار سے' تاہم اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم (ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی صورت میں ان کے مابین) انصاف (عدل) نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی عورت سے نکاح کرو' یا (ان سے استمتاع کرو) جس کے مالک تمہارے دائیں ہاتھ ہیں۔ یہ زیادہ قریب ہے اس بات کے کہ تم ناانصافی نہ کرو۔"

اس آیت سے بیک وقت چار عورتوں تک شادی کرنے کی اجازت ثابت ہوتی ہے۔

اس آیت کی تفسیر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس طرح مروی ہے کہ صاحب حیثیت اور صاحب جمال یتیم لڑکی کسی ولی کے زیر پرورش ہوتی تو وہ اس کے مال اور حسن و جمال کی وجہ سے اس سے شادی تو کر لیتا لیکن اس کو دوسری عورتوں کی طرح اس کا پورا حق مہر نہ دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس ظلم سے روکا' کہ اگر تم گھر کی یتیم بچیوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے تو تم ان سے نکاح ہی مت کرو' تمہارے لیے دوسری عورتوں سے نکاح کرنے کا راستہ

کھلا ہے۔ (صحیح البخاری' التفسیر' باب ﴿ وان خفتم الا تقسطوا فی الیتٰمٰی ﴾)

بلکہ ایک کی بجائے دو سے تین سے حتی کہ چار عورتوں تک سے تم نکاح کر سکتے ہو' بشرطیکہ ان کے درمیان انصاف کے تقاضے پورے کر سکو۔ ورنہ ایک ہی سے نکاح کرو یا اس کی بجائے لونڈی پر گزارا کرو۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان مرد (اگر وہ ضرورت مند ہے اور بیویوں کے درمیان عدل و انصاف کا اہتمام بھی کر سکتا ہے) تو چار عورتیں بیک وقت اپنے نکاح میں رکھ سکتا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ نہیں' جیسا کہ صحیح احادیث میں اس کی مزید صراحت اور تحدید کر دی گئی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے جو چار سے زائد شادیاں کیں وہ آپ کے خصائص میں سے ہے جس پر کسی امتی کے لیے عمل کرنا جائز نہیں۔ (ابن کثیر) تاہم اس کی اجازت کے ساتھ یہ بھی واضح کر دیا کہ عافیت ایک ہی عورت سے شادی کرنے میں ہے' کیونکہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی صورت میں انصاف کا اہتمام بہت مشکل ہے جس کی طرف قلبی میلان زیادہ ہوگا' ضروریات زندگی کی فراہمی میں زیادہ توجہ بھی اسی کی طرف ہوگی۔ یوں بیویوں کے درمیان وہ انصاف کرنے میں ناکام رہے گا اور اللہ کے ہاں مجرم قرار پائے گا۔ قرآن نے اس حقیقت کو دوسرے مقام پر نہایت بلیغانہ انداز میں اس طرح بیان فرمایا:

﴿ وَلَن تَسْتَطِيعُوٓاْ أَن تَعْدِلُواْ بَيْنَ ٱلنِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ ۖ فَلَا تَمِيلُواْ كُلَّ ٱلْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَٱلْمُعَلَّقَةِ ۚ﴾ (النساء٤/ ١٢٩)

''اور تم ہرگز اس بات کی طاقت نہ رکھو گے کہ بیویوں کے درمیان انصاف کر سکو' اگرچہ تم حرص رکھو۔ (اس لیے یہ تو ضرور کرو) کہ ایک ہی طرف نہ جھک جاؤ کہ چھوڑ دو تم اس دوسری عورت کو مانند درمیان میں لٹکی ہوئی (عورت) کے۔''

یہ دوسری آیت بھی ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت میں نص صریح ہے' اس لیے کہ یہاں بھی اللہ نے متعدد بیویوں کے درمیان انصاف کرنے کو نہایت مشکل عمل بتلایا ہے' لیکن اس کے باوجود اس اجازت کو ختم نہیں فرمایا' بلکہ کسی بیوی کو یکسر نظرانداز کرنے سے منع فرمایا ہے اور یہ تاکید کی ہے کہ اگر قلبی میلان میں تم خواہش رکھنے کے باوجود

عدل نہیں کر سکتے' تو تم باری مقرر کرنے اور نان و نفقہ اور دیگر ضروریات مہیا کرنے میں تو عدل کرو اور کسی ایک بیوی کو بالکل فراموش نہ کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک سے زیادہ شادی ناگزیر ضرورت کے بغیر کرنا نامناسب اور نہایت خطرناک ہے' تاہم عندالضرورت اس کے جواز میں کوئی شک نہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم کی دونوں آیات سے واضح ہے۔

اور پہلی آیت سے استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ آیت میں عدد کے تینوں کلمات عدل اور وصف کی بنیاد پر غیر منصرف ہیں۔ گویا یہ معدول ہیں۔ یہ کس سے معدول ہیں؟ یہ معدول (پھرے ہوئے) ہیں اِثْنَيْنِ' ثَلَاثَة اور اَرْبَعَة سے۔ اور ان میں سے ہر ایک اپنی نوع کی تکرار پر دلالت کرتا ہے۔ پس "مثنٰی" اِثْنَيْنِ اِثْنَيْنِ "ثُلَاث" ثلاثة ثلاثة اور "رُبَاع" اربعة اربعة ' پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے کہا جائے جَآءَنِی الْقَوْمُ مَثْنٰی اَو ثُلَاثَ اَو رُبَاعَ ' تو اس کے معنی ہوں گے' میرے پاس قوم کے لوگ دو دو' یا تین تین یا چار چار کر کے آئے۔ یہ عربی زبان کا ایسا اسلوب ہے جس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اس اعتبار سے آیت میں یہاں ان الفاظ کا ترجمہ' دو دو' تین تین اور چار چار ہی ہو گا' جس سے بیک وقت ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرنے کا جواز اور چار سے زائد کا عدم جواز ثابت ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں آگے "فَوَاحِدَةً" سے بھی اس کی تائید ہو رہی ہے۔ یعنی اگر تم محسوس کرو کہ ایک سے زائد ۲' یا ۳' یا ۴ بیویوں کے درمیان تم انصاف نہیں کر سکو گے' تو پھر ایک ہی عورت سے نکاح کرو۔

اس تفسیر کی تائید احادیث صحیحہ سے ہو جاتی ہے۔ بعض صحابہ جب مسلمان ہوئے تو ان کے عقد میں چار سے زائد بیویاں تھیں' مثلاً قیس بن حارث کے نکاح میں آٹھ اور غیلان بن سلمہ ثقفی کے نکاح میں ۱۰ بیویاں تھیں۔ قبول اسلام کے بعد نبی ﷺ نے ان سے فرمایا:

«اِخْتَرْ مِنْهُنَّ أَرْبَعًا»(سنن أبي داود، الطلاق، باب في من أسلم وعنده نساء أكثر من أربع أو أختان، ح:٢٢٤١ وجامع الترمذي، النكاح، باب ماجاء في الرجل يسلم وعنده عشر نسوة، ح:١١٢٨ وسنن ابن ماجة، أيضا، ح:١٩٥٢، ١٩٥٣)

"ان میں سے چار کو پسند کر لو۔"

یعنی باقی کو طلاق دے کر اپنے حبالۂ عقد سے خارج کر دو۔ بہرحال قرآن و حدیث سے بیک وقت زیادہ سے زیادہ چار بیویاں رکھنا ثابت ہے' بشرطیکہ ان کے درمیان عدل و انصاف کا اہتمام کیا جا سکے اور بیویوں کے درمیان عدل کا مطلب یہ ہے کہ ان کی باریاں مقرر کرنے میں' انہیں خوراک' پوشاک' رہائش اور دیگر ضروریات مہیا کرنے میں مساوات برتے۔ یہ نہ کرے کہ جس کے ساتھ محبت اور تعلق خاطر زیادہ ہو' تو مادی ضروریات مہیا کرنے میں بھی اس کے ساتھ ترجیحی سلوک کرے۔ اگر ایسا کرے گا' تو یہ ظلم ہو گا! ایسے شخص کی بابت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا كَانَ عِنْدَ الرَّجُلِ امْرَأَتَانِ، فَلَمْ يَعْدِلْ بَيْنَهُمَا، جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَشِقُّهُ سَاقِطٌ»(جامع الترمذي، النكاح، باب ماجاء في التسوية بين الضرائر، ح:١١٤١)

"جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان کے درمیان عدل نہ کرے' تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے جسم کا ایک حصہ (یعنی نصف) ساقط ہو گا۔"

<u>تعدّدِ ازدواج کی حکمتیں</u>: مذکورہ تفصیل سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو یہ اجازت دی ہے کہ اگر وہ ایک سے زیادہ بیوی کی ضرورت محسوس کرتا ہے' تو عدل و انصاف مہیا کرنے کے ساتھ وہ بیک وقت چار تک بیویاں رکھ سکتا ہے اور یہ صرف اجازت ہے جس سے بوقت ضرورت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے' ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کا حکم یہ نہیں ہے کہ جس پر عمل کرنے کی ہر مسلمان کوشش کرے۔

اجازت اور حکم کے فرق کو نظرانداز کر کے بعض لوگ اسلام کی اس نہایت اہم اجازت پر بڑی نکتہ چینی کرتے ہیں' حالانکہ یہ اجازت اسلام کی عظیم خوبیوں میں سے ایک نہایت عظیم خوبی ہے' کیونکہ بعض دفعہ مرد کے لیے ایک سے زیادہ بیوی ناگزیر ہو جاتی ہے اور بعض دفعہ کچھ اور مصلحتیں اس کی متقاضی ہوتی ہیں۔ اس لیے جہاں کوئی ضرورت یا مصلحت ہو' وہاں دوسری' تیسری اور چوتھی شادی کرنا جائز ہو گا۔ اس کی چند حکمتیں اور مصلحتیں' جو علماء نے بیان فرمائی ہیں' حسب ذیل ہیں۔

1 نکاح کا مقصد جہاں جنسی خواہش کی تسکین ہے' وہاں دوسرا مقصد اولاد کا حصول بھی ہے۔ اسی لیے نبیٔ کریم ﷺ نے اس شخص کو' جو ایک ایسی عورت سے شادی کرنا چاہتا تھا جو صاحب جمال بھی تھی اور صاحب حسب بھی' لیکن اس سے اولاد کی امید نہیں تھی۔ آپ نے اس عورت سے شادی کرنے کی اجازت مرحمت نہیں فرمائی۔ وہ دوسری مرتبہ آیا تب بھی اجازت نہیں دی' تیسری مرتبہ جب وہ اسی عورت سے شادی کرنے کے لیے اجازت طلب کرنے آیا تو نبی ﷺ نے فرمایا:

«تَـزَوَّجُوا الْوَدُودَ الْوَلُودَ فَإِنِّي مُكَاثِرٌ بِكُمُ الأُمَمَ»(سنن أبي داود، النكاح، باب النهي عن تزويج من لم يلد من النساء، ح:٢٠٥٠)

''تم زیادہ محبت کرنے والی اور زیادہ بچے جننے والی عورت سے شادی کرو' اس لیے کہ میں تمہاری وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔''

خوب محبت کرنے والی بیوی سے انسان کو تسکین اور زیادہ بچے جننے والی بیوی سے اولاد حاصل ہوتی ہے اور یہ دونوں ہی خواہشیں فطری ہیں۔ جنسی جذبات بھی انسان کی فطرت کا ایک حصہ ہیں اور انسان محنت اور جدوجہد کر کے مال و دولت حاصل کرتا اور جائیداد بناتا ہے تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے ترکے کا کوئی وارث بھی ہو' یہ خواہش بھی جائز اور فطری ہے' لیکن بعض دفعہ ایک مرد جس عورت سے شادی کرتا ہے' وہ بانجھ ہوتی ہے اور مرد کا وارث پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم۔ حتی کہ ہر طرح کا علاج کرنے کے باوجود عورت کا بانجھ پن ختم نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں مرد کے لیے دو راستے ہیں۔

① وہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر اپنے گھر سے رخصت کر دے اور اسے حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔

② یا اس کے ساتھ ساتھ ایک اور شادی کر لے تاکہ اس کی پہلی بیوی کی زندگی بھی برباد نہ ہو اور اس کی اولاد کی خواہش بھی پوری ہو جائے۔ دوسری بیوی سے بھی یہ خواہش پوری نہ ہو' تو وسائل' طاقت اور انصاف کی شرط کے ساتھ وہ چار تک شادیاں کر سکتا ہے۔

اب بتلایا جائے کہ پہلا راستہ بہتر ہے جس میں ایک جوان عورت بے سہارا بھی ہو جاتی

ہے اور جنسی خواہش کی تسکین کے جائز طریقے سے محروم بھی اور اس کے بانجھ پن کی وجہ سے اس کی دوبارہ شادی کے امکانات بھی بہت کم ہوتے ہیں؟ یا دوسرا راستہ بہتر ہے' جس میں پہلی بیوی مذکورہ دونوں خرابیوں سے محفوظ رہتی ہے؟

علاوہ ازیں اس صورت میں اسلام نے مرد کو دوسری شادی کی اجازت دے کر عورت پر ظلم کیا ہے' یا اس کی عزت و وقار کا تحفظ؟ ہر سمجھ دار آدمی کا جواب یہی ہو گا کہ دوسرا راستہ ہی ہر لحاظ سے بہتر اور عورت کی عزت و وقار کا محافظ ہے۔

2 اسی طرح بعض دفعہ عورت بیمار اور مرد کی جنسی خواہش پوری کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوتی ہے۔ اس صورت میں بھی مرد کے لیے مذکورہ دو راستوں میں سے کوئی ایک راستہ اختیار کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے یہاں بھی عورت کے لیے دوسرا راستہ ہی بہتر ہے' کیونکہ وہ بے سہارا اور بے مرد ہونے سے بچ جائے گی۔

3 بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ معاشرے میں عورتوں کی کثرت اور مردوں کی قلت ہو جاتی ہے' بالخصوص جنگوں میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ اب یک زوجگی پر اصرار کر کے بے حیائی کا راستہ کھولنا صحیح ہو گا' یا متعدد شادیوں کی اجازت دے کر بے حیائی کے راستے کو مسدود کر دینا؟

اسلام نے یہاں بھی دوسرا راستہ اختیار کر کے عورتوں کی کفالت کا آبرو مندانہ انتظام بھی کیا ہے اور ان کی عزت و عصمت کے تحفظ کا اہتمام بھی۔

4 بعض مرد ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے اندر جنسی خواہش اور قوت زیادہ ہوتی ہے' ایک عورت سے ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی' بالخصوص ماہواری کے ایام میں' جب کہ عورت سے ہم بستری شرعاً ممنوع ہے' ایسے مردوں کے لیے بدکاری کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ شریعت نے ایسے لوگوں کو چار تک بیویاں رکھنے کی اجازت دے کر بدکاری کا راستہ بند کر دیا ہے۔

مغرب میں ایک سے زیادہ شادی کرنا قانوناً ممنوع ہے' تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں مذکورہ قسم کے مردوں نے بغیر شادی کیے کئی کئی عورتوں سے جنسی تعلقات قائم کر رکھے

ہیں اور یوں بے حیائی اور بدکاری وہاں عام ہے۔ کیا ایسے مردوں کے لیے ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت معقول راستہ ہے جس میں وہ تعلقات زوجیت کے نتائج و اثرات کا ذمے دار ہوتا ہے' یا حرام کاری کا راستہ معقول ہے جس میں مرد صرف جنسی خواہش کی تکمیل تو کرلیتا ہے' لیکن اس کے نتائج کا ذمے دار نہیں ہوتا؟ ظاہر بات ہے کہ سمجھ دار آدمی پہلے ہی راستے کو معقول قرار دے گا' جس سے معاشرے میں جنسی انارکی پھیلتی ہے نہ حرام اولاد کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔

5 بعض دفعہ ایک عورت جوانی ہی میں بیوہ ہو جاتی ہے' ایسی صورت میں اس کے قریبی اعزہ کا اس کے ساتھ دوسری شادی کر کے اس کو سہارا مہیا کرنا' اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کرنا اور اس کے بچوں پر دست شفقت رکھنا زیادہ معقول راستہ ہے یا دوسری شادی پر قدغن عائد کر کے' بیوہ عورت اور اس کے معصوم بچوں کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا معقول راستہ ہے؟ یہاں بھی ہر معقول آدمی پہلے راستے ہی کو معقول قرار دے گا۔

بہرحال یہ اور اسی قسم کی دیگر مصلحتوں اور حکمتوں ہی کی وجہ سے اسلام نے دوسری' تیسری اور چوتھی شادی کی اجازت دی ہے۔ اسلام کے اس پُر حکمت نظام کی برکت ہے کہ

- مسلمان معاشروں میں بدکاری عام نہیں ہے۔
- وہاں حرام اولاد کا مسئلہ اتنا زیادہ نہیں ہے۔
- وہاں خاندانی نظام بہت حد تک ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ ہے۔
- اور حیاء و عفت کے تحفظ کا احساس عام اور جذبہ قوی ہے۔

اس کے برعکس مغربی معاشرے میں' جہاں ایک سے زیادہ شادی تو ممنوع ہے' لیکن مرد و عورت کو ایک دوسرے کے ساتھ دوستیاں قائم کرنے کی اجازت ہے' بدکاری عام ہے' حرام اولاد کی بہتات ہے' خاندانی نظام بکھر گیا ہے اور حیاء و عفت کا تصور ختم ہو گیا ہے۔ گویا ایک سے زیادہ عورتوں سے تعلق قائم کرنے اور ان سے "استمتاع" کرنے کی تو مغرب میں عام اجازت ہے' لیکن اس کے نتائج برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ عورت پر ظلم نہیں تو کیا ہے؟ اسلام اس ظلم کی بجائے یہ تلقین کرتا ہے کہ اگر تمہارا کسی

وجہ سے ایک عورت سے گزارا نہیں ہوتا' تو تم چار تک' ایک سے زیادہ' بیویاں رکھ سکتے ہو' لیکن اس کے جو تقاضے اور ذمے داریاں ہیں' انہیں بھی پورا کرنا ہو گا۔ یہ اجازت محض جنسی لذت و استمتاع ہی تک محدود نہیں ہے' بلکہ اس کے قانونی اور معاشرتی تقاضوں کی تکمیل بھی ضروری ہے۔

عورت بیک وقت ایک سے زیادہ مردوں سے نکاح نہیں کر سکتی: مرد کو تو اللہ تعالیٰ نے یہ اجازت دے دی ہے کہ وہ بیک وقت چار تک شادیاں کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس کی استطاعت رکھتا اور عدل و انصاف کے تقاضے پورے کر سکتا ہو' لیکن عورت کو یہ اجازت نہیں دی کہ وہ بیک وقت چار مردوں سے زوجیت کا تعلق استوار کر لے۔ اس میں عورت کی کمزوری کے علاوہ نسب کی حفاظت وغیرہ مقاصد بھی شامل ہیں۔ ہر شخص یہ بات سمجھتا اور تسلیم کرتا ہے کہ عورت مرد کے مقابلے میں کمزور ہے' اس لیے مرد تو بیک وقت ایک سے زیادہ بیویوں سے زوجیت کا تعلق قائم کر سکتا اور نبھا سکتا ہے۔ لیکن عورت (بالعموم) ایسا نہیں کر سکتی۔

علاوہ ازیں ایک عورت کے تین چار خاوند ہوں' تو ان کے درمیان رقیبانہ اور حریفانہ کشمکش رہے گی جو عورت کی زندگی کو اجیرن بنانے کے لیے کافی ہے۔ اس کا اندازہ ان واقعات سے بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے جو ان بے حیا عورتوں کے ساتھ پیش آتے رہتے ہیں جو بیک وقت کئی مردوں سے محبت اور آشنائی کے تعلقات قائم کر لیتی ہیں۔ وہ یا تو آپس میں ایک دوسرے کو قتل کر دیتے ہیں' کیونکہ محبوب کی محبت میں دوسروں کی شرکت ان کو گوارا نہیں ہوتی' یا کوئی آشنا اس محبوبہ کو ہی یہ کہہ کر موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے کہ یہ ہرجائی اور بے وفا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے مرد کی فطرت میں یہ بات رکھی ہے کہ وہ جس عورت سے محبت رکھتا ہے' اس میں وہ کسی اور کی شرکت برداشت نہیں کر سکتا۔ اس اعتبار سے عورت کی بابت اللہ کا یہ فیصلہ کہ وہ صرف ایک ہی مرد کی بیوی بن سکتی ہے' بیک وقت کئی مردوں کی نہیں' انسانی فطرت کے عین مطابق ہے اور اسی میں عورت کی عزت و وقار اور اس کی جان کا تحفظ ہے اور سب سے بڑھ کر نسب کے تحفظ کا مسئلہ ہے۔

اسلام میں تحفظ نسب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ شادی شدہ مرد یا عورت اگر زنا کا ارتکاب کرے' تو اسلام میں اس کی سزا رجم ہے۔ اتنی سخت سزا کیوں ہے؟ اسی لیے کہ شادی شدہ مرد و عورت کی زناکاری سے نسب کا معاملہ مشکوک ہو جاتا ہے۔ کنوارے زانی یا زانیہ کے عمل فاحشہ سے نسب کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا' اس لیے ان کی سزا بھی ہلکی یعنی سو کوڑے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ طلاق یافتہ عورت یا فوت شدہ خاوند کی بیوی عدت کے اندر کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کر سکتی۔ مطلقہ کی عدت ۳ حیض (یا ۳ مہینے) یا وضع حمل اور فوت شدہ خاوند کی بیوی کی عدت ۴ مہینے اور ۱۰ دن یا وضع حمل ہے۔

اس عدت کا مقصد بھی استبرائے رحم ہے' یعنی اس عدت سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے رحم میں اس کے خاوند کا نطفہ نہیں ہے اور وضع حمل سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس کے بعد ان عورتوں کو اجازت ہے کہ وہ نئی جگہ شادی کر لیں۔ اب سوچیں کہ اگر عورت کے دو' یا تین' یا چار خاوند ہوں تو اس عورت کو جو حمل ٹھہرے گا' وہ کس خاوند کا شمار ہو گا؟ اور ہونے والی اولاد کا باپ کون ہو گا؟ اگر وہ سارے ہی خاوند اولاد کی ذمے داری قبول کرنے سے گریزاں ہوں گے' تو ان میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرے گا کہ یہ اولاد میرے نطفے سے نہیں ہے اور اگر ان میں سے سارے ہی اولاد کے خواہاں ہوں گے' تو ہر ایک کہے گا کہ یہ ہونے والا بچہ میرے ملاپ کا نتیجہ ہے۔ کیا اس صورت میں قطعیت کے ساتھ بچے کی نسبت اُبُوّت کا مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے؟ اور کیا اسے حل کیے بغیر نسب کی حفاظت ممکن ہے جس کی اسلام میں بڑی تاکید ہے؟

بنابریں عورت کی بابت یہ امتیازی حکم کہ وہ مرد کی طرح ایک سے زیادہ خاوند نہیں کر سکتی' متعدد حکمتوں پر مبنی ہے۔ اس میں عورت کی فطری کمزوری کا بھی لحاظ ہے اور نسب کی حفاظت بھی پیش نظر' علاوہ ازیں حسن و جمال کی دنیا میں رقیبانہ و حریفانہ کشاکش کا خاتمہ بھی۔ اور یہ سب باتیں ایسی ہیں جن سے مقصود عورت کا تحفظ اور معاشرے کو بے حیائی سے بچانا ہے۔

❀ ❀ ❀

-- ۹ --

مرد کا حق طلاق اور اس کے آداب

مرد و عورت کے درمیان نکاح کا رشتہ قائم ہو جانے کے بعد اکثر مذاہب میں علیحدگی اور طلاق کا کوئی تصور نہیں ہے' حالانکہ بعض دفعہ جب دونوں کے مزاجوں میں موافقت اور ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکے تو طلاق اور علیحدگی ہی میں دونوں کی بھلائی ہوتی ہے' اس لیے اسلام نے مرد کو طلاق کا حق دیا ہے' تاہم اس حق کو آخری چارۂ کار کے طور پر استعمال کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ایک طرف مرد کو حق طلاق دیا ہے تو دوسری طرف اسے ایسی ہدایات بھی دی ہیں جنہیں اختیار کرنے سے عام طور پر طلاق تک نوبت ہی نہیں پہنچتی۔ لیکن عوام کی اکثریت چونکہ اسلامی تعلیمات کا صحیح شعور نہیں رکھتی' اس لیے معمولی تلخیاں بھی طلاق پر منتج ہوتی ہیں۔ بنابریں ضروری ہے کہ مرد ان ہدایات اور تعلیمات کا بھی صحیح شعور حاصل کریں جو اسلام نے بیوی کے ساتھ نباہ کرنے کے لیے دی اور بتلائی ہیں۔

۱۔ عورت کے ساتھ نباہ کرنے کا طریقہ: اس سلسلے میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن مجید میں پہلی ہدایت یہ فرمائی:

﴿وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ﴿١٩﴾﴾ (النساء٤/ ١٩)

''اور تم ان عورتوں کے ساتھ اچھے طریقے سے بود و باش رکھو' پس اگر تم انہیں ناپسند کرو' تو بہت ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس میں بہت بھلائی رکھ دے۔''

یعنی اپنے طور پر تم اپنی بیوی کو بعض وجوہ کی بنا پر ناپسند کرو' لیکن اس ناپسندیدگی کے باوجود اللہ تعالیٰ تمہیں اس سے اولاد صالح عطا فرما دے یا اس کی وجہ سے تمہارے کاروبار میں برکت ڈال دے' دونوں صورتوں میں تمہارے لیے بھلائی ہی بھلائی ہے۔ گویا اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ناپسندیدگی کے باوجود بیویوں سے حسن معاشرت اور نباہ کرنے کی تاکید فرمائی اور اسی بات کو نبی اکرم ﷺ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

«لاَ يَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً، إِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ»(صحيح مسلم، الرضاع، باب الوصية بالنساء، ح:١٤٦٧)

''کوئی مومن مرد (شوہر) کسی مومن عورت (بیوی) سے بغض نہ رکھے۔ اگر اسے اس کی کوئی عادت ناپسند ہے' تو اس کی دوسری عادت پسند بھی ہو گی۔''

مطلب یہ ہے کہ محض ناپسندیدگی کی وجہ سے بیوی کو طلاق نہ دو' بلکہ اس کے اندر جو دوسری خوبیاں ہیں انہیں سامنے رکھو۔ ایسا کرنے سے اس کی بعض ناپسندیدہ باتیں تمہارے لیے قابل برداشت ہو جائیں گی۔ بیوی کے ساتھ نباہ کرنے کا یہ کتنا بہترین نسخہ اور طریقہ ہے' کیونکہ کوئی کتنا بھی برا ہو' لیکن کچھ خوبیاں بھی اس کے اندر ضرور ہوتی ہیں۔ اگر انسان خوبیوں پر نظر زیادہ رکھے' تو کوتاہیوں اور خامیوں کو نظرانداز کرنا آسان ہو جاتا ہے اور یوں معاملہ زیادہ خراب نہیں ہوتا۔ کاش مرد اس ہدایت نبوی کو اپنے سامنے رکھیں۔

۲۔ **عورت کی ایک فطری کمزوری کا لحاظ رکھنے کی ہدایت:** اسی طرح ایک اور حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ، لَنْ تَسْتَقِيمَ لَكَ عَلٰى طَرِيقَةٍ، فَإِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا، اسْتَمْتَعْتَ بِهَا وَبِهَا عِوَجٌ، وَإِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهَا كَسَرْتَهَا، وَكَسْرُهَا طَلاَقُهَا»(صحيح مسلم، الرضاع، باب الوصية بالنساء، ح:١٤٦٦)

''عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے (اس لیے اس میں پسلی ہی کی طرح کجی ہے) وہ تیرے لیے کسی طریقے پر ہرگز سیدھی نہیں رہے گی' پس اگر تو اس سے (بطور

بیوی کے) فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو اسی کجی (کے برداشت کرنے) کے ساتھ فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اگر تو اسے سیدھا کرنا شروع کر دے گا تو اسے توڑ دے گا اور اس کا توڑنا اس کو طلاق دینا ہے۔"

یہ عورت کے ساتھ نباہ کرنے کی دوسری نبوی ہدایت ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت کے مزاج میں فطری طور پر کچھ کجی (یعنی کم عقلی اور ضدی پن) ہے۔ عورت کے اس مزاج کی وجہ سے بعض دفعہ گھر میں تلخی اور تناؤ پیدا ہو جاتا ہے' جو مرد حوصلہ مند' بردبار' قوت برداشت کا مالک اور عورت کے اس مزاج کو سمجھنے والا ہوتا ہے' وہ بردباری اور حوصلہ مندی کا مظاہرہ کر کے ایسا رویہ اختیار کرتا ہے جس سے تلخی میں اضافہ نہیں ہوتا اور اس طرح حالات پر قابو پالیتا ہے۔ لیکن جو لوگ اس کے برعکس اس نازک آبگینے (عورت) کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرتے اور اپنے طور پر یہ سوچتے ہیں کہ ہم اس کو سیدھا کر کے چھوڑیں گے تو وہ اس کو سیدھا کرنے میں تو ناکام رہتے ہیں (کیونکہ پیدائشی مزاج اور فطرت کو کوئی نہیں بدل سکتا) البتہ اپنا گھر اجاڑ لیتے ہیں' یعنی معاملہ طلاق تک پہنچ جاتا ہے اور جلدبازی میں طلاق دینا بھی بے حوصلہ اور بے صبر قسم ہی کے لوگوں کا شیوہ ہے۔

۳' ۴' ۵۔ وعظ و نصیحت' علیحدگی اور کچھ گوشمالی: مذکورہ ہدایات پر عمل کرنے کے باوجود گھر کا ماحول خوشگوار اور عورت کا برتاؤ صحیح نہ ہو' تو اللہ تعالیٰ نے مزید تین باتیں اختیار کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ وہ تین باتیں حسب ذیل ہیں:

﴿وَالَّٰتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا﴾ (النساء٤/ ٣٤)

"اور وہ عورتیں جن کی نافرمانی اور بددماغی سے تم ڈرو' تو انہیں وعظ و نصیحت کرو اور انہیں الگ بستروں میں چھوڑ دو اور انہیں مار کی سزا دو۔ پس اگر وہ تمہاری فرماں برواری اختیار کر لیں تو ان پر کوئی راستہ تلاش نہ کرو۔"

ان تین چیزوں کو جس ترتیب سے بیان کیا گیا ہے' یہ حالات و واقعات پر منحصر ہے کہ ان پر عمل اسی ترتیب سے ممکن ہے یا نہیں؟ بظاہر فطری ترتیب یہی ہے۔ جب کوئی

ناخوشگوار بات سامنے آتی ہے تو وعظ و نصیحت اور تلقین و ہدایت ہی سے اس کی اصلاح کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ کوشش کارگر ثابت نہیں ہوتی' تو مرد اپنی خفگی اور ناراضی کا اظہار بالعموم عورت سے میل جول اور بول چال منقطع کر کے ہی کرتا ہے' لیکن بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ترتیب بالکل الٹ جاتی ہے اور گوشمالی کی نوبت پہلے آ جاتی ہے۔ بہرحال یہ ترتیب ضروری نہیں ہے' ان ہدایات پر عمل کرنا ضروری ہے۔

تیسری بات پر عمل کرتے وقت بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ بعض لوگ اس مارنے کی اجازت کو نہایت بھونڈے اور وحشیانہ طریقے سے استعمال کر کے اسلام کو بدنام کرتے ہیں کہ اسلام نے عورتوں کو خوب مارنے پیٹنے کی اور ان پر ظلم کرنے کی اجازت دی ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے' اسلام میں کسی کے ساتھ بھی ظلم و زیادتی کی اجازت نہیں ہے۔ عورت تو انسان کی ہم سفر اور اس کی زندگی کی گاڑی کا دوسرا پہیہ ہے۔ اس کے بغیر انسان کی زندگی بے کیف بھی ہے اور پُرمشقت بھی۔ عورت اس کی زندگی میں لطف و سرور بھی پیدا کرتی ہے اور اس کی مشقتوں (گھریلو ذمے داریوں) کا بوجھ بھی اٹھاتی ہے۔ اس کو تھوڑا بہت مارنے کی اجازت کا مطلب' صرف پہیے کی اصلاح ہے' تاکہ زندگی کی گاڑی صحیح طریقے سے رواں دواں رہے۔ اسی لیے نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر مارنے کی ضرورت پیش آ ہی جائے تو ایسی ہلکی مار مارو کہ جس سے کوئی نشان نہ پڑے اور اسی طرح چہرے پر بھی نہ مارو۔ (سنن ابی داود' النکاح' بابٌ فی حق المرأۃ' حدیث: 2142)

۲۔ **حَکَمَین (دو ثالث) مقرر کرنے کی تلقین:** گھر کی چار دیواری کے اندر اپنے طور پر مذکورہ تینوں ہدایات پر عمل کرنے کے باوجود میاں بیوی کے درمیان تلخی اور کشیدگی دور نہ ہو' تو پھر آخری چارۂ کار کے طور پر اللہ تعالیٰ نے باہر کے لوگوں کو مداخلت کر کے ان کے درمیان صلح کرانے کا حکم دیا' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَٱبْعَثُوا۟ حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِۦ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَآ إِن يُرِيدَآ إِصْلَـٰحًا يُوَفِّقِ ٱللَّهُ بَيْنَهُمَآ ﴾ (النساء ٤/ ٣٥)

''اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان اختلاف کا ڈر ہو (کہ وہ ختم نہیں ہو رہا) تو ایک

ثالث مرد والوں کی طرف سے اور ایک ثالث عورت کے گھر والوں کی طرف سے مقرر کرو۔ اگر یہ دونوں اصلاح کے خواہش مند ہوں گے' تو اللہ ان کے درمیان ہم آہنگی (موافقت) پیدا فرما دے گا۔"

ان کی سعیٔ مصالحت کامیاب نہ ہو' تو پھر ان کو قضاء کا اگر اختیار ہو گا تو یہ اس کے مطابق علیحدگی کا فیصلہ کر دیں گے یا یہ حاکم مجاز کو رپورٹ دیں گے' وہ ان کا فیصلہ کر دے گا۔

طلاق دینے سے قبل یہ سارے مراحل اختیار کرنے کی تاکید اسی لیے کی گئی ہے کہ طلاق تک پہنچنے والا اختلاف طلاق کے بغیر ہی حل ہو جائے۔ تاہم اس کے باوجود بھی اگر طلاق کے بغیر چارہ نہ ہو' تو طلاق کے لیے بھی ایسے آداب بتلائے گئے ہیں کہ ان سے طلاق دینے کے بعد بھی صلح و رجوع کے امکانات باقی رہتے ہیں۔ وہ آداب حسب ذیل ہیں۔

آداب طلاق: اس سلسلے میں پہلی ہدایت یہ ہے کہ طلاق طُہر کی حالت میں صحبت کیے بغیر دی جائے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ ﴾ (الطلاق : ۱/۶۵) "تم طلاق عدت کے آغاز میں دو" اور عدت کے آغاز سے مراد' عورت کا حیض سے پاک ہونا ہے' حالت طُہر عدت کا آغاز ہے۔ اس پہلی ہدایت ہی کو ملحوظ رکھنے سے طلاق کی شرح بہت کم ہو سکتی ہے۔ عام طور پر غصہ اور اشتعال میں فوراً طلاق دے دی جاتی ہے۔ اگر انسان طلاق دینے کے اس ادب کو ملحوظ رکھے تو ایسے طہر کے انتظار میں' جس میں وہ ہم بستری نہ کر سکے' اس کا غصہ اور اشتعال ختم یا کم ہو جائے گا اور صرف وہی شخص طلاق دے گا جس نے طلاق دینے کا قطعی اور حتمی فیصلہ کر رکھا ہو گا۔

دوسرا ادب یہ ہے' کہ طلاق صرف ایک ہی دے۔ بیک وقت تین طلاقیں دینا کسی بھی مسلک کی رُو سے صحیح طریقہ نہیں ہے۔ نبیٔ اکرم ﷺ نے بھی اس پر سخت ناراضی اور برہمی کا اظہار فرمایا اور اسے کتاب اللہ کے ساتھ تَلَعُّب (کھیلنا) قرار دیا ہے۔ (النسائی' الطلاق' الثَّلاث المجموعَة وَمَا فِيهِ مِنَ التَّغليظ' حديث :۳۴۳۰)

اس ایک طلاق کا فائدہ یہ ہے کہ خاوند کو اگر طلاق کے بعد ندامت اور غلطی کا احساس

ہو تو وہ عدت (۳ حیض یا ۳ مہینے) کے اندر رجوع کر سکتا ہے۔ عدت گزر جائے تو ان کے درمیان بالاتفاق دوبارہ نکاح کے ذریعے سے تعلق قائم ہو سکتا ہے۔ اس میں کسی بھی مسلک کا اختلاف نہیں ہے۔

دوسری مرتبہ طلاق دینے کے بعد بھی اسی طرح عدت کے اندر رجوع اور عدت گزرنے کے بعد دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مرد کو زندگی میں دو مرتبہ طلاق دے کر رجوع کرنے کا حق دیا ہے' یعنی ایک مرتبہ وہ طلاق دے کر رجوع کر لے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد دوبارہ طلاق دے کر رجوع کر لے۔ تو ایسا کرنا جائز ہے' لیکن اس نے اس طرح کر کے اپنے دونوں حق استعمال کر لیے ہیں۔ اب اگر کسی موقع پر تیسری مرتبہ طلاق دے گا' تو اس کے لیے عدت کے اندر رجوع کرنا جائز ہو گا نہ عدت گزرنے کے بعد اس سے نکاح کرنا جائز۔ تاآنکہ اس کی مطلقہ بیوی کسی اور جگہ اپنی مرضی (اور اولیاء کی اجازت) سے باقاعدہ شادی کر لے' پھر اتفاق سے وہ خاوند فوت ہو جائے یا اپنی مرضی سے طلاق دے دے۔ تب پہلے خاوند سے اس کا نکاح جائز ہو گا۔

پہلے خاوند سے نکاح جائز کرنے کی نیت سے کسی سے مشروط نکاح کرنا' جسے ''حلالہ'' کہا جاتا ہے' نکاح نہیں' زناکاری ہے۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے:

«لَعَنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهُ»(سنن النسائي، الطلاق، باب إحلال المطلقة ثلاثا... الخ، ح:٣٤٤٥ وسنن الترمذي، النكاح، باب ماجاء في المحل والمحلل له، ح:١١١٩)

''حلالہ کرنے والے اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے' دونوں پر اللہ کے رسول نے لعنت فرمائی ہے۔''

جس کام پر نبی ﷺ لعنت اور بددعا فرمائیں' وہ کام کس طرح جائز ہو سکتا ہے؟ اس لیے مروجہ حلالہ لعنتی فعل ہے' اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔

بہرحال بیک وقت تین طلاقیں دینے کی بجائے' ایک طلاق دینا ہی طلاق کا احسن طریقہ ہے۔ اس طریقۂ طلاق سے وہ خرابیاں پیدا نہیں ہوتیں جو بیک وقت تین طلاقیں دینے

سے پیدا ہوتی ہیں اور نہ علماء کے درمیان کوئی اختلاف ہی پیدا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس سے طلاق کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے' طلاق دینے کے بعد اگر رجوع نہ کیا جائے حتی کہ تین حیض گزر جائیں' تو طلاق مؤثر ہو جاتی ہے اور عورت کا تعلق پہلے خاوند سے ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ جہاں چاہے' نکاح کر سکتی ہے۔

بیک وقت تین طلاقیں دینے کے نقصانات: ◐ بیک وقت تین طلاقیں دینا' ایک تو نبی اکرم ﷺ کی ہدایات کے خلاف ہے۔ گویا اس میں سُنَّت سے صریح انحراف ہے۔

◐ اسے رسول اللہ ﷺ نے تَلَعُّبْ بِكِتَابِ اللهِ (اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیل' مذاق) قرار دیا ہے اور اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیل مذاق بھی کسی مسلمان کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔

◐ اسے فقہی مذاہب کو اہمیت دینے والے تین ہی شمار کر لیتے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ کی وہ حکمت اور منشا فوت ہو جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے پہلی اور دوسری طلاق میں رکھی ہے کہ انسان اس میں طلاق دینے کے بعد آنے والی مشکلات پر سوچ بچار کر لے۔ اگر وہ محسوس کرے کہ طلاق سے اس کی پیچیدگیوں اور پریشانیوں میں مزید اضافہ ہو رہا ہے' تو وہ ان دونوں طلاقوں میں عدت کے اندر رجوع اور عدت گزر جانے کے بعد اپنی مطلقہ بیوی سے دوبارہ نکاح کر سکتا ہے۔

◐ بیک وقت تینوں طلاقوں کے نفاذ سے صلح و مفاہمت کے تمام امکانات ختم ہو جاتے ہیں جس سے خاندان اجڑ جاتے اور معصوم بچے بے سہارا ہو جاتے ہیں۔

◐ یہی وجہ ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں تمام فقہی مذاہب والوں کے نزدیک بھی جائز نہیں (گو وہ اس کے اجراء و نفاذ کے قائل ہیں) حتی کہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے اخبارات میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش بھی شائع ہوئی ہے کہ بیک وقت تین طلاقوں کو قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے۔ یہ ایک اچھی تجویز ہے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ اگر ان مجموعی طلاقوں کو' جب کہ طلاق دینے والے کی نیت صرف ایک طلاق دینا ہی ہو اور تین کا لفظ اس نے تاکید کے طور پر استعمال کیا ہو' اسے ایک ہی طلاق شمار کیا جائے' تو اس قانون سے عوام کو فوری سہارا (Relief) ملے گا' عوام کو فوری سہارے کی ضرورت ہے نہ کہ تعزیر

(سزا) کی۔ موجودہ حالات اور عوام کی جہالت کے پیش نظر ہمارے اس نقطۂ نظر کی بہت سے علمائے احناف نے بھی تائید کی ہے' جس کی ضروری تفصیل راقم کے اس مقالے میں موجود ہے جو "مجلس واحد کی تین طلاقوں کا مسئلہ اور احناف کے دعوے" کے عنوان سے کتاب "صراط مستقیم اور اختلاف امت" میں شامل ہے۔

تیسرا ادب طلاق کا یہ ہے کہ طلاق دینے کے بعد (یعنی پہلی اور دوسری طلاق میں) عورت کو گھر سے نہ نکالا جائے' نہ وہ خود گھر سے نکلے' بلکہ وہ خاوند ہی کے گھر میں رہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنۢ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ ﴾ (الطلاق٦٥/ ١)

"(طلاق دینے کے بعد) ان عورتوں کو گھروں سے مت نکالو اور نہ خود وہ نکلیں۔"

اس کی حکمت خود اللہ تعالیٰ نے یہ بتلائی ہے:

﴿ لَا تَدْرِي لَعَلَّ ٱللَّهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذَٰلِكَ أَمْرًا ۝١ ﴾ (الطلاق٦٥/ ١)

"تم نہیں جانتے' شاید اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی نئی بات پیدا کر دے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ مرد کے دل میں مطلقہ عورت کی رغبت پیدا کر دے' اس کے گھر ہی میں رہنے کی وجہ سے اسے اس پر ترس آ جائے اور وہ رجوع کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ اسی لیے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت میں اللہ نے صرف ایک طلاق دینے کی تلقین کی ہے اور بیک وقت تین طلاقیں دینے سے منع فرمایا ہے' کیونکہ اگر وہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے دے اور شریعت اسے جائز قرار دے کر نافذ بھی کر دے' تو پھر یہ کہنا بے فائدہ ہے کہ شاید اللہ کوئی نئی بات پیدا کر دے۔ (فتح القدیر)

ہمارے معاشرے میں اس ہدایت کی بھی کوئی پروا نہیں کی جاتی اور مرد کے طلاق دیتے ہی عورت کو اس کے والدین یا بہن بھائی وغیرہ لے جاتے ہیں اور عورت کو خاوند کے گھر میں رہنے ہی نہیں دیتے۔ حالانکہ طلاق بتہ (طلاق بائنہ یعنی تیسری طلاق) کے بعد تو ایسا کرنا صحیح ہے' کیونکہ اس کے بعد خاوند کو رجوع کرنے کا حق ہی نہیں ہے' لیکن پہلی اور دوسری طلاق کے بعد ایسا کرنا صحیح نہیں ہے' کیونکہ پہلی اور دوسری طلاق کے بعد خاوند کو

رجوع کا حق حاصل ہے۔ اس لیے اس کے گھر میں رہنے سے صلح و مفاہمت کا امکان موجود رہتا ہے' اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

ایک چوتھا ادب یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ طلاق دینے کے بعد رجوع نہ ہو سکے' تو مطلقہ عورت کو اچھے طریقے سے رخصت کیا جائے۔ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِإِحْسَانٍ کا مطلب یہی ہے۔ علاوہ ازیں اس موقع پر انہیں کوئی ہدیہ یا تحفہ دینے کا حکم دیا۔ فرمایا:

﴿ وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى ٱلْمُوسِعِ قَدَرُهُۥ وَعَلَى ٱلْمُقْتِرِ قَدَرُهُۥ مَتَٰعًۢا بِٱلْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى ٱلْمُحْسِنِينَ ﴿٢٣٦﴾ ﴾ (البقرة۲/ ۲۳۶)

"اور ان (مطلقہ) عورتوں کو فائدہ پہنچاؤ! خوش حال لوگوں پر ان کی طاقت کے مطابق (فائدہ پہنچانا) ہے اور تنگ دست پر ان کی طاقت کے مطابق' دستور کے مطابق فائدہ پہنچانا ہے' یہ احسان کرنے والوں کے لیے ضروری ہے۔"

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ وَلِلْمُطَلَّقَٰتِ مَتَٰعٌۢ بِٱلْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى ٱلْمُتَّقِينَ ﴿٢٤١﴾ ﴾ (البقرة۲/ ۲۴۱)

"اور مطلقہ عورتوں کو دستور کے مطابق فائدہ پہنچانا ہے۔ یہ پرہیزگاروں کے لیے ضروری ہے۔"

اس "متاع" (فائدے) کی بابت بعض علماء نے کہا ہے کہ خادم یا ۵۰۰ درہم یا ایک یا چند سوٹ وغیرہ ہیں' لیکن یہ تعیین شریعت کی طرف سے نہیں ہے۔ شریعت میں ہر شخص کو اپنی طاقت کے مطابق متاع دینے کا اختیار اور حکم ہے۔ علاوہ ازیں یہ متعۂ طلاق ہر قسم کی طلاق یافتہ عورت کو دینا چاہیے۔ قرآن کریم کی مذکورہ دوسری آیت سے عموم ہی معلوم ہوتا ہے۔

اس حکم متاع میں جو حکمت اور فوائد ہیں' وہ محتاج وضاحت نہیں۔ تلخی' کشیدگی اور اختلاف کے موقع پر' جو طلاق کا سبب ہوتا ہے' احسان کرنا اور عورت کی دلجوئی اور دلداری کا اہتمام کرنا' مستقبل کی متوقع خصومتوں کے سدباب کا نہایت اہم ذریعہ ہے' لیکن ہمارے معاشرے میں اس احسان و سلوک کی بجائے' مطلقہ کو ایسے برے طریقے سے رخصت کیا

جاتا ہے کہ دونوں خاندانوں کے آپس کے تعلقات ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتے ہیں۔ اگر قرآنی حکم کے مطابق تفریق کے اس موقعے پر حسن سلوک اور تطییب قلوب کا اہتمام کیا جائے تو اس کے بے شمار معاشرتی فوائد ہیں۔ کاش مسلمان اس نہایت ہی اہم نصیحت پر عمل کریں جسے انہوں نے فراموش کر رکھا ہے۔

آج کل کے بعض "مجتہدین" نے متاعٌ اور مَتِّعُوْهُنَّ سے یہ استدلال کیا ہے کہ مطلقہ عورت کو اپنی جائیداد میں سے باقاعدہ حصہ دو۔ یا عمر بھر نان و نفقہ دیتے رہو۔ یہ دونوں باتیں بے بنیاد ہیں' بھلا جس عورت کو مرد نے نہایت ناپسندیدہ سمجھ کر اپنی زندگی ہی سے خارج کر دیا' وہ ساری عمر کس طرح اس کے اخراجات کی ادائیگی کے لیے تیار ہو گا؟ یا اپنی جائیداد میں سے اسے حصہ دے گا؟

مرد اپنا حق طلاق صحیح طریقے سے استعمال کر کے اپنے آپ کو اس حق کا اہل ثابت کریں: طلاق کے مذکورہ آداب تو ضمنی طور پر اس لیے بیان کیے گئے ہیں' تاکہ مرد اپنا یہ حق صحیح طریقے سے استعمال کریں اور اسے غلط طریقے سے استعمال کر کے اسلام کی بدنامی کا باعث نہ بنیں' کیونکہ اسلام نے انہیں یہ حق اس لیے نہیں دیا ہے کہ وہ اس کے ذریعے سے عورتوں پر ظلم کریں یا اسلام کو بدنام کریں۔ اللہ تعالیٰ نے مرد کو یہ حق دے کر اس کی فوقیت و برتری کا اثبات کیا ہے' انہیں اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرنا چاہیے نہ کہ وہ اس استحقاق کی نفی کریں۔

عورت کو اللہ نے طلاق کا حق نہیں دیا: عورت کو اللہ نے یہ حق نہیں دیا کہ وہ مرد کو جب چاہے طلاق دے کر مرد سے علیحدہ ہو جائے۔ اس لیے عورت مرد کے مقابلے میں جسمانی اعتبار سے بھی کمزور ہے اور ذہنی و دماغی صلاحیتوں میں بھی کم تر۔ جسمانی کمزوری کی وجہ سے اس کے اندر صبر و ضبط کی کمی ہے اور دماغی صلاحیتوں میں تفاوت کی وجہ سے اس کے اندر سوچنے سمجھنے کی استعداد بھی کم ہے اور ان دونوں کمزوریوں کی وجہ سے اس کے فیصلے میں عجلت اور جذباتیت کا عنصر غالب رہتا ہے۔ اگر عورت کو بھی طلاق کا حق مل جاتا' تو وہ اپنا یہ حق نہایت جلد بازی یا جذبات میں آ کر استعمال کر لیا کرتی اور اپنے پیروں پر آپ

کلہاڑا مار لیا کرتی۔ اس سے معاشرتی زندگی میں جو فساد اور بگاڑ پیدا ہوتا' اس کا تصور ہی نہایت روح فرسا ہے۔ اس کا اندازہ آپ مغرب اور یورپ کی ان معاشرتی رپورٹوں سے لگا سکتے ہیں جو وہاں عورتوں کو حق طلاق مل جانے کے بعد مرتب اور شائع ہوئی ہیں۔

ان رپورٹوں کے مطالعے سے اسلامی تعلیمات کی حقانیت کا اور عورت کی اس کمزوری کا اثبات ہوتا ہے جس کی بنا پر مرد کو تو حق طلاق دیا گیا ہے لیکن عورت کو یہ حق نہیں دیا گیا۔ عورت کی جس زُود رنجی' سریع الغضبی' ناشکرے پن اور جذباتی ہونے کا ہم ذکر کر رہے ہیں' حدیث سے بھی اس کا اثبات ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«وَرَأَيْتُ النَّارَ فَإِذَا أَكْثَرُ أَهْلِهَا النِّسَاءُ يَكْفُرْنَ، قِيلَ: أَيَكْفُرْنَ بِاللهِ؟ قَالَ: يَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ، وَيَكْفُرْنَ الإِحْسَانَ، لَوْ أَحْسَنْتَ إِلٰى إِحْدَاهُنَّ الدَّهْرَ ثُمَّ رَأَتْ مِنْكَ شَيْئًا قَالَتْ: مَا رَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ»(صحيح البخاري، الإيمان، باب كفران العشير وكفر دون كفر، ح:٢٩)

''میں نے جہنم کا مشاہدہ کیا تو اس میں اکثریت عورتوں کی تھی' (اس کی وجہ یہ ہے کہ) وہ ناشکری کا ارتکاب کرتی ہیں۔ پوچھا گیا' کیا وہ اللہ کی ناشکری کرتی ہیں؟ آپ نے فرمایا۔ (نہیں) وہ خاوند کی ناشکری اور احسان فراموشی کرتی ہیں۔ اگر تم عمر بھر ایک عورت کے ساتھ احسان کرتے رہو' پھر وہ تمہاری طرف سے کوئی ایسی چیز دیکھ لے جو اسے ناگوار ہو' تو وہ فوراً کہہ اٹھے گی کہ میں نے تیرے ہاں کبھی سکھ دیکھا ہی نہیں۔''

جب ایک عورت کی افتادِ طبع اور مزاج ہی ایسا ہے کہ وہ عمر بھر کے احسان کو مرد کی کسی ایک ناگوار بات پر فراموش کر دیتی ہے تو اسے اگر حق طلاق مل جاتا' تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کس آسانی کے ساتھ وہ اپنا گھر اجاڑ لیا کرتی۔ اور عورت کے اس مزاج کو نبیٔ کریم ﷺ ہی نے بیان نہیں فرمایا' بلکہ دانش ورانِ مغرب اور ان کے مفکرین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ بہرحال عورت کی یہی وہ کمزوری ہے جس کی وجہ سے اللہ نے مرد کو حق

طلاق دیا ہے' لیکن عورت کو نہیں دیا۔ اس لیے کہ اس میں ہی عورت کا مفاد ہے۔ عورت کا مفاد ایک مرد سے وابستہ اور اس کا رفیقۂ حیات بن کر رہنے ہی میں ہے نہ کہ گھر اجاڑنے میں اور عورت کے اس مفاد کو' عورت کے مقابلے میں۔ مرد ہی صبر و ضبط اور حوصلہ مندی کا مظاہرہ کر کے زیادہ ملحوظ رکھتا اور رکھ سکتا ہے۔ بنابریں اسلام کا یہ حکم بھی عورت کے مفاد ہی میں ہے' گو آج کی عورت' گمراہ کن پروپیگنڈے کا شکار ہو کر' اسے اپنے پر ظلم تصور کرے۔ لیکن اللہ ارحم الراحمین نے اس قانون طلاق کے ذریعے سے اس پر اس کی فطری کمزوری کو ملحوظ رکھتے ہوئے' رحم ہی فرمایا ہے' اس پر ظلم نہیں کیا ہے۔

﴿وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّـٰمٍ لِّلْعَبِيدِ ۝٤٦﴾ (السجدة٤١/ ٤٦)

-- ۱۰ --

مسئلہ طلاق ثلاثہ؟

نوعیت مسئلہ اور اس کے مختصر دلائل: طلاق دینے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ حالت طہر میں صرف ایک طلاق دی جائے اور وہ بھی صرف اس صورت میں کہ اس کے بغیر چارہ نہ ہو۔ اس کے بعد اگر رجوع اور صلح کی صورت بن جائے تو محدثین اور فقہائے اربعہ سب کے نزدیک تین حیض یا تین مہینے کے اندر رجوع اور عدت گزر جانے کے بعد دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔ اور اگر طلاق دینے کے بعد رجوع نہ ہو اور عدت (تین حیض) گزر جائے' تو ان کے مابین تعلق زوجیت ختم ہو جائے گا۔ مطلقہ بیوی اس کے بعد آزاد ہے' جہاں چاہے نکاح کرے' حتیٰ کہ پہلے خاوند سے بھی نکاح کر سکتی ہے۔ اس طریقے میں دوسری اور تیسری طلاق دینے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ اور موٹی سی بات ہے کہ جب ایک مرتبہ ہی طلاق دینے سے مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو بیک وقت تین طلاقیں کیوں دی جائیں؟

لیکن ہمارے ملک میں جہالت عام ہے' حتیٰ کہ وکلاء اور عرضی نویس حضرات بھی بالکل بے علم ہیں اور جس طرح جاہل لوگ بے سوچے سمجھے ایک ہی سانس میں تین طلاقیں دے دیتے ہیں' اگر کوئی وکیل یا وثیقہ نویس سے طلاق لکھواتا ہے تو وہ بھی تین طلاقیں لکھ کر اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ حالانکہ نبی اکرم ﷺ نے ایک ہی مرتبہ تین طلاقیں دینے پر شدید غصے کا اظہار فرمایا ہے اور اسے اللہ کی کتاب کے ساتھ استہزاء اور مذاق قرار دیا ہے اور اسی غلط طریقے کی وجہ سے پھر اختلاف بھی واقع ہوتا ہے' کچھ علماء کہتے ہیں کہ اس طرح تینوں طلاقیں واقع ہو گئی ہیں اور اب حلالہ کے سوا کوئی چارہ نہیں' اس کے بغیر دونوں کا دوبارہ نکاح نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ حلالے کا کوئی تصور اسلام میں نہیں ہے' یہ ایک لعنتی فعل ہے جسے کوئی غیرت مند مرد اور عورت برداشت نہیں کر سکتی اور نبی ﷺ نے حلالہ کرنے والے اور کروانے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے اور حلالہ کرنے والے کو

کرائے کا سانڈ قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس دوسرے علماء کا موقف یہ ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی طلاق رجعی شمار ہوں گی' یعنی اس کے بعد خاوند اگر رجوع کرنا چاہے تو وہ تین مہینے کی عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے' اس کے لیے اسے نکاح کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اگر عدت گزرنے کے بعد صلح کرنا چاہیں گے تو پھر نکاح ضروری ہے اور حلالے کے بغیر ان کا باہم نکاح کرنا جائز ہو گا۔ پہلی مرتبہ اور دوسری مرتبہ طلاق میں یہی حکم ہو گا۔ البتہ تیسری مرتبہ طلاق کے بعد نہ رجوع ہو سکتا ہے اور نہ نکاح (حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ) یہاں تک کہ کسی دوسرے مرد سے نکاح نہ کر لے۔" اس موقف کے دلائل حسب ذیل ہیں:

قرآنی دلیل: قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ﴾ (البقرۃ ۲/ ۲۲۹)

"طلاق دو مرتبہ ہے' پس (اس کے بعد) بھلائی کے ساتھ روک لینا ہے یا احسان کے ساتھ چھوڑ دینا۔"

مطلب یہ ہے کہ مسلمان کو طلاق دینے کے بعد بیوی سے رجوع کر کے اپنے پاس روک لینے یا طلاق کو مؤثر کر کے احسان کے ساتھ اسے اپنے سے جدا کر دینے کا دو مرتبہ حق حاصل ہے۔ البتہ تیسری طلاق کے بعد یہ حق نہیں۔ تیسری طلاق کے بعد بیوی ہمیشہ کے لیے جدا ہو جاتی ہے' اس سے رجوع ہو سکتا ہے نہ نکاح۔ یہاں تک کہ وہ کسی اور شخص سے آباد ہونے کی نیت سے باقاعدہ نکاح کرے۔ پھر وہ اپنی مرضی سے اسے طلاق دے دے یا فوت ہو جائے' تو پہلے خاوند سے اس کا دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔

قرآن کریم کے اس اندازِ بیان سے صاف واضح ہے کہ ایک ہی مرتبہ تین طلاقیں دینا یا ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین شمار کر کے بیوی کو ہمیشہ کے لیے جدا کر دینا' قرآن کے مذکورہ حکم سے متصادم ہے۔ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتا ہے کہ پہلی اور دوسری طلاق کے بعد سوچنے اور نظرثانی کا موقع اور گنجائش باقی ہے۔ لیکن لوگ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین ہی شمار کر کے اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے موقع اور گنجائش کو ختم کر دیتے ہیں جو کسی لحاظ

سے بھی صحیح اور مستحسن نہیں' کیونکہ اس طرح وہ حکمت فوت ہو جاتی ہے جو پہلی اور دوسری طلاق کے بعد رجوع کرنے کی گنجائش میں مضمر ہے۔ اس لیے ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک ہی طلاق رجعی شمار کرنا' جس کے بعد عدت کے اندر خاوند کو رجوع کرنے کا حق حاصل ہو' قرآن کریم کی رُو سے زیادہ صحیح ہے اور ذیل کی احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

احادیث سے استدلال: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«طَلَّقَ رُكَانَةُ بْنُ عَبْدِ يَزِيدَ أَخُو بَنِي مُطَّلِبٍ امْرَأَتَهُ ثَلَاثًا فِي مَجْلِسٍ وَاحِدٍ، فَحَزِنَ عَلَيْهَا حُزْنًا شَدِيدًا، قَالَ: فَسَأَلَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ كَيْفَ طَلَّقْتَهَا؟ قَالَ: طَلَّقْتُهَا ثَلَاثًا، قَالَ: فَقَالَ: فِي مَجْلِسٍ وَاحِدٍ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: فَإِنَّمَا تِلْكَ وَاحِدَةٌ، فَارْجِعْهَا إِنْ شِئْتَ، قَالَ: فَرَجَعَهَا»(مسند أحمد: ١/ ٢٦٥)

"حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دیں' لیکن بعد میں سخت غمگین ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: تم نے اسے کس طرح طلاق دی تھی؟ انہوں نے کہا: تین مرتبہ۔ آپ نے پوچھا: ایک ہی مجلس میں طلاقیں دی تھیں؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: پھر یہ ایک ہی طلاق ہوئی ہے' اگر تم چاہو تو رجوع کر سکتے ہو۔ راویٔ حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ اس کے بعد حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی سے رجوع کر لیا۔"

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں:

«كَانَ الطَّلَاقُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَأَبِي بَكْرٍ وَسَنَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ، طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً»(صحيح مسلم، الطلاق، باب طلاق الثلاث، ح: ١٤٧٢)

"عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں تک ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی طلاق شمار ہوتی تھیں۔"

ان دونوں حدیثوں سے بھی واضح ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی طلاق رجعی شمار ہو گی۔

متعدد حنفی علماء کا اعتراف: ان ہی مذکورہ دلائل قرآن و حدیث کی بنیاد پر موجودہ دور کے بہت سے علمائے احناف نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک ہی طلاق شمار کر کے خاوند کو عدت کے اندر رجوع کرنے کا اور عدت گزرنے کے بعد بہ نکاح جدید (بغیر حلالہ مروجہ کے) اپنی مطلقہ بیوی کو اپنے گھر بسانے کا حق حاصل ہے۔ جیسے مولانا سعید احمد اکبر آبادی' (مدیر ماہنامہ "برہان" دہلی۔) مولانا عبدالحلیم قاسمی' (جامعہ حنفیہ گلبرگ' لاہور۔) مولانا پیر کرم شاہ ازہری' (جج سپریم اپیلیٹ شریعت بنچ' پاکستان۔) مولانا حسین علی واں بھچراں اور دیگر حضرات ہیں جس کی تفصیل "ایک مجلس کی تین طلاقیں" نامی کتاب میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ اس کتاب میں پیر کرم شاہ ازہری کا ایک مدلل مقالہ بھی شامل ہے' جس میں اسی مسلک کی تائید کی گئی ہے۔

علاوہ ازیں مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی سے پوچھا گیا کہ زید نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ لیکن زید کو اپنی بیوی سے نہایت الفت ہے اور مفارقت ناقابل برداشت' تو بدرجہ مجبوری مذہب شافعی کی تقلید کرتے ہوئے نکاح جائز ہو گا یا نہیں؟ اس کے جواب میں مولانا عبدالحی مرحوم نے فرمایا: "ضرورتِ شدیدہ کے وقت مذہب شافعی کی تقلید کرنا جائز ہے۔" (فتاویٰ مولانا عبدالحی' ص: ۱۶۶)

مطلب مولانا مرحوم کا یہ ہے کہ اگر مفاسد کا اندیشہ ہو تو دوسرے مذہب کے فتویٰ کے مطابق نکاح کر کے اپنا گھر آباد کر لیا جائے۔ یہی اجازت مولانا کفایت اللہ مرحوم مفتی اعظم ہند نے بھی مخصوص حالات کے لیے دی ہے۔ چنانچہ ان کے مجموعہ فتاوی میں ایک سوال جواب درج ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک حنفی نے طلاق ثلاثہ کے بعد اہل حدیث عالم سے فتویٰ لے کر اپنی بیوی سے رجوع کر لیا' جس پر دوسرے علماء نے اہل حدیث مفتی پر کفر کا فتویٰ لگا دیا اور اس کے مقاطعے کا حکم دیا اور مسجد میں آنے سے روک دیا۔ (سوال کیا گیا کہ) کیا یہ فعل جائز ہے؟ اس کا جواب دیا گیا۔

ایک مجلس میں تین طلاقیں دینے سے تینوں طلاقیں پڑ جانے کا مذہب جمہور علماء کا ہے اور ائمہ اربعہ اس پر متفق ہیں۔ جمہور علماء اور ائمہ اربعہ کے علاوہ بعض علماء اس کے قائل ضرور ہیں کہ ایک طلاق رجعی ہوتی ہے اور یہ مذہب اہل حدیث نے بھی اختیار کیا ہے اور حضرت ابن عباس اور طاؤس و عکرمہ و ابن اسحاق سے منقول ہے۔ پس کسی اہل حدیث کو اس حکم کی وجہ سے کافر کہنا درست نہیں اور نہ وہ قابل مقاطعہ اور نہ مستحق اخراج عن المسجد ہے۔ ہاں حنفی کا اہل حدیث سے فتویٰ حاصل کرنا اور اس پر عمل کرنا' تو یہ بہ اعتبار فتویٰ ناجائز تھا۔ لیکن اگر وہ بھی مجبوری اور اضطرار کی حالت میں اس کا مرتکب ہوا ہو' تو قابل درگزر ہے۔ (کفایت المفتی' جلد: ششم' ص: ۳۶۱)

اس تفصیل سے واضح ہے کہ مجلس واحد کی تین طلاقوں کے ایک ہی شمار کرنے میں اہل حدیث منفرد نہیں ہیں' بلکہ عصر صحابہ سے عصر حاضر تک ہر دور میں ایسے علماء و ائمہ موجود رہے ہیں۔ جو اسے ایک طلاق رجعی میں شمار کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بعض لوگ اس مسئلے میں اہل حدیث کو بلاوجہ مطعون کرتے ہیں۔ جیسے مولانا محمد یوسف لدھیانوی مرحوم مدیر "بینات" کراچی نے اپنی کتاب "اختلاف امت اور صراط مستقیم" حصہ اوّل کے آخر میں اس سلسلے میں اہل حدیث کے خلاف گوہر افشانی فرمائی ہے۔

ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ موضوع زیر بحث کے ضروری گوشوں کی وضاحت کر دی جائے تاکہ اہل حدیث پر اڑایا ہوا گرد و غبار صاف اور مسئلے کی مناسب تنقیح ہو جائے۔ مدیر "بینات" کی گفتگو کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱) ایک مجلس میں دی گئیں تین طلاقوں کو تین ہی شمار کرنے کا فتویٰ عمر رضی اللہ عنہ نے دیا تھا۔

۲) کسی صحابی و تابعی کا خلاف ان کے علم میں نہیں۔

۳) یہی مذہب ائمہ اربعہ کا ہے' جو مدیر "بینات" کے نزدیک اجماعِ امت کے مترادف ہے۔

۴) اس مسئلے میں اہلحدیث اجماع امت سے ہٹ کر شیعوں کے نقش قدم پر ہیں۔

ہماری گزارشات: اصل مسئلے کی نوعیت اور اس کے دلائل مختصراً ہم بیان کر آئے ہیں۔ آئندہ صفحات میں ہم موضوع کی تفصیلات سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف مذکورہ چار

باتوں ہی پر بحث کریں گے۔ ان شاء اللہ اسی سے مسئلے کے اہم پہلو بھی مزید واضح ہو جائیں گے اور مسلک اہل حدیث کی حقانیت بھی۔ واللہ الموفق للصواب۔

۱۔ **حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فتویٰ:** حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے محولہ بالا فتویٰ پر ہی اگر فقہی تعصب سے الگ ہو کر غور کر لیا جائے تو مسئلے کی شاہ کلید ہاتھ میں آجاتی اور مسئلے کا حل نکل آتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فتویٰ کے الفاظ یہ ہیں:

«عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: كَانَ الطَّلَاقُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَأَبِي بَكْرٍ وَسَنَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ، طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً، فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ: إِنَّ النَّاسَ قَدِ اسْتَعْجَلُوا فِي أَمْرٍ كَانَتْ لَهُمْ فِيهِ أَنَاةٌ، فَلَوْ اَمْضَيْنَاهُ عَلَيْهِمْ فَأَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ»(صحيح مسلم، الطلاق، باب طلاق الثلاث، ح: ١٤٧٢)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ' حضرت ابوبکر کے عہد اور حضرت عمر کی خلافت کے ابتدائی دو برسوں میں تین طلاق کو ایک ہی شمار کیا جاتا تھا۔ لیکن حضرت عمر نے فرمایا:"جس معاملے (یعنی طلاق) میں لوگوں کو سوچ بچار سے کام لینا چاہیے تھا' اس میں وہ جلد بازی سے کام لینے لگے ہیں' لہٰذا ہم کیوں نہ اس کو نافذ کر دیں۔"

چنانچہ آپ نے اس کو ان پر نافذ کر دیا۔

اس حدیث کو ایک لفظ یا ایک مجلس میں تین طلاقوں کو تین ہی طلاقیں شمار کرنے کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے اور دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس پر صحابہ کا اجماع ہو گیا ہے۔ لیکن اسی حدیث سے یہ بھی تو واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ خود عہد رسالت مآب ﷺ اور آپ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق بلکہ خود حضرت عمر کے عہد خلافت کے ابتدائی دو سال میں تعامل کیا تھا؟ یہی نا کہ تین طلاقوں کو ایک ہی طلاق شمار کیا جاتا تھا۔ انصاف سے سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ تعامل امت زیادہ صحیح ہے جو عہد رسالت و عہد صدیقی اور اس کے دو سال بعد تک رہا یا وہ تعامل جس کا آغاز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دو سال بعد سے ہوا؟

یعنی تعامل عہد رسالت و صدیقی فوقیت رکھتا ہے یا تعامل عہد عمر؟

بنابریں واقعہ یہ ہے کہ صحیح مسلم کی یہ حدیث' جسے ہمارے بھائی طلاقِ ثلاثہ کے اثبات میں پیش کرتے ہیں۔ اسی مسلک کی تائید کرتی ہے جس میں ایک مجلس میں دی گئیں تین طلاقیں ایک ہی طلاق شمار کرنے کا فتویٰ دیا جاتا ہے۔

فتوائے فاروقی کی حقیقت: رہی یہ بات کہ عہد رسالت و عہد صدیقی کے خلاف حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیوں حکم نافذ کیا؟ تو گزارش ہے کہ اسی حدیث میں اس کی یہ وجہ بیان کر دی گئی ہے کہ لوگ کثرت سے طلاقیں دینے لگ گئے تھے جبکہ شریعت نے اس میں انتہائی غور و فکر اور صبر و تحمل سے کام لینے کی تاکید کی ہے۔ نیز بیک وقت تین طلاقیں شریعت اسلامیہ میں سخت ناپسندیدہ فعل ہے جو نص قرآنی ﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ ﴾ کے بھی خلاف ہے اور نبی ﷺ کے فرمان کے بھی صریحاً مخالف۔ نبی ﷺ نے بیک وقت تین طلاقوں کو تَلَعُّب بِكِتَابِ اللهِ "کتاب اللہ کے ساتھ کھیل" قرار دیا ہے۔

سنن نسائی میں حدیث ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے ڈالیں' آپ کو جب معلوم ہوا تو آپ بڑے غضب ناک ہوئے اور فرمایا:

«أَيُلْعَبُ بِكِتَابِ اللهِ وَأَنَا بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ؟»(سنن النسائي، الطلاق، باب الثلاث المجموعة وما فيه من التغليظ، ح: ٣٤٣٠)

"میری موجودگی میں اللہ کی کتاب کے ساتھ اس طرح تَلَعُّب کیا جا رہا ہے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کو اتنا ناپسند فرماتے تھے کہ جس شخص کے متعلق ان کو پتہ چلتا کہ اس نے بیک وقت تین طلاقیں دی ہیں تو اس کی پشت پر دُرے لگاتے۔

«أَنَّ عُمَرَ كَانَ إِذَا أُتِيَ بِرَجُلٍ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ ثَلَاثًا أَوْجَعَ ظَهْرَهُ»(فتح الباري، باب من جوّز الطلاق الثلاث: ٩/ ٤٤٩)

لیکن جب حضرت عمر نے دیکھا کہ لوگ طلاق کے مسئلے میں اس احتیاط و تدبر سے کام نہیں لیتے جو شریعت کا منشا ہے اور طلاق کا وہ صحیح طریقہ اختیار نہیں کرتے جو شریعت نے بتلایا ہے کہ طلاق بلفظ واحد حالت طہر میں دی جائے' بلکہ بیک وقت تین طلاقیں کثرت

سے دینے لگے ہیں تو حضرت عمر کے ذہن میں یہ بات آئی کہ کیوں نہ تین طلاقوں کو تین ہی شمار کرنے کا نفاذ کر دیا جائے تاکہ اس سخت اقدام سے لوگوں کو کچھ تنبیہ ہو اور کثرت سے بیک وقت طلاق دینے کے رجحان کی حوصلہ شکنی ہو۔ یہ گویا ایک تعزیری و تہدیدی اقدام تھا جو اجتہاداً حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اختیار کیا تھا جیسا کہ اور بھی کئی مسائل میں انہوں نے ایسے ہی اجتہادی اقدامات کیے تھے۔

ان مصالح اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اقدام کا پس منظر چونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علم میں تھا۔ اس لیے اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی سکوت اختیار فرمایا۔ چنانچہ حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

«رَأَىٰ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ عُمَرُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، أَنَّ النَّاسَ قَدِ اسْتَهَانُوا بِأَمْرِ الطَّلَاقِ، وَكَثُرَ مِنْهُمْ إِيقَاعُهُ جُمْلَةً وَاحِدَةً، فَرَأَىٰ مِنَ الْمَصْلَحَةِ عُقُوبَتَهُمْ بِإِمْضَائِهِ عَلَيْهِمْ، لِيَعْلَمُوا أَنَّ أَحَدَهُمْ إِذَا أَوْقَعَهُ جُمْلَةً بَانَتْ مِنْهُ الْمَرْأَةُ وَحَرُمَتْ عَلَيْهِ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ نِكَاحَ رَغْبَةٍ يُرَادُ لِلدَّوَامِ لَا نِكَاحَ تَحْلِيلٍ، فَإِنَّهُ كَانَ مِنْ أَشَدِّ النَّاسِ فِيهِ، فَإِذَا عَلِمُوا ذٰلِكَ كَفُّوا عَنِ الطَّلَاقِ الْمُحَرَّمِ، فَرَأَىٰ عُمَرُ أَنَّ هٰذَا مَصْلَحَةٌ، لَهُمْ فِي زَمَانِهِ، وَرَأَىٰ أَنَّ مَا كَانُوا عَلَيْهِ فِي عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ وَعَهْدِ الصِّدِّيقِ وَصَدْرًا مِّنْ خِلَافَتِهِ كَانَ الْأَلْيَقُ بِهِمْ، لِأَنَّهُمْ لَمْ يَتَتَابَعُوا فِيهِ، وَكَانُوا يَتَّقُونَ اللهَ فِي الطَّلَاقِ، وَقَدْ جَعَلَ اللهُ لِكُلِّ مَنِ اتَّقَاهُ مَخْرَجًا، فَلَمَّا تَرَكُوا تَقْوَى اللهِ وَتَلَاعَبُوا بِكِتَابِ اللهِ وَطَلَّقُوا عَلَىٰ غَيْرِ مَا شَرَعَهُ اللهُ أَلْزَمَهُمْ بِمَا الْتَزَمُوهُ عُقُوبَةً لَهُمْ، فَإِنَّ اللهَ تَعَالَىٰ إِنَّمَا شَرَعَ الطَّلَاقَ مَرَّةً بَعْدَ مَرَّةٍ، وَلَمْ يَشْرَعْهُ كُلَّهُ مَرَّةً وَّاحِدَةً، فَمَنْ جَمَعَ الثَّلَاثَ فِي مَرَّةٍ وَّاحِدَةٍ فَقَدْ تَعَدَّىٰ حُدُودَ اللهِ، وَظَلَمَ نَفْسَهُ، وَلَعِبَ بِكِتَابِ اللهِ، فَهُوَ حَقِيقٌ أَنْ يُّعَاقَبَ، وَيُلْزَمَ بِمَا الْتَزَمَهُ، وَلَا يُقَرُّ عَلَىٰ رُخْصَةِ اللهِ وَسَعَتِهِ، وَقَدْ صَعَّبَهَا عَلَىٰ نَفْسِهِ، وَلَمْ يَتَّقِ اللهَ وَلَمْ

يُطَلِّقْ كَمَا أَمَرَهُ اللهُ وَشَرَعَهُ لَهُ، بَلِ اسْتَعْجَلَ فِيمَا جَعَلَ اللهُ لَهُ الْأَنَاةَ فِيهِ رَحْمَةً مِّنْهُ وَإِحْسَانًا، وَلَبَّسَ عَلٰى نَفْسِهِ، وَاخْتَارَ الْأَغْلَظَ وَالْأَشَدَّ فَهٰذَا مِمَّا تَغَيَّرَتْ بِهِ الْفَتْوٰى لِتَغَيُّرِ الزَّمَانِ، وَعَلِمَ الصَّحَابَةُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ حُسْنَ سِيَاسَةِ عُمَرَ وَتَأْدِيبَهُ لِرَعِيَّتِهِ فِي ذٰلِكَ فَوَافَقُوهُ عَلٰى مَا أَلْزَمَ بِهِ»(اعلام الموقعین: ۳/ ۳۵ـ۳۶ طبع جدید۱۹۶۹ء)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کیا وہ ایک مصلحت وقت کی اقتضا کا کام تھا نہ کہ شرعی مسئلہ' ایک کام جو منع تھا' جو خلاف سنت تھا لیکن اگر کسی سے ہو جائے تو شریعت اسے پکڑتی نہ تھی جب لوگوں نے بکثرت بے خوف ہو کر اسے شروع کر دیا تو آپ نے بحیثیت قانون یہ حکم فرمایا کہ میں آئندہ سے تین کو تین ہی گن لوں گا۔ یہ صرف اس لیے تھا کہ لوگ ایک ساتھ تین طلاقیں دینے سے باز رہ جائیں۔ ورنہ پھر تین سال تک یہ حکم شرعی کیوں جاری نہ کیا؟ پس یہ حکم شرعی نہیں بلکہ قانونی حیثیت رکھتا ہے کہ لوگ ڈر جائیں کہ اگر اب ہم نے ایسا کیا تو بیوی نکاح سے باہر ہو جائے گی جب تک وہ دوسرے سے نکاح نہ کرے۔ اور نکاح بھی باقاعدہ رغبت کے ساتھ دوام کے لیے ہو' نہ یہ کہ حلالہ کر کے چھوڑ دے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حلالہ کے سخت ترین مخالف تھے۔ پس جناب فاروق رضی اللہ عنہ کا خیال یہ ہوا کہ پہلے کے لوگوں کے لائق جو تھا اس سے اس وقت کے لوگ محروم کر دیے جانے کے قابل ہو گئے ہیں وہ اس طرح پے در پے برابر طلاقیں نہیں دیتے تھے' طلاق کے معاملہ میں طریقۂ طلاق کو ملحوظ رکھتے تھے۔ خدا سے ڈرتے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے ساتھ آسانی کر رکھی تھی۔ اب جب کہ یہی چیز برابر ہونے لگی تو کیا وجہ جو ہم انہیں اس انعام خداوندی سے محروم نہ کر دیں تاکہ ان کے دماغ اور ان کے فعل پھر درست ہو جائیں پس یہ فتویٰ گویا ایک درۂ فاروقی تھا جو ان کی سزا کے لیے تھا۔ نہ یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم شرعی بدل دیا۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

مشروع طلاق ایک کے بعد ایک ہے نہ کہ سب ایک ساتھ۔ جو ایسا کرتا ہے وہ حد سے

گزر جاتا ہے' اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے اور احکام خدا کے ساتھ کھیل کرتا ہے پس وہ اس قابل ہو گیا کہ حاکم وقت بطور سزا دہی کے اس پر کوئی سختی کر دے۔ یہ خدا کی آیتوں سے کھیلتا ہے تو کیوں نہ رخصت خدائی سے محروم کر دیا جائے تاکہ اس کی آنکھیں کھل جائیں پس یہ تو اسی قبیل سے ہے کہ زمانے کے بدلنے سے حکم بھی بدل جاتا ہے۔ اس حکمت کو مد نظر رکھ کر سیاست فاروقی کا ساتھ صحابہ نے بھی دیا اور ایسے ہی فتوے دینے شروع کیے۔"

(دین محمدی' ج: ۲' حصہ پنجم' ص: ۸۰۴' طبع لاہور)

اسی طرح امام ابن القیم رحمہ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اجتہادی اقدام کی معاشرتی مصلحتیں اور اس میں کارفرما دیگر اسباب و وجوہ اغاثۃ اللھفان من مصاید الشیطان میں بھی بیان فرمائے ہیں۔ (ملاحظہ ہو' ج: ۱' ص: ۳۱۵' ۳۴۹' ۳۵۱' ۳۵۲' طبع جدید)

خود حنفی فقہاء بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی زمانے تک تین طلاقیں ایک ہی طلاق سمجھی جاتی تھیں۔ پھر لوگوں کی کثرتِ طلاق کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تین طلاق کو تین ہی شمار کرنے کا حکم سیاسی تدبیر کے طور پر نافذ کر دیا۔ چنانچہ امام طحطاوی درمختار کے حاشیے میں قہستانی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

«إِنَّهُ كَانَ فِي الصَّدْرِ الأَوَّلِ إِذَا أَرْسَلَ الثَّلَاثَ جُمْلَةً لَمْ يُحْكَمْ إِلاَّ بِوُقُوعِ وَاحِدَةٍ إِلٰى زَمَنِ عُمَرَ ثُمَّ حَكَمَ بِوُقُوعِ الثَّلَاثِ سِيَاسَةً لِكَثْرَتِهِ مِنَ النَّاسِ»(در مختار: ۲/ ۱۰۵ وجامع الرموز، ص: ۳۲۱)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اظہارِ ندامت: اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فتویٰ بطور سزا کے تھا۔ اور بعض سزائیں حالات و ظروف کے اعتبار سے تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس حکم کو جاری کرتے وقت یہ ہرگز نہیں فرمایا تھا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے بلکہ انہوں نے اس کی نسبت اپنی طرف ہی کی ہے۔ فَأَمْضَيْنَاهُ عَلَيْهِمْ۔

چنانچہ آخری ایام میں انہیں اس بات کا احساس بھی ہوا کہ مجھے بطور سزا بھی یہ اقدام نہیں کرنا چاہیے تھا جس پر انہوں نے اظہارِ ندامت بھی کیا۔ (ملاحظہ ہو: اغاثۃ اللھفان' ج: ۱' ص ۳۵۱)

پس ایک تعزیری اور اجتہادی اقدام کو دین و شریعت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا بالخصوص

جبکہ عہد رسالت و عہد صدیقی میں تین طلاقوں کو ایک ہی طلاق سمجھا جاتا تھا۔

۲۔ **صحابہ و تابعین کے فتوے:** دوسری بات فاضل مدیر نے یہ فرمائی ہے کہ کسی صحابی و تابعی کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مخالف فتوے کا انہیں علم نہیں۔

جناب عالی! آپ کو اگر علم نہیں تو آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم تابعین و تبع تابعین رحمۃ اللہ علیہم کے متعدد ایسے فتاوے موجود ہیں کہ بیک وقت تین طلاقیں ایک ہی کے حکم میں ہوتی ہیں چنانچہ بہت سی کتب تفسیر' حدیث' شروح حدیث اور کتب فقہ میں وہ موجود ہیں۔ ایسے چند حوالے پیش خدمت ہیں جن سے ایسے متعدد صحابہ و تابعین کے فتووں کا پتہ چلتا ہے جن کے متعلق مدیر مذکور نے بالکل لاعلمی ظاہر فرمائی ہے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ: نے متعدد مقامات پر اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے۔ یہاں امام موصوف کی ایک عبارت پیش کی جاتی ہے۔ لکھتے ہیں:

«(وَكَذٰلِكَ) إِذَا طَلَّقَهَا ثَلَاثًا بِكَلِمَةٍ أَوْ كَلِمَاتٍ فِي طُهْرٍ وَاحِدٍ فَهُوَ مُحَرَّمٌ عِنْدَ جُمْهُورِ الْعُلَمَاءِ، وَتَنَازَعُوا فِيمَا يَقَعُ بِهَا، فَقِيلَ: يَقَعُ بِهَا الثَّلَاثُ، وَقِيلَ لَا يَقَعُ بِهَا إِلاَّ طَلْقَةٌ وَاحِدَةٌ، وَهٰذَا هُوَ الأَظْهَرُ الَّذِي يَدُلُّ عَلَيْهِ الْكِتَابُ وَالسُّنَّةُ، كَمَا قَدْ بَسَطَ فِي مَوْضِعِهِ»(فتاوی ابن تیمیه: ٢/ ٨٦)

"اگر کوئی شخص ایک طُہر میں ایک کلمہ کے ساتھ یا تین کلموں کے ساتھ تین طلاقیں دے تو جمہور علماء کے نزدیک یہ فعل (بیک وقت تین طلاق دینا) حرام ہے۔ تاہم ان کے واقع ہونے میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ تینوں واقع ہو جائیں گی اور ایک قول یہ ہے کہ ایک ہی طلاق واقع ہوگی اور یہی بات زیادہ صحیح ہے جس پر قرآن و سنّت دلالت کرتے ہیں جیسا کہ اپنی جگہ تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔"

حافظ ابن القیم: نے بھی اس موضوع پر خاصی تفصیل سے بحث کی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: "صحابہ میں سے حضرت ابن عباس' زبیر بن عوام' عبدالرحمٰن بن عوف اور ایک روایت کی رُو سے حضرت علی و عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم بھی۔ تابعین میں سے حضرت عکرمہ

اور امام طاؤس اور تبع تابعین اور ان کے بعد کے ائمہ میں سے محمد بن اسحاق' حلاس بن عمرو' حارس العکلی' داود بن علی اور ان کے اکثر اصحاب' بعض اصحابِ مالک' بعض حنفیہ محمد بن مقاتل وغیرہ اور بعض اصحابِ احمد اس بات کے قائل رہے ہیں کہ ایک مجلس میں دی گئیں تین طلاقیں ایک ہی طلاق شمار ہوں گی۔" (اعلام الموقعین' ج : ۳' ص : ۴۴- نیز دیکھیے اغاثۃ اللهفان' ج :۱' ص :۳۳۹-۳۴۱)

علامہ ابوحیان اندلسی: "الطلاق مرتان" کی تفسیر میں پہلے ان لوگوں کی تائید کرتے ہیں جو اس سے مختلف اوقات میں طلاق دیے جانے پر استدلال کرتے ہیں:

«وَمَازَالَ يَخْتَلِجُ فِي خَاطِرِي أَنَّهُ لَوْ قَالَ أَنْتِ طَالِقٌ مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا أَنَّهُ لَا يَقَعُ إِلَّا وَاحِدَةً لِأَنَّهُ مَصْدَرٌ لِلطَّلَاقِ وَيَقْتَضِي الْعَدَدَ فَلَابُدَّ أَنْ يَكُونَ الْفِعْلُ الَّذِي هُوَ عَامِلٌ فِيهِ يَتَكَرَّرُ وُجُودًا كَمَا تَقُولُ ضَرَبْتُ ضَرْبَتَيْنِ أَوْ ثَلَاثَ ضَرَبَاتٍ»(تفسير البحر المحيط : ١/ ١٩٢ وتفسير النهر الماد برحاشيه تفسير مذكور، ص: ١٩١)

خلاصہ عبارت یہ ہے کہ "قرآن کے الفاظ "الطلاق مرتان" سے میرے دل میں ہمیشہ یہی بات آئی ہے کہ طلاق دینے والا مرد ایک مجلس اور ایک وقت میں اگر دو یا تین طلاقیں دے تو وہ ایک ہی طلاق واقع ہو۔"

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ: فتح الباری میں صحیح بخاری کے باب' بَابُ مَنْ جَوَّزَ طَلَاقَ الثَّلَاثِ ' کے تحت لکھتے ہیں:

«وَفِي التَّرْجَمَةِ إِشَارَةٌ إِلَى أَنَّ مِنَ السَّلَفِ مَنْ لَمْ يُجِزْ وُقُوعَ الطَّلَاقِ الثَّلَاثِ»

"ترجمۃ الباب میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سلف میں ایسے لوگ رہے ہیں جو تین طلاق کے وقوع کو جائز قرار نہیں دیتے تھے۔"

پھر وہ اسی طلاق واحد بلفظ ثلاث کی حمایت کرتے ہوئے دعوائے اجماع کی حقیقت یوں بے نقاب کرتے ہیں:

«نُقِلَ عَنْ عَلِيٍّ وَابْنِ مَسْعُودٍ وَعَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عوفٍ وَالزُّبَيْرِ مِثْلُهُ، نَقَلَ ذٰلِكَ ابْنُ مُغِيثٍ فِي «كِتَابِ الْوَثَائِقِ» لَهُ وَعَزَاهُ لِمُحَمَّدِ بْنِ وَضَّاحٍ، وَنَقَلَ الْغَنَوِيُّ ذٰلِكَ عَنْ جَمَاعَةٍ مِنْ مَشَايِخِ قُرْطُبَةَ كَمُحَمَّدِ بْنِ تَقِي بْنِ مَخْلَدٍ وَمُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِالسَّلاَمِ الْخُشَنِيِّ وَغَيْرِهِمَا، وَنَقَلَهُ ابْنُ الْمُنْذِرِ عَنْ أَصْحَابِ ابْنِ عَبَّاسٍ كَعَطَاءٍ وَطَاؤُسٍ وَعَمْرِو بْنِ دِينَارٍ وَيَتَعَجَّبُ مِنِ ابْنِ التِينِ حَيْثُ جَزَمَ بِأَنَّ لُزُومَ الثَّلاَثِ لاَ اخْتِلاَفَ فِيهِ، وَإِنَّمَا الاخْتِلاَفُ فِي التَّحْرِيمِ مَعَ ثُبُوتِ الاخْتِلاَفِ كَمَا تَرَىٰ»(فتح الباري، الطلاق:٩/ ٤٥٠)

یعنی ”حضرت علی‘ ابن مسعود‘ عبدالرحمن بن عوف اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم بھی طلاق واحد بلفظ ثلاث کے قائل ہیں۔ اسی طرح مشائخ قرطبہ کی ایک جماعت جیسے محمد بن تقی بن مخلد اور محمد بن عبدالسلام الخشنی وغیرہ نیز اصحاب ابن عباس مثلاً عطاء‘ طاؤس‘ عمرو بن دینار بھی اسی کے قائل ہیں۔ ابن التین پر تعجب ہے کہ انہوں نے کس یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے کہ تین طلاق کے لزوم میں اختلاف نہیں ہے‘ اختلاف صرف تحریم میں ہے۔ باوجود اس بات کے کہ اختلاف ثابت ہے۔ جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔“

اس سے قبل حافظ صاحب نے محمد بن اسحاق صاحب مغازی کا بھی یہی مسلک بتایا ہے۔

امام عینی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

«وَفِيهِ خِلاَفٌ، فَذَهَبَ طَاؤُسٌ وَمُحَمَّدُ بْنُ إِسْحَاقَ وَالْحَجَّاجُ بْنُ أَرْطَاةَ وَالنخعِيُّ وَابْنُ مَقَاتِلٍ وَالظَّاهِرِيَّةُ إِلَى أَنَّ الرَّجُلَ إِذَا طَلَّقَ امْرَأَتَهُ ثَلاَثًا مَعًا فَقَدْ وَقَعَتْ عَلَيْهَا وَاحِدَةٌ»(عمدة القاري، الطلاق: ١٤/ ٢٣٦)

یعنی ”اس مسئلے میں اختلاف ہے‘ امام طاؤس‘ محمد بن اسحاق‘ حجاج بن ارطاۃ‘ نخعی‘ ابن مقاتل اور ظاہریہ اس طرف گئے ہیں کہ جب آدمی اپنی بیوی کو ایک ساتھ

تین طلاقیں دے تو وہ ایک ہی شمار ہوں گی۔"

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ شرح صحیح مسلم میں لکھتے ہیں:

«قَدِ اخْتَلَفَ الْعُلَمَاءُ فِيمَنْ قَالَ لِامْرَأَتِهِ: أَنْتِ طَالِقٌ ثَلَاثًا، فَقَالَ الشَّافِعِيُّ وَمَالِكٌ وَأَبُوحَنِيفَةَ وَأَحْمَدُ وَجَمَاهِيرُ الْعُلَمَاءِ مِنَ السَّلَفِ وَالْخَلَفِ: يَقَعُ الثَّلَاثُ وَقَالَ طَاوُسٌ وَبَعْضُ أَهْلِ الظَّاهِرِ لَا يَقَعُ بِذٰلِكَ إِلَّا وَاحِدَةٌ، وَهُوَ رِوَايَةٌ عَنِ الْحَجَّاجِ بْنِ أَرْطَاةَ، وَمُحَمَّدِ بْنِ إِسْحَاقَ وَالْمَشْهُورُ عَنِ الْحَجَّاجِ بْنِ أَرْطَاةَ أَنَّهُ لَا يَقَعُ بِهِ شَيْءٌ، وَهُوَ قَوْلُ ابْنِ مُقَاتِلٍ، وَرِوَايَةٌ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ إِسْحَاقَ»

(صحيح مسلم مع شرح نووي، باب طلاق الثلاث: ١٠/ ١٠٤)

"اس میں اختلاف ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں دے دینے کا کیا حکم ہے۔ امام شافعی' امام مالک' امام ابو حنیفہ' امام احمد اور جمہور علمائے سلف و خلف رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ اس طرح تین طلاقیں ہو جائیں گی' اور امام طاوس (تابعی) اور بعض اہل ظاہر اس کے قائل ہیں کہ اس طرح ایک ہی طلاق واقع ہوگی۔ یہی حجاج بن ارطاۃ اور محمد بن اسحاق سے مروی ہے' اگرچہ حجاج بن ارطاۃ کا مشہور قول یہ ہے کہ اس طرح کچھ بھی واقع نہیں ہوتا اور یہی قول ابن مقاتل کا ہے اور ایک روایت محمد بن اسحاق سے بھی یہی ہے۔"

دعوائے اجماع؟: علمائے امت کی ان تصریحات سے واضح ہو گیا ہے کہ ان کا مزعومہ مسئلہ اجماعی نہیں بلکہ اس میں ابتداء ہی سے اختلاف چلا آرہا ہے۔ اس سلسلے کی مزید صراحتیں ملاحظہ ہوں۔ جس سے دعوائے اجماع کی حقیقت بھی بے نقاب ہو جاتی ہے۔

امام طحاوی حنفی رحمۃ اللہ علیہ : حنفیہ کے جلیل القدر عالم امام طحاوی اسی بیک وقت طلاق ثلاثہ کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

«فَذَهَبَ قَوْمٌ إِلٰى أَنَّ الرَّجُلَ إِذَا طَلَّقَ امْرَأَتَهُ ثَلَاثًا مَعًا، فَقَدْ وَقَعَتْ عَلَيْهَا وَاحِدَةٌ إِذَا كَانَتْ فِي وَقْتِ سُنَّةٍ وَذٰلِكَ أَنْ تَكُونَ

طَاهِرًا فِي غَيْرِ جِمَاعٍ وَاحْتَجُّوا فِي ذٰلِكَ بِهٰذَا الْحَدِيثِ»(شرح معاني الآثار، باب الرجل يطلق امرأته ثلاثا معا: ۳/ ۵۵)

یعنی ''ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ مرد جب اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دے تو ایک ہی طلاق واقع ہو گی جب کہ وقت سنت میں یعنی اس وقت دی گئی ہو کہ وہ پاک ہو اور اس سے ہم بستری نہ کی گئی ہو اور دلیل ان کی یہی حدیث ہے۔'' (یعنی صحیح مسلم کی وہ حدیث جس کا پہلے ذکر ہوا ہے۔ جس میں یہ وضاحت ہے کہ عہد رسالت و عہد صدیقی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی تھیں۔)

مولانا عبدالحی حنفی لکھنوی: ایک اور حنفی محقق مولانا عبدالحی لکھنوی لکھتے ہیں:

«وَالْقَوْلُ الثَّانِي، أَنَّه إِذَا طَلَّقَ ثَلَاثًا تَقَعُ وَاحِدَةٌ رَجْعِيَّةٌ وَهٰذَا هُوَ الْمَنْقُولُ عَنْ بَعْضِ الصَّحَابَةِ وَبِهِ قَالَ دَاوُدُ الظَّاهِرِيُّ وَاتْبَاعُهُ وَهُوَ أَحَدُ الْقَوْلَيْنِ لِمَالِكٍ وَلِبَعْضِ أَصْحَابِ أَحْمَدَ»(عمدة الرعاية: ۲/ ۷۱ مطبع انوار محمدي لكهنو)

یعنی ''اس مسئلے میں اختلاف ہے (پہلے شیعی مسلک نقل کر کے لکھتے ہیں) اور دوسرا قول یہ ہے کہ جب ایک ساتھ تین طلاقیں دی جائیں تو وہ ایک رجعی طلاق ہوں گی۔ اور یہی بعض صحابہ سے منقول ہے اور اسی کے قائل داود ظاہری اور ان کے اتباع ہیں اور ایک قول کے مطابق یہی مذہب امام مالک اور امام احمد کے بعض اصحاب کا ہے۔''

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ: نے بھی اس مسئلہ کو اختلافی قرار دیا ہے اور درج ذیل صحابہ و تابعین اور دیگر ائمہ کو اس مسلک کا حامل بتلایا ہے۔

''حضرت علی، ابن مسعود، ابن عباس، زبیر بن عوام، عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم، طاؤس بعض اہل ظاہر، محمد بن اسحاق، حجاج بن ارطاۃ اور شیوخ قرطبہ میں سے ابن زنباع شیخ ہدی، محمد بن تقی بن مخلد، محمد بن عبدالسلام، اصبغ بن الحباب رحمۃ اللہ علیہم اور ان کے علاوہ ایک

جماعت۔ (تفسیر قرطبی' زیر تحت آیت الطلاق مرتان- ج: ۳' ص: 129' 132- طبع مصر)

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر کبیر میں اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ کے تحت لکھتے ہیں:

«ثُمَّ الْقَائِلُونَ بِهٰذَا الْقَوْلِ اخْتَلَفُوا عَلٰى قَوْلَيْنِ الأَوَّلُ: وَهُوَ اخْتِيَارُ كَثِيرٍ مِنْ عُلَمَاءِ الدِّينِ، أَنَّهُ لَوْ طَلَّقَهَا اثْنَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا لَا يَقَعُ إِلاَّ الوَاحِدَةَ، وَهٰذَا الْقَوْلُ هُوَ الأَقْيَسُ، لأَنَّ النَّهْيَ يَدُلُّ عَلَى اشْتِمَالِ الْمَنْهِيِّ عَنْهُ عَلٰى مَفْسَدَةٍ رَاجِحَةٍ، وَالْقَوْلُ بِالوُقُوعِ سَعْيٌ فِي إِدْخَالِ تِلْكَ الْمَفْسَدَةِ فِي الْوُجُودِ وَإِنَّهُ غَيْرُ جَائِزٍ، فَوَجَبَ أَنْ يَحْكُمَ بِعَدَمِ الْوُقُوعِ»(التفسير الكبير، الجزء السادس، ص:٩٦)

"بہت سے علمائے دین کا مسلک ہے کہ بیک وقت دو یا تین طلاقیں دینے کی صورت میں ایک ہی طلاق واقع ہو گی اور یہی قول قیاس کے سب سے زیادہ موافق ہے کیونکہ کسی چیز سے منع کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ چیز کسی بڑے مفسدے اور خرابی پر مشتمل ہے اور یہ مسلک وقوع (بیک وقت تین طلاقوں کو تینوں شمار کر لینا) اس مفسدے اور خرابی کو وجود میں لانے کا سبب ہے اور یہ بات جائز نہیں للذا عدم وقوع (یعنی بیک وقت تین طلاقوں کے نہ ہونے) کا حکم لگانا ضروری ہے۔"

قاضی ثناء اللہ حنفی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ تقریباً یہی بات قاضی ثناء اللہ حنفی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھی ہے:

«فَكَانَ الْقِيَاسُ أَنْ لاَّ يَكُونَ الطَّلْقَتَيْنِ الْمُجْتَمِعَتَيْنِ مُعْتَبَرَةً شَرْعًا وَإِذَا لَمْ يَكُنِ الطَّلْقَتَيْنِ مُعْتَبَرَةٌ لَمْ يَكُنِ الثَّلَاثُ مُجْتَمِعَةً مُعْتَبَرَةً بِالطَّرِيقِ الأَوْلٰى»

"پس قیاس کا اقتضاء یہ ہے کہ دو طلاق مجموعی شرعاً معتبر نہ ہوں اور جب دو طلاق مجموعی (اکٹھی) معتبر نہ ہوں گی تو بیک وقت تین طلاقیں بطریق اولیٰ معتبر نہ ہوں گی۔"

اگرچہ آگے چل کر انہوں نے مذہب حنفی کی حمایت میں وقوع طلاق ثلاثہ پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے اور طرفہ یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی اس مسئلے کا اختلافی ہونا تسلیم کر آئے

ہیں اور بعض حنابلہ کی مخالفت کا ذکر کیا ہے۔ پھر معلوم نہیں کہ مسئلہ اجماعی کیونکر ہو گیا؟

علامہ آلوسی بغدادی صاحب روح المعانی بھی اس مسئلے کو اختلافی تسلیم کرتے ہیں:

«وَخَالَفَ فِي ذٰلِكَ الإِمَامِيَّةُ وَبَعْضٌ مِنْ أَهْلِ السُّنَّةِ كَالشَّيْخِ، أَحْمَدَ بنِ تَيْمِيَّةَ وَمَنِ اتَّبَعَهُ»(تفسير روح المعاني: ٢/ ٢٠٦)

''اس بارے میں مشہور قول کی مخالفت امامیہ نے کی ہے اور اہل سنت کے بعض افراد بھی اس طرف گئے ہیں۔ جیسے امام ابن تیمیہ اور ان کے پیروکار۔''

امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

«وَاعْلَمْ أَنَّـهُ قَدْ وَقَعَ الْخِلاَفُ فِي الطَّلاَقِ الثَّلاَثِ إِذَا أُوْقِعَتْ فِي وَقْتٍ وَاحِدٍ، هَلْ يَقَعُ جَمِيعُهَا وَيَتْبَعُ الطَّلاَقُ الطَّلاَقَ أَمْ لاَ»
(نيل الأوطار: ٦/ ٢٦٠)

''جب یک وقت تین طلاقیں دی جائیں تو اس بارے میں اختلاف ہے کہ تینوں کی تینوں واقع ہو جاتی ہیں اور طلاق کے پیچھے طلاق ہو جاتی ہے یا نہیں؟''

پھر جمہور علماء کا مسلک (کہ ایسی صورت میں تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی) نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''اور اہل علم کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ طلاق کے پیچھے طلاق واقع نہیں ہوتی بلکہ ایسی صورت میں ایک ہی طلاق پڑے گی۔ حضرت ابو موسیٰ اور ایک روایت کی رُو سے حضرت علی' ابن عباس' طاؤس' عطاء' جابر بن زید معاوی' قاسم' باقر' ناصر' احمد بن عیسیٰ' عبداللہ بن موسیٰ بن عبداللہ اور ایک روایت کے مطابق زید بن علی کا یہی مسلک ہے۔ اور متاخرین کی ایک جماعت بھی اس طرف گئی ہے جس میں ابن تیمیہ' ابن القیم اور محققین کا ایک گروہ شامل ہے اور ابن مغیث نے کتاب الوثائق میں محمد بن وضاح کا بھی یہی مسلک نقل کیا ہے۔ نیز اسی مسلک پر مبنی مشائخ قرطبہ (جیسے محمد بن تقی اور محمد بن عبدالسلام) کا بھی ایک فتویٰ منقول ہے۔ علاوہ ازیں اسی کتاب میں انہوں نے حضرت علی' ابن مسعود' عبدالرحمن بن عوف

اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا یہی مسلک بیان کیا ہے۔"

پھر آگے چل کر طلاق ثلاثہ بہ لفظ واحد کے مسلک پر لوگوں کی توجیہات کا رد کرتے ہوئے (کہ شاید ایک طلاق والا حکم منسوخ ہو گیا ہو) لکھتے ہیں:

«وَيُجَابُ بِأَنَّ النَّسْخَ إِنْ كَانَ بِدَلِيلٍ مِنْ كِتَابٍ أَوْ سُنَّةٍ فَمَا هُوَ؟ وَإِنْ كَانَ بِالإِجْمَاعِ فَأَيْنَ هُوَ؟ عَلَى أَنَّهُ يَبْعُدُ أَنْ يَسْتَمِرَّ النَّاسُ أَيَّامَ أَبِي بَكْرٍ وَبَعْضَ أَيَّامِ عُمَرَ عَلَى أَمْرٍ مَنْسُوخٍ وَإِنْ كَانَ النَّاسِخُ قَوْلُ عُمَرَ الْمَذْكُورُ فَحَاشَاهُ أَنْ يَنْسَخَ سُنَّةً ثَابِتَةً بِمَحْضِ رَأْيِهِ، وَحَاشَا أَصْحَابُ رَسُولِ اللهِ ﷺ أَنْ يُجِيبُوهُ إِلَى ذٰلِكَ وَمِنَ الأَجْوِبَةِ دَعْوَى الإِضْطِرَابِ كَمَا زَعَمَهُ الْقُرْطُبِيُّ فِي الْمُفْهِمِ، وَهُوَ زَعْمٌ فَاسِدٌ لاَ وَجْهَ لَهُ، وَمِنْهَا مَا قَالَهُ ابْنُ الْعَرَبِيُّ: إِنَّ هٰذَا حَدِيثٌ مُخْتَلَفٌ فِي صِحَّتِهِ فَكَيْفَ يُقَدَّمُ عَلَى الإِجْمَاعِ؟ وَيُقَالُ أَيْنَ الإِجْمَاعُ الَّذِي جَعَلْتَهُ مُعَارِضًا لِلسُّنَّةِ الصَّحِيحَةِ ... وَالْحَاصِلُ أَنَّ الْقَائِلِينَ بِالتَّتَابُعِ قَدِ اسْتَكْثَرُوا مِنَ الأَجْوِبَةِ عَلَى حَدِيثِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَكُلُّهَا غَيْرُ خَارِجَةٍ عَنْ دَائِرَةِ التَّعَسُّفِ وَالْحَقُّ أَحَقُّ بِالاتِّبَاعِ، فَإِنْ كَانَتْ تِلْكَ الْمُحَامَاةُ لأَجْلِ مَذَاهِبِ الأَسْلاَفِ فَهِيَ أَحْقَرُ وَأَقَلُّ مِنْ أَنْ تُؤْثَرَ عَلَى السُّنَّةِ الْمُطَهَّرَةِ وَإِنْ كَانَتْ لأَجْلِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَأَيْنَ يَقَعُ الْمِسْكِينُ مِنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ، ثُمَّ أَيُّ مُسْلِمٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ يَسْتَحْسِنُ عَقْلَهُ وَعِلْمَهُ تَرْجِيحَ قَوْلِ صَحَابِي عَلَى قَوْلِ الْمُصْطَفَى ﷺ»(نيل الأوطار: ٦/ ٢٦٢، ٢٦٣)

"نسخ کے جواب میں ہم کہیں گے کہ اگر پہلا حکم (ایک طلاق والا) کتاب و سنت کی کسی دلیل سے منسوخ ہوا ہے تو وہ دلیل کہاں ہے؟ اور اگر کہا جائے کہ "اجماع" سے وہ حکم منسوخ ہو گیا ہے تو اجماع ثابت کب ہے؟ علاوہ ازیں یہ بات بھی بڑی بعید ہے کہ لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی

عہد خلافت میں ایک منسوخ حکم پر مسلسل عمل کرتے رہے ہوں؟ اور اگر دعویٰ کیا جائے کہ ناسخ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول مذکور (تین طلاق والا تدبیری اقدام) ہے تو یہ بھی ناقابل یقین ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ محض اپنی رائے سے ایک سنت ثابتہ کو منسوخ کر دیں؟ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق بھی اس تصور سے ہم پناہ مانگتے ہیں کہ وہ اس معاملہ (اپنی رائے سے سنت کو منسوخ کرنے) میں حضرت عمر کا ساتھ دیتے۔ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق دعوائے اضطراب بھی زعم فاسد ہے جس کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے اسی طرح یہ کہنا کہ حدیث ابن عباس کی صحت مختلف فیہ ہے' اس لیے اسے اجماع پر مقدم نہیں کیا جا سکتا' غلط ہے' آخر وہ اجماع ہے کہاں جو ایک سنت صحیحہ کے معارض (مخالف) ہے---؟ بہرحال پے در پے (بیک وقت تین) طلاق کے قائلین نے حدیث ابن عباس کے بہت سے جواب دیے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی تکلف تعسّف سے خالی نہیں۔ پیروی کے لائق حق بات ہی ہے۔ علاوہ ازیں یہ رد و قدح اگر اپنے اسلاف کے نقطہ ہائے نظر کی حمایت کے لیے ہے تو ظاہر ہے کہ یہ اس لائق نہیں کہ انہیں سنت مطہرہ کے مقابلے میں ترجیح دی جائے اور اگر یہ عمر بن الخطاب کی حمایت میں ہے تب بھی ظاہر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کیا حیثیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں ہو سکتی ہے؟ پھر کون سا مسلمان ایسا ہے کہ اس کی عقل اور اس کا علم قول صحابی کو قول مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ترجیح دینے کو پسند کرے؟"

ابن رشد رحمہ اللہ: مشہور مالکی فقیہ ابو الولید ابن رشد قرطبی لکھتے ہیں:

«جُمْهُورُ فُقَهَاءِ الأَمْصَارِ عَلَى أَنَّ الطَّلَاقَ بِلَفْظِ الثَّلَاثِ حُكْمُهُ حُكْمُ الطَّلْقَةِ الثَّالِثَةِ، وَقَالَ أَهْلُ الظَّاهِرِ وَجَمَاعَةٌ: حُكْمُهُ حُكْمُ الْوَاحِدَةِ وَلَا تَأْثِيرَ لِلَفْظِ فِي ذٰلِكَ»(بداية المجتهد، الطلاق: ٢/ ١٠٤)

"جمہور فقہاء کا کہنا یہ ہے کہ تین کے لفظ سے جو طلاق دی جائے گی۔ اس کا حکم تیسری طلاق (یعنی مُغلَّظه) کا ہے اور اہل ظاہر اور ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ

ایسی طلاق (یعنی بہ لفظ ثلاث) کا حکم ایک طلاق کا حکم ہے اور اس میں لفظ کی کوئی تاثیر نہیں۔"

اس کے بعد دونوں مسالک کے دلائل ذکر کرتے ہیں اور پھر آخر میں لکھتے ہیں:

«كَأَنَّ الْجُمْهُورَ غَلَبُوا حُكْمَ التَّغْلِيظِ فِي الطَّلَاقِ سَدًا لِلذَّرِيعَةِ وَلٰكِنْ تَبْطُلُ بِذٰلِكَ الرُّخْصَةُ الشَّرْعِيَّةُ، وَالرِّفْقُ الْمَقْصُودُ»

"گویا جمہور نے سد ذریعہ کے طور پر طلاق میں تغلیظ کا حکم لگایا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس سے وہ شرعی رخصت اور سہولت باطل ہو جاتی ہے جو مقصود ہے۔"

یعنی بیک وقت تین طلاقوں کو تین شمار کر لینے سے وہ رخصت و سہولت ختم ہو جاتی ہے جو متعدد مواقع پر طلاق دینے میں ہے۔ اس طرح ان کا اپنا رجحان یہی معلوم ہوتا ہے کہ بیک وقت تین طلاقوں کو ایک ہی طلاق شمار کرنا چاہیے تاکہ شرعی رخصت و سہولت سے لوگ محروم نہ ہوں۔

<u>ہمارے دور کے علمائے عرب و عجم:</u> یہ تو حوالے تھے علمائے متقدمین و متاخرین کے، جن میں ہر مکتب فکر کے علماء شامل ہیں۔ ان چند حوالوں سے یہ بات واضح ہے کہ عہد صحابہ ہی سے یہ مسئلہ مختلف فیہ چلا آ رہا ہے اور اس کی بابت اجماع کا دعویٰ کرنا اور یہ کہنا کہ "مجھے کسی صحابی یا تابعی کا علم نہیں جس نے اس مسئلے میں اختلاف کیا ہو۔" یکسر غلط ہے صحابہ و تابعین میں بھی بیک وقت دی گئیں طلاق ثلاثہ کو ایک طلاق شمار کرنے والے موجود تھے اور بعد کے ائمہ و مجتہدین میں بھی ایک جماعت اس کی قائل چلی آ رہی ہے بالخصوص اہلحدیث جو ہر دَور میں حق کا چراغ جلاتے آئے ہیں، اسی کے قائل چلے آ رہے ہیں۔

یہ بات مزید دلچسپی کا باعث ہے کہ موجودہ دور کے علماء نے بھی اس مسئلے کو نہ صرف اپنے غور و فکر کا موضوع بنایا ہے بلکہ اہل حدیث نقطۂ نظر کی پُرزور حمایت و وکالت کی ہے۔ ان علماء میں برصغیر پاک و ہند کے علماء بھی ہیں اور مصر و شام کے علماء بھی نیز وہ ہر مکتب فکر کی نمائندگی کرنے والے ہیں حتی کہ ان میں دیوبندی حنفی بھی ہیں اور بریلوی حنفی بھی۔ لیجیے اب اس کی تفصیل بھی ملاحظہ فرما لیجیے جو درحقیقت اس مسئلے پر اجماع کا دعویٰ

کرنے والوں کے لیے شاید ایک "انکشاف" سے کم نہ ہو۔

علمائے عرب: مصر کے نامور عالم عبدالرحمٰن الجزیری اپنی مشہور کتاب " الفقه على المذاهب الاربعة " میں اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے پہلے ان صحابہ و تابعین کے اسمائے گرامی درج کرتے ہیں جو ایک طلاق کے قائل ہیں، پھر صحیح مسلم کی وہ حدیث نقل کر کے جو ان کے مسلک کی مضبوط بنیاد ہے۔ لکھتے ہیں:

«وَهٰذَا الْحَدِيثُ صَرِيحٌ فِي أَنَّ الْمَسْأَلَةَ لَيْسَتْ إِجْمَاعِيَّةً»

"یہ حدیث اس بات میں صریح ہے کہ یہ مسئلہ اجماعی نہیں ہے۔"

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اقدام کی توجیہ کرتے ہوئے دعوائے اجماع کی یوں نفی کرتے ہیں:

«وَلٰكِنَّ الْوَاقِعَ أَنَّهُ لَمْ يُوجَدْ إِجْمَاعٌ، فَقَدْ خَالَفَهُمْ كَثِيرٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ، وَمِمَّا لاَ شَكَّ فِيهِ أَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ مِنَ الْمُجْتَهِدِينَ الَّذِينَ عَلَيْهِمِ الْمُعَوَّلُ فِي الدِّينِ، فَتَقْلِيدُهُ جَائِزٌ، كَمَا ذَكَرْنَا، وَلاَ يَجِبُ تَقْلِيدُ عُمَرَ فِيمَا رَاٰهُ، لأَنَّهُ مُجْتَهِدٌ وَمُوَافَقَةُ الأَكْثَرِينَ لَهُ لاَ تُحَتِّمُ تَقْلِيدَهُ، عَلٰى أَنَّهُ يَجُوزُ أَنْ يَكُونَ قَدْ فَعَلَ ذٰلِكَ لِتَحْذِيرِ النَّاسِ مِنْ إِيقَاعِ الطَّلاَقِ عَلٰى وَجْهٍ مُغَايِرٍ لِلسُّنَّةِ فَإِنَّ السُّنَّةَ أَنْ تُطَلَّقَ الْمَرْأَةُ فِي أَوْقَاتٍ مُخْتَلِفَةٍ عَلَى الْوَجْهِ الَّذِي تَقَدَّمَ بَيَانُهُ، فَمَنْ يَجْرَأُ عَلٰى تَطْلِيقِهَا دَفْعَةً وَاحِدَةً فَقَدْ خَالَفَ السُّنَّةَ، وَجَزَاءُ هٰذَا أَنْ يُعَامَلَ بِقَوْلِهِ زَجْرًا لَهُ وَبِالْجُمْلَةِ فَإِنَّ الَّذِينَ قَالُوا أَنَّ الطَّلاَقَ الثَّلاَثَ بِلَفْظٍ وَاحِدٍ يَقَعُ بِهِ وَاحِدَةً لاَ ثَلاَثَ لَهُمْ وَجْهٌ سَدِيدٌ وَهُوَ أَنَّ ذٰلِكَ هُوَ الْوَاقِعُ فِي عَهْدِ الرَّسُولِ، وَعَهْدِ خَلِيفَةِ الأَعْظَمِ أَبِي بَكْرٍ، وَسَنَتَيْنِ مِنْ خِلاَفَةِ عُمَرَ، وَاجْتِهَادُ عُمَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ خَالَفَهُ فِيهِ غَيْرُهُ، فَيَصِحُّ تَقْلِيدُ الْمُخَالِفِ، كَمَا يَصِحُّ تَقْلِيدُ عُمَرَ»(الفقه على مذاهب الأربعة: ٤/ ٣٤١، ٣٤٢)

"لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس پر اجماع موجود ہی نہیں، کیونکہ بہت سے مسلمانوں نے

ان (جمہور) کی مخالفت کی ہے۔ (مثلاً) ابن عباس بلاشبہ مجتہدین میں سے تھے اور ایسے کہ جن پر دین کے معاملے میں اعتماد کیا جاتا ہے۔ لہٰذا آپ کی تقلید (آپ کی رائے کو تسلیم کر لینا) بھی درست ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کی تقلید واجب نہیں کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہ بھی مجتہد تھے۔ اکثریت کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے موافقت کر لینا ان کی تقلید کو ضروری نہیں کر دیتا۔ علاوہ ازیں یہ بھی تو ممکن ہے کہ آپ نے تعزیر کی غرض سے اسے نافذ کیا ہو یہ دیکھ کر کہ لوگ خلاف سنت طریقے پر طلاق دے رہے ہیں۔ کیونکہ سنت یہی ہے کہ عورت کو مختلف اوقات میں بیان کردہ طریقے کے مطابق طلاق دی جائے۔ پس جو شخص یکبارگی (تین) طلاق دینے کی جرأت کرتا ہے وہ سنت کے خلاف کرتا ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ اس کے ساتھ زجر و توبیخ کا معاملہ کیا جائے۔ مختصر یہ کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ تین طلاقیں بہ لفظ واحد ایک ہی واقع ہوتی ہے تین نہیں۔ ان کا کہنا اپنے اندر بڑی معقول وجہ رکھتا ہے کیونکہ عہد رسالت' خلیفہ اعظم ابوبکر کے عہد اور خلافت عمر کے ابتدائی دو برسوں تک ایک ہی طلاق واقع ہوتی تھی۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو اجتہاد کیا' اس کی دوسرے کئی لوگوں نے مخالفت کی ہے۔ لہٰذا مخالفت کرنے والوں کی تقلید بھی اسی طرح صحیح ہے جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تقلید کو درست قرار دیا جا رہا ہے۔"

علامہ سید رشید رضا مصری مرحوم: تفسیر "المنار" میں زیر تحت آیت ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ﴾ پہلے اس مسئلے کا اختلافی ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ وَلِذٰلِكَ وَقَعَ فِيْهِ الْخِلَافُ مِنَ الصَّدْرِ الْاَوَّلِ اِلَى الْاٰنَ (اس مسئلے میں صدرِ اوّل سے آج تک اختلاف چلا آ رہا ہے) پھر فریقین کے دلائل ذکر کرنے کے بعد (جس میں ایک طلاق کے قائلین کے دلائل قدرے تفصیل سے نقل کیے ہیں) لکھتے ہیں:

«إِنَّمَا أَطَلْنَا فِي ذِكْرِ الْخِلَافِ فِي هٰذِهِ الْمَسْئَلَةِ عَلٰى تَحَامِينَا فِي التَّفْسِيرِ ذِكْرَ الْخِلَافِ مَا وَجَدْنَا مَنْدُوحَةً عَنْهُ لأَنَّ بَعْضَ النَّاسِ

يَعْتَقِدُونَ أَنَّ الْمَسْأَلَةَ اجْمَاعِيَّةٌ فِيمَا جَرٰى عَلَيْهِ الْجُمْهُورُ وَمَا ثَمَّ مِنْ إِجْمَاعٍ إِلاَّ مَا قَالَهُ ابْنُ الْقَيِّمِ، وَلَيْسَ الْمُرَادُ مُجَادِلَةُ الْمُقَلِّدِينَ أَوْ إِرْجَاعُ الْقُضَاةِ وَالْمُفْتِينَ عَنْ مَذَاهِبِهِمْ فِيهَا فَإِنَّ أَكْثَرَهُمْ يَطَّلِعُ عَلٰى هٰذِهِ النُّصُوصِ فِي كُتُبِ الْحَدِيثِ وَغَيْرِهَا وَلاَ يُبَالِي بِهَا لأَنَّ الْعَمَلَ عِنْدَهُمْ عَلٰى أَقْوَالِ كُتُبِهِمْ دُونَ كِتَابِ اللهِ تَعَالٰى وَسُنَّةِ رَسُولِهِ(حاشيه) أَلاَ إِنَّ مَحَاكِمَ مِصْرَ الشَّرْعِيَّةَ قَدْ خَالَفَتْ مَذْهَبَ الْحَنَفِيَّةِ بَعْدَ اسْتِقْلاَلِ الْبِلاَدِ دُونَ الدَّوْلَةِ الْعُثْمَانِيَّةِ فِي كَثِيرٍ مِنْ أَحْكَامِ الزَّوْجِيَّةِ وَمِنْهَا هٰذِهِ الْمَسْئَلَةُ»(تفسير المنار: ٢/ ٣٨٣ـ٣٨٧ طبع ثاني ١٣٥٠هـ مصر)

"ہم نے اپنی تفسیر میں اختلافی مسائل میں عدم اعتناء کے باوجود اس مسئلے میں تفصیل اس لیے پیش کی ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس بارے میں جمہور کے مسلک پر اجماع ہے۔ حالانکہ (یہ بات صحیح نہیں) اگر اجماع ہے تو وہ ہے جس کی صراحت حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے کی ہے۔ (یعنی عہد رسالت و عہد صدیقی اور عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی عہد خلافت تک بیک وقت تین طلاقوں کو ایک طلاق شمار کرنے پر اتفاق و اجماع) ہمارا مقصد مقلدین سے بحث و مجادلہ ہے نہ قاضیوں اور مفتیوں کو ان کے (فقہی) مذاہب سے رجوع کرنے پر مجبور کرنا کیونکہ (ایسا کرنے پر وہ آمادہ ہوں گے ہی نہیں) ان کی اکثریت کا یہ حال ہے کہ وہ کتب حدیث وغیرہ میں نصوص شرعیہ پر مطلع بھی ہو جاتے ہیں لیکن پھر بھی ان کی قطعاً پروا نہیں کرتے' ان کے نزدیک قابل عمل صرف وہ اقوال ائمہ ہیں جو ان کی (فقہی) کتابوں میں درج ہیں نہ کہ اللہ کی کتاب اور سنت رسول۔ البتہ مصر کی مذہبی عدالتوں نے دولت عثمانیہ سے علیحدگی کے بعد زوجیت کے بہت سے احکام میں حنفی مذہب کی مخالفت کی ہے' انہی میں سے ایک مسئلہ طلاق ثلاثہ بیک مجلس کا ہے جس میں انہوں نے حنفی مذہب کے خلاف اس کو ایک طلاق شمار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

شیخ جمال الدین قاسمی: عہد حاضر کے ایک اور جلیل القدر عالم اور مفسر شیخ جمال الدین قاسمی شامی نے نکاح و طلاق کے موضوع پر ایک فاضلانہ کتاب الاستیناس لتصحیح انکحۃ الناس لکھی ہے۔ اس میں انہوں نے طلاق کے مسئلہ پر مدلل و مفصل گفتگو کے بعد یہی رائے ظاہر کی ہے کہ جو تین طلاقیں ایک مجلس میں بیک دفعہ دی جائیں ان سے ایک طلاق رجعی ہی واقع ہو گی۔

علمائے پاک و ہند: برصغیر پاک و ہند کے جن علماء نے اس موضوع پر اپنے نتائج مطالعہ و تحقیق پیش کیے ہیں' ان میں علمائے اہلحدیث کے علاوہ (کہ وہ تو تقریباً سب ہی اس مسئلے پر متفق ہیں) مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدیر ماہنامہ "برہان" دہلی' مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب صدر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت' مولانا حامد علی صاحب سیکرٹری جماعت ہند مولانا عروج احمد قادری مدیر ماہنامہ "زندگی" رامپور' مولانا شمس پیرزادہ' مولانا محفوظ الرحمٰن فاضل دیوبند ہیں۔

چنانچہ ہندوستان کے بعض درد مند حضرات نے مسئلہ "تطلیقاتِ ثلاثہ" کے موضوع پر ایک سیمینار (مجلس مذاکرہ' ۴ تا ۶ نومبر ۱۹۷۳ء) اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ احمد آباد (ہند) میں منعقد کرایا۔ جس میں مذکورہ حضرات اور دو اہلحدیث علماء مولانا عبدالرحمٰن صاحب اور مولانا مختار احمد صاحب ندوی شریک ہوئے۔ سیمینار میں حصہ لینے والے حضرات کی خدمت میں حسب ذیل سوالنامہ روانہ کیا گیا تھا تاکہ وہ اس کی روشنی میں اپنے مقالات مرتب کر سکیں' اور اپنے نقطۂ نظر کو مدلل طور پر پیش کرنے کے ساتھ ان سوالات کے جوابات بھی دے سکیں۔

۱) کیا محض طلاق کا لفظ تین مرتبہ دہرانے سے یعنی بیک وقت طلاق' طلاق' طلاق کہہ دینے سے تین طلاق واقع ہو جاتی ہیں جب کہ طلاق دینے والا شخص کہتا ہو کہ میری نیت صرف ایک طلاق کی تھی۔

۲) کوئی شخص ایک مجلس میں تین طلاقیں دیتا ہے' لفظ "تین" کی صراحت کے ساتھ۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ میں سمجھ رہا تھا کہ تین کا لفظ جب تک استعمال نہ کیا جائے' طلاق واقع ہوتی ہی نہیں۔ اس صورت میں تین طلاقیں واقع ہوں گی یا ایک؟

۳) کیا ایک مجلس کی تین طلاقوں کے مغلظ ہونے پر امت کا اجماع ہے؟ اگر نہیں تو ان علماء اور فقہاء کے نام تحریر فرمائیں جو ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دیتے ہیں۔

۴) آپ کے نزدیک ایک مجلس کی تین طلاقوں کے مسئلے کا کیا حل ہے؟ اسے ایک شمار کیا جانا چاہیے یا تین؟

مذکورہ شریک ۸ حضرات میں سے ۷ علماء نے مقالے مرتب کیے۔ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے مقالہ تو نہیں پڑھا' صدارتی کلمات میں مجلس میں پڑھے گئے مقالات پر جامع تبصرہ فرمایا اور مسئلہ زیر بحث کو اختلافی تسلیم کرتے ہوئے اس کے مناسب حل پر زور دیا اور اس مسئلے میں علماء کو توسع پیدا کرنے کی تلقین کی۔ ان میں سے صرف مولانا عروج قادری صاحب نے اپنے مقالے میں حنفی نقطۂ نظر پیش کیا تاہم انہوں نے بھی مسئلے کی نزاکت کے پیش نظر ایک معتدل راہ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ باقی تمام حضرات نے اس مسئلے میں ایک تو اجماع کے دعوے کی نفی کی ہے۔ اور صاف اعتراف کیا ہے کہ یہ مسئلہ عہد صحابہ سے ہی مختلف فیہ چلا آرہا ہے اور دوسرے انہوں نے مسئلے کا وہی حل پیش کیا ہے۔ جس کے اہل حدیث قائل ہیں کہ بیک وقت دی گئیں تین طلاقوں کو ایک طلاق شمار کیا جائے۔ مزید برآں اس نقطۂ نظر کی حمایت میں انہوں نے قرآن و حدیث اور کتب فقہ سے ایسے ٹھوس دلائل پیش کیے ہیں جس کے بعد فقہی جمود پر اصرار کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں رہتی۔ جزاھم اللہ احسن الجزاء۔

سیمینار کی پوری کارروائی' مقالات اور ان پر اعتراضات کے جوابات یہ سب ایک کتابی شکل میں۔ ایک مجلس کی تین طلاق' قرآن وسنت کی روشنی میں۔ کے عنوان سے چھپ گئے ہیں۔

مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی کا فتویٰ: اسی کتاب کے ایک مقالے میں (جو مولانا محفوظ الرحمٰن قاسمی کا ہے) مولانا کفایت اللہ دہلوی کا ایک فتویٰ بھی درج ہے۔ کسی سائل نے اسی طلاق ثلاثہ کے متعلق دریافت کیا تھا سائل کے گاؤں میں ایک واقعہ ایسا ہوا تھا کہ ایک حنفی شخص نے تین طلاق دینے کے بعد کسی اہل حدیث عالم سے فتویٰ پوچھ کر رجوع کر لیا۔ اب

گاؤں کے لوگوں نے اس کا بائیکاٹ کر دیا۔ مفتی صاحب مرحوم نے حسب ذیل جواب دیا:

"ایک مجلس میں تین طلاق دینے سے تینوں پڑ جانے کا مذہب جمہور علماء کا ہے اور ائمہ اربعہ اس پر متفق ہیں۔ ائمہ اربعہ کے علاوہ وہ بعض علماء اس کے ضرور قائل ہیں کہ اس طرح ایک رجعی طلاق ہوتی ہے اور یہ مذہب اہل حدیث حضرات نے بھی اختیار کیا ہے اور حضرت ابن عباس' طاؤس' عکرمہ اور ابن اسحاق سے منقول ہے۔ پس کسی اہل حدیث کو اس حکم کی وجہ سے کافر کہنا درست نہیں اور نہ وہ قابل مقاطعہ اور مستحق اخراج از مسجد ہے۔ ہاں حنفی کا اہل حدیث سے فتویٰ حاصل کرنا اور اس پر عمل کرنا باعتبار فتویٰ ناجائز تھا' لیکن اگر وہ بھی مجبوری اور اضطرار کی حالت میں اس کا مرتکب ہو تو قابل درگزر ہے۔" (اخبار "الجمعیۃ" دہلی' ۱۶ دسمبر ۱۹۳۱ء - محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ' مدرسہ امینیہ دہلی)

ایک اور فتویٰ: اسی مدرسہ امینیہ دہلی کا ایک اور فتویٰ حسب ذیل ہے:

"اور بعض سلف صالحین اور علمائے متقدمین میں سے اس کے بھی قائل ہیں اگرچہ ائمہ اربعہ میں یہ بعض نہیں ہیں' لہٰذا جن مولوی صاحب نے مفتیٔ اہلحدیث پر جو فتویٰ دیا ہے' یہ غلط ہے اور مفتیٔ اہلحدیث پر اس اختلاف کی بنا پر کفر و مقاطعہ و اخراج از مسجد کا فتویٰ غیر صحیح ہے۔ بوجہ شدید ضرورت اور خوفِ مفاسد کے اگر طلاق دینے والا ان بعض علماء کے قول پر عمل کرے گا جن کے نزدیک اس واقعۂ مرقومہ میں ایک ہی طلاق ہوتی ہے تو وہ خارج از مذہب حنفی نہ ہو گا کیونکہ فقہائے حنفیہ نے بوجہ شدتِ ضرورت کے دوسرے امام کے قول پر عمل کر لینے کو جائز لکھا ہے۔" (دستخط حبیب المرسلین عفی عنہ' مہر دارالافتاء مدرسہ امینیہ دہلی' (کتاب مذکور' ص: ۲۹-۳۰' طبع احمد آباد بھارت)

غیر منقسم ہندوستان میں مفتی کفایت اللہ دہلوی مرحوم اور ان کے مدرسہ امینیہ کی جو حیثیت احناف کے ہاں تھی' وہ محتاج تعارف نہیں۔ یہ دو فتوے ہم نے اس لیے نقل کیے ہیں کہ ان سے ایک تو یہ واضح ہو رہا ہے کہ یہ مسئلہ اجماعی نہیں ہے۔ (جیسا کہ مدیر

"بینات" نے دعویٰ فرمایا) بلکہ صحابہ و تابعین میں سے بھی کئی حضرات اس کے قائل تھے۔

دوسرے' اس مذہب کے اختیار کرنے والے پر نقد و جرح صحیح نہیں حتی کہ کوئی حنفی بھی اس پر عمل کرے تو وہ بھی قابل ملامت نہیں چہ جائیکہ اہلحدیث حضرات کو اس مسئلے کی بنا پر اجماعِ امت کا منکر گردان کر انہیں امت اسلامیہ سے خارج کرنے کا فتویٰ داغ دیا جائے جیسا کہ مدیر "بینات" کا رجحان معلوم ہوتا ہے۔

تیسرے' اس فتویٰ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق صرف ائمہ اربعہ کے اندر منحصر نہیں ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے مذاہب بھی صحیح ہیں کیونکہ ان کے مسائل قرآن و حدیث پر مبنی ہیں بالخصوص مذہب اہلحدیث۔

بریلوی (حنفی) عالم کی تائیدی کتاب : اس مسئلے پر پاکستان کے ایک مشہور سجادہ نشین بریلوی عالم جسٹس پیر کرم شاہ ازہری جج سپریم کورٹ' پاکستان نے ایک کتاب بعنوان "دعوتِ غور و فکر" لکھی تھی' جس سے ان کا مقصد علمائے احناف کو اس مسئلے میں تقلیدی جمود سے ہٹ کر خالص قرآن و حدیث کی روشنی میں غور و فکر کی دعوت دینا تھا۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ مسئلہ "بیک وقت دی گئیں تین طلاقوں کو ایک شمار کرنا" قرآن و حدیث کے مطابق ہے۔ اپنی کتاب میں انہوں نے اس مسلک کی پر زور حمایت کی ہے۔ چنانچہ موصوف دونوں کے دلائل کا تجزیہ کرتے ہوئے کتاب کے بالکل آخر میں لکھتے ہیں:

> "مسئلے کے سارے پہلو آپ کے سامنے ہیں۔ اس کی عقلی اور نقلی دلیلیں اور ان پر ہر طرح کی ردّ و قدح بھی آپ نے ملاحظہ فرما لی۔ اب آپ خود اس کے متعلق فیصلہ فرما سکتے ہیں۔ اس ناچیز کی ناقص رائے میں تو ان حالات میں علماء مصر اور علمائے ازہر کے فتوے (یعنی بیک وقت تین طلاقوں کو ایک طلاق ماننا) کے مطابق عمل کرنا ارجح ہے۔" (ص: ۱۴۸)

مسلم ممالک میں طلاق کا قانون : کتاب "ایک مجلس کی تین طلاق - قرآن و سنّت کی روشنی میں" مسلم ممالک کے متعلق ایک مقالہ نگار مولانا شمس پیرزادہ صاحب نے حسب ذیل صراحت کی ہے:

"مسلم ممالک نے تطلیقاتِ ثلاثہ کے سلسلے میں جو قوانین بنائے ہیں۔ ان کی حیثیت شرعی حجت کی ہرگز نہیں ہے۔ اس لیے ان قوانین کو دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم یہ معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ کن ممالک نے اس سلسلے میں اقدامات کیے ہیں۔ اسی مقصد کے پیش نظر یعنی بغرض معلومات اس کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

سب سے پہلے مصر نے ۱۹۲۹ء میں آنِ واحد کی تین طلاقوں کے اصول کو ختم کر دیا اور قانون یہ بنایا کہ متعدد طلاقیں صرف ایک طلاق شمار ہو گی اور وہ رجعی ہو گی۔ (پیر کرم شاہ ازہری نے بھی اپنی مذکورہ کتاب میں اس مصری قانون کی مختصر تفصیل پیش کی ہے اور اس کے حوالے سے پاکستان کے حنفی علماء کو بھی یہی مسلک اپنانے کی تلقین کی ہے) اسی قسم کا قانون سوڈان نے ۱۹۳۵ء میں' اردن نے ۱۹۵۱ء میں' شام نے ۱۹۵۳ء میں' مراکش نے ۱۹۵۸ء میں' عراق نے ۱۹۵۹ء میں اور پاکستان نے ۱۹۶۱ء میں نافذ کیا۔" (کتاب مذکور' ص: ۶۸-۶۹)

اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح مدیر "بینات" کا یہ کہنا کہ "انہیں اس مسئلے میں کسی صحابی یا تابعی کے اختلاف کا علم نہیں" بے بنیاد ہے کیونکہ ان کی لاعلمی اس بات کو مستلزم نہیں کہ صحابہ و تابعین میں سے فی الواقع کوئی بھی اس دوسرے مسلک کا قائل نہیں۔ اسی طرح دعوائے اجماعِ امت کی حقیقت بھی بے نقاب ہو جاتی ہے۔ جس "اجماع" سے انحراف پر مدیر "بینات" نے اہلحدیث کو شیعوں کا پیروکار بنا دیا ہے۔ کیونکہ "اجماع" کے متعلق خود اصول فقہ حنفی میں یہ لکھا ہے:

«وَالشَّرْطُ إِجْمَاعُ الْكُلِّ وَخِلَافُ الْوَاحِدِ مَانِعٌ كَخِلَافِ الْأَكْثَرِ يَعْنِي فِي حِينَ اِنْعِقَادِ الإِجْمَاعِ لَوْ خَالَفَ وَاحِدٌ كَانَ خِلَافُهُ مُعْتَبَرًا وَلَا يَنْعَقِدُ الإِجْمَاعُ لِأَنَّ لَفْظَ الْأُمَّةِ فِي قَوْلِهِ لَا تَجْتَمِعُ أُمَّتِي عَلَى الضَّلَالَةِ يَتَنَاوَلُ الْكُلَّ فَيَحْتَمِلُ أَنْ يَكُونَ الصَّوَابُ مَعَ الْمُخَالِفِ»

(نور الأنوار، ص: ۲۲۱ بحث اجماع)

"اجماع کے لیے "کل" کا اتفاق شرط ہے اور ایک کا اختلاف بھی اجماع کے انعقاد

میں اسی طرح مانع ہو گا جس طرح بہتوں کا اختلاف ہے۔ اس لیے اجماع کے وقت اگر ایک بھی مخالف ہو گا تو اجماع منعقد نہ ہو گا کیونکہ امت کا لفظ حدیث (میری امت گمراہی پر مجتمع نہیں ہو گی) میں کل امت کو شامل ہے۔ پس ہو سکتا ہے کہ صواب (حق) مخالف کی جانب ہو (اور باقی سب غلطی پر ہوں۔)"

ایک طلاق پر اجماع قدیم: اس صراحت کے بعد ہر انصاف پسند آج کل کے بعض احناف کے دعوائے اجماع کی حقیقت کا اندازہ لگا سکتا ہے جو وہ مسئلہ تطلیقاتِ ثلاثہ میں کرتے ہیں۔ اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلے میں جو نقطۂ نظر اہلحدیث کا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہادی و تدبیری اقدام سے پہلے اس پر پوری امت کا اجماع تھا یعنی عہد رسالت و عہد صدیقی اور عہد عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دو تین سالوں تک پوری امت بیک وقت دی گئیں تین طلاقوں کو ایک طلاق شمار کرتی تھی۔ اس وقت اس مسئلے میں کسی کا اختلاف ثابت و منقول نہیں۔ اسی لیے حافظ ابن القیم لکھتے ہیں:

«وَكُلُّ صَحَابِيٍ مِنْ لَدُن خِلاَفَةِ الصِّدِّيقِ إِلٰى ثَلاَث سِنِينَ مِنْ خِلاَفَةِ عُمَرَ كَانَ عَلٰى أَنَّ الثَّلاَث وَاحِدَةً فَتْوٰى أَوْ إِقْرَارًا أَوْ سُكُوتًا، وَلِهٰذَا ادَّعٰى بَعْضُ أَهْلِ العِلْمِ أَنَّ هٰذَا إِجْمَاعٌ قَدِيمٌ، وَلَمْ تَجْمَع الأُمَّةُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ عَلٰى خِلاَفِهِ، بَلْ لَمْ يَزَلْ فِيهِمْ مَنْ يُفْتِي بِهِ قَرْنًا بَعْدَ قَرْنٍ وَإِلٰى يَوْمِنَا هٰذَا»(اعلام الموقعين: ٣/ ٣٤)

اور آگے چل کر لکھتے ہیں:

«وَالْمَقْصُودُ أَنَّ هٰذَا الْقَوْلَ قَدْ دَلَّ عَلَيْهِ الْكِتَابُ وَالسُّنَّةُ وَالْقِيَاسُ وَالإِجْمَاعُ الْقَدِيمُ، وَلَمْ يَأْتِ بَعْدَهُ إِجْمَاعٌ يُبْطِلُهُ»
(اعلام الموقعين: ٣/ ٣٥)

اور اغاثۃ اللھفان میں اس مسئلے پر بحث کے دوران میں لکھتے ہیں:

«فَيَكْفِي كَوْنُ ذٰلِكَ عَلٰى عَهْدِ الصِّدِّيقِ، وَمَعَهُ جَمِيعُ الصَّحَابَةِ، لَمْ يَخْتَلِفْ عَلَيهِ مِنْهُمْ أَحَدٌ، وَلاَ حُكِيَ فِي زَمَانِهِ الْقَوْلاَنِ، حَتّٰى

قَالَ بَعْضُ أَهْلِ الْعِلْمِ: إِنَّ ذٰلِكَ إِجْمَاعٌ قَدِيمٌ وَإِنَّمَا حَدَثَ الْخِلَافُ فِي زَمَنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، وَاسْتَمَرَّ الْخِلَافُ فِي الْمَسْأَلَةِ إِلٰى وَقْتِنَا هٰذَا، كَمَا سَنَذْكُرُهُ»(إغاثة اللهفان: ۱/ ۴۱۷)

خلاصہ ان عبارتوں کا یہی ہے کہ ''تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک عہد عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی سالوں تک تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی تھیں۔ اس میں گویا بعض اہل علم کے قول کے مطابق اجماع تھا' ایک صحابی کا بھی اختلاف اس میں ثابت نہیں اور اب تک اس مسلک کے حامل چلے آ رہے ہیں۔ البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تدبیری اقدام کے بعد اس میں اختلاف پیدا ہوا اور پھر یہ اختلاف اب تک چلا آ رہا ہے۔''

اور جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کے بعد اس پر اجماع ہو گیا' ان کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

«وَحِينَئِذٍ فَتَكُونُ الْمَسْئَلَةُ مَسْئَلَةَ نِزَاعٍ يَجِبُ رَدُّهَا إِلَى اللهِ تَعَالٰى وَرَسُولِهِ، وَمَنْ أَبٰى ذٰلِكَ فَهُوَ إِمَّا جَاهِلٌ مُقَلِّدٌ، وَإِمَّا مُتَعَصِّبٌ صَاحِبُ هَوًى، عَاصٍ لِلّٰهِ تَعَالَى وَرَسُولِهِ ﷺ متعرِّضٌ لِلُحُوقِ الْوَعِيدِ بِهِ، فَإِنَّ اللهَ تَعَالَى يَقُولُ: ﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ... الآيَة﴾ فَإِذَا ثَبَتَ أَنَّ الْمَسْأَلَةَ مَسْأَلَةُ نِزَاعٍ وَجَبَ قَطْعًا رَدُّهَا إِلَى كِتَابِ اللهِ وَسُنَّةِ رَسُولِهِ وَهٰذِهِ الْمَسْئَلَةُ مَسْأَلَةُ نِزَاعٍ، بِلَا نِزَاعِ أَهْلِ الْعِلْمِ الَّذِينَ هُمْ أَهْلُهُ، وَالنِّزَاعُ فِيهَا مِنْ عَهْدِ الصَّحَابَةِ إِلَى وَقْتِنَا هٰذَا»

(إغاثة اللهفان: ۱/ ۴۵۳)

۳۔ کیا مذاہب اربعہ کا اتفاق ''اجماع اُمت'' کی علامت ہے؟: ''بینات'' کے فاضل مدیر نے تیسری بات یہ کہی ہے: ''یہی مذہب (ایک ساتھ تین طلاقوں کو تین شمار کرنا) ائمہ اربعہ کا ہے۔''

اور یہ ان کے نزدیک شاہ ولی اللہ کے بقول ''اجماع امت'' کی علامت ہے۔ ہمیں

معلوم نہیں کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے یہ بات کہاں لکھی ہے؟ اگر موصوف نشاندہی فرما دیتے تو بات اور ہوتی۔ ہمارے خیال میں یہ دعویٰ بھی بوجوہِ ذیل یکسر غلط ہے۔

اولاً : اجماع کے لیے بوقت انعقاد تمام مجتہدین وقت کا اتفاق ضروری ہے۔ اگر تنزلاً مان لیا جائے کہ تمام مجتہدین کے بجائے صرف ان چار مجتہدین کا اتفاق ہی ''اجماع'' کے لیے کافی ہے تب بھی کسی مسئلے میں ان چاروں کا بیک وقت اتفاق کیونکر ثابت کیا جا سکتا ہے؟ جب کہ ان کا زمانہ ہی ایک نہیں ہے۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ کی تاریخ ولادت ۸۰ھ' امام مالک کی ۹۳ھ' امام شافعی کی ۱۵۰ھ اور امام احمد کی ۱۶۴ھ ہے اور تاریخ وفات امام ابوحنیفہ کی ۱۵۰ھ' امام مالک کی ۱۷۹ھ' امام شافعی کی ۲۰۴ اور امام احمد کی ۲۴۱ھ ہے۔ --- رحمہم اللہ --

اگر کہا جائے کہ کسی مسئلے میں ان چاروں ائمہ کی رائے کا توافق و توارد ہی کافی ہے تب بھی بات محل نظر ہے۔ کیونکہ ان مذاہب کی فقہی کتابیں دراصل ان کی اپنی لکھی ہوئی ہی نہیں ہیں بلکہ یہ تو بعد کے لوگوں نے کئی صدیوں بعد مرتب کی ہیں۔ کیا یہ دعویٰ کیا جا سکتا کہ ان میں ان کی طرف منسوب سب اقوال و آراء صحیح ہیں؟ یہ عین ممکن ہے کہ کسی قول کی نسبت ہی ان کی طرف صحیح نہ ہو۔ چنانچہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ اس پہلو کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''باید دانست کہ از تصانیف ائمہ اربعہ رحمہم اللہ در علم حدیث امروز در دست مردم غیر از موطا موجود نیست و مسانید ائمہ دیگر کہ در عالم مشہور است خود ایشاں بہ تصنیف آں نہ پرداختہ اند بلکہ دیگراں بعد از ایشاں آمدہ مرویات ایشاں را جمع نمودہ اند و مسند فلانے مسمی کردہ و برہر عاقل پوشیدہ نمی ماند کہ مرویات شخص از ہر رطب و یابس مجموع و مخلوط می باشد تاوقتیکہ خود آں شخص کہ اعتقاد بزرگی و فضیلت او داریم آں مخلوط را متمیز نہ کند و بارہا بہ نظر امعان و تعمق مطالعہ نہ نماید و شاگردان خود را تعلیم نہ کند محل اعتماد چہ قسم تواند بود۔'' (بستان المحدثین' مع اُردو ترجمہ' ص:۷۶-۷۷' طبع کراچی)

''یہ جاننا چاہیے کہ اس زمانے میں چاروں اماموں کی تصنیف میں موطا (امام مالک) کے سوا علم حدیث میں اور کوئی تصنیف موجود نہیں ہے اور دوسرے اماموں کی مسانید جو عالم

میں مشہور ہیں، وہ امام خود ان کی تصنیف میں شامل نہیں ہوئے بلکہ دوسرے اشخاص نے جو ان کے بعد میں آئے ہیں، ان کی مرویات کو جمع کر کے مسند فلاں نام رکھ دیا اور یہ امر ہر عقل مند جانتا ہے کہ کسی شخص کی مرویات اس وقت تک رطب و یابس یعنی صحیح و ضعیف کا مجموعہ رہتی ہیں جب تک وہ شخص جس کی بزرگی و فضیلت کا ہم اعتقاد رکھتے ہیں خود اس مخلوط کو چند دفعہ گہری نظروں سے مطالعہ کر کے متمیز نہ کر دے اور جب تک وہ اپنے شاگرد کو تعلیم نہ کرے، کسی قسم کا اعتماد اور بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔"

جب ان کے نام پر منسوب احادیث کے مجموعوں کا یہ حال ہے تو ان مذاہب کی مدوّنہ کتابیں جن میں ان کے اقوال و آراء اور ان پر تخریج در تخریج فتوؤں کو جمع کیا گیا ہے۔ کہاں تک قابل اعتبار رہ جاتی ہیں؟ کہ ان مذاہب اربعہ کے غیر منقح اتفاق کو "اجماع اُمت" سے تعبیر کیا جا سکے؟

ثالثاً : یہ دعویٰ غالباً اس معہود ذہنی پر مبنی ہے کہ حق ان چار مذاہب میں منحصر ہے۔ اس سے باہر ضلالت اور گمراہی ہے۔ جیسا کہ احناف میں سے طحاوی نے یہ دعویٰ کیا ہے۔ حالانکہ یہ بھی غلط ہے، حق کو ان چاروں مذاہب میں منحصر کر دینا ایک طرح سے شریعت سازی ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ یہ چاروں تقلیدی سلسلے تو ویسے بھی چوتھی صدی ہجری کے بعد قائم ہوئے ہیں جیسا کہ شاہ ولی اللہ اور دیگر علماء نے صراحت کی ہے، اگر حق ان ہی میں منحصر سمجھا جائے تو ابتدائی چار صدیوں کے مسلمانوں کے متعلق، جن میں صحابہ و تابعین و تبع تابعین و ائمہ مجتہدین سب شامل ہیں، کس نوعیت کا فیصلہ کیا جائے گا؟ اگر وہ چاروں مذاہب کے تقلیدی سلسلوں سے الگ رہنے کے باوجود صحیح مسلمان تھے تو بعد کے مسلمان کیوں اسی طرح قرآن و حدیث پر عمل کر کے اہل حق نہیں ہو سکتے؟ ان کو پھر کسی ایک تقلیدی سلسلے کا پابند کرنے کی کون سی معقول دلیل ہے؟ آخر صحابہ و تابعین و تبع تابعین کے بعد بھی ہر دور میں محدثین (اہلحدیث) کا ایک عظیم گروہ موجود رہا ہے جنھوں نے تقلید ائمہ سے الگ رہ کر خالص قرآن و حدیث کو اپنا طرۂ کردار اور شیوۂ گفتار بنائے رکھا ہے، انہیں کون اہل حق سے خارج کر سکتا ہے؟ حالانکہ اگر حق کو چار مذاہب میں

منحصر سمجھا جائے تو پھر نعوذ باللہ فقہائے محدثین کی جماعت اہل حق سے اپنے آپ ہی خارج ہو جاتی ہے۔ حالانکہ یہی تو وہ گروہ ہے جن کی بے مثال کاوشوں سے دین اصل صورت میں محفوظ ہوا اور رسول اللہ ﷺ کی مکمل زندگی علما و عملاً ایک مرتبہ شکل میں سامنے آئی۔

جزاھم اللہ عنا وعن جمیع المسلمین احسن الجزاء۔

بہرحال یہ تقلیدی سلسلہ ایک امر حادث ہے' جس کا وجوب تو کجا سرے سے کوئی حکم ہی شریعت اسلامیہ میں نہیں ہے' حق کو اپنے ان خود ساختہ طریقوں میں محدود کر دینا سراسر تحکم اور دھاندلی ہے۔ چنانچہ ملا علی قاری حنفی لکھتے ہیں:

«وَمِنَ الْمَعْلُومِ أَنَّ اللهَ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى مَا كَلَّفَ أَحَدًا أَنْ يَكُونَ حَنَفِيًّا أَوَ مَالِكِيًّا أَوْ شَافِعِيًّا أَوْ حَنْبَلِيًّا بَلْ كَلَّفَهُمْ أَنْ يَعْمَلُوا بِالْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ إِنْ كَانُوا عُلَمَاءَ أَوْ يُقَلِّدُوا الْعُلَمَاءَ إِنْ كَانُوا جُهَلَاءَ»(شرح عین العلم، بحوالہ حقیقۃ الفقہ)

"یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو حنفی' مالکی' شافعی یا حنبلی بننے کی تکلیف نہیں دی ہے بلکہ سب (مسلمانوں) کو اس بات کا مکلف بنایا ہے کہ اگر وہ طبقہ علماء سے ہوں تو (براہ راست) کتاب و سنّت پر عمل کریں اور جاہل ہوں تو علماء کی تقلید کریں۔"

رابعًا : اس سفسطے کی بنیاد اگر یہ زعم ہے کہ جو ملکۂ اجتہاد ائمہ اربعہ کو حاصل تھا' بعد کے ائمہ اس مقام کو نہیں پہنچ سکتے' لہٰذا اجتہاد بھی ان پر ختم ہو گیا اور ان کے علاوہ کسی اور کی تقلید بھی ناجائز۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے ایسا لکھا بھی ہے۔ تو یہ بھی غلط ہے۔ خود کئی حنفی علماء نے بھی اس زعم باطل کی تردید کی ہے اور اسے دیگر ائمہ مجتہدین کی بے ادبی اور اللہ تعالیٰ کی قدرت پر طعن قرار دیا ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالعلی حنفی (بحر العلوم) تحریر ابن الہمام کی شرح میں فرماتے ہیں:

«وَأَمَّا الْمُجْتَهِدُونَ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ، فَكُلُّهُمْ سَوَاءٌ فِي صَلَاحِ التَّقْلِيدِ بِهِمْ، فَإِنْ وَصَلَ فَتْوَى سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ أَوْ مَالِكُ بْنُ دِينَارٍ يَجُوزُ الْأَخْذُ بِهِ كَمَا يَجُوزُ الْأَخْذُ بِفَتْوَى الْأَئِمَّةِ الْأَرْبَعَةِ

إِلاَّ أَنَّهُ لَمْ يَبْقَ عَنِ الأَئِمَّةِ الأُخَرِينَ نَقْلٌ صَحِيحٌ إِلاَّ أَقَلَّ الْقَلِيلِ، وَلِذَا مَنَعَ مِنَ التَّقْلِيدِ إِيَّاهُمْ فَإِنْ وُجِدَ نَقْلٌ صَحِيحٌ مِنْهُمْ فِي مَسْئَلَةٍ فَالْعَمَلُ بِهِ وَالْعَمَلُ بِفَتْوَى الأَئِمَّةِ الأَرْبَعَةِ سَوَاءٌ»

"وہ مجتہدین جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اچھے پیروکار ہیں' وہ سب کے سب صلاحیت تقلید میں برابر ہیں (یعنی ائمہ اربعہ کی تخصیص نہیں) اگر سفیان بن عینیہ یا مالک بن دینار کا فتویٰ مل جائے تو اس پر بھی اسی طرح عمل کیا جا سکتا ہے جس طرح کہ ائمہ اربعہ کے فتوے پر عمل کرنا جائز ہے اتنی بات ضرور ہے کہ ائمہ اربعہ کے علاوہ دیگر ائمہ کے اقوال نقل صحیح کے ساتھ کم تر ہی مہیا ہوتے ہیں محض اسی وجہ سے ہی بعض لوگوں نے ان کی تقلید سے روکا ہے تاہم اگر کسی مسئلے میں نقل صحیح کے ساتھ ان کی رائے مل جائے تو اس پر عمل کرنا اور ائمہ اربعہ کے فتوے پر عمل کرنا دونوں برابر ہے۔"

اور شرح مسلّم میں بھی اسی بات کا ردّ کرتے ہوئے کہ ائمہ اربعہ کے علاوہ کسی اور کی تقلید جائز نہیں' لکھتے ہیں:

«ثُمَّ فِي قَوْلِهِ (يعني ابن الصلاح) خَلَلٌ آخَرُ إِذِ الْمُجْتَهِدُونَ الآخَرُونَ أَيْضًا بَذَلُوا جُهْدَهُمْ مِثْلَ بَذْلِ الأَئِمَّةِ الأَرْبَعَةِ وَإِنْكَارُ هٰذَا مُكَابَرَةٌ وَسُوءُ أَدَبٍ، بَلِ الْحَقُّ أَنَّهُ إِنَّمَا مَنَعَ مِنْ مَنْعِ تَقْلِيدِ غَيْرِهِمْ لأَنَّهُ لَمْ يَبْقَ رِوَايَةُ مَذْهَبِهِمْ مَحْفُوظَةٌ، حَتَّى لَوْ وُجِدَ رِوَايَةٌ صَحِيحَةٌ مِنْ مُجْتَهِدٍ آخَرَ، يَجُوزُ الْعَمَلُ بِهَا أَلاَ تَرىٰ أَنَّ الْمُتَأَخِّرِينَ أَفْتَوا بِتَحْلِيفِ الشُّهُودِ إِقَامَةٌ لَهُ مَوْقِعَ التَّزْكِيَةِ عَلىٰ مَذْهَبِ ابْنِ أَبِي لَيْلَى فَافْهَمْ»(فواتح الرحموت، ص:٦٣٠ طبع نول كشور:١٨٧٨ء)

اس میں انہوں نے مذکورہ خیال کو دوسرے ائمہ کی بے ادبی بتلایا ہے اور مذاہب اربعہ سے خروج کی ایک مثال دی ہے اس سے قبل ایک اور جگہ صفحہ ۶۲۴ پر لکھتے ہیں:

«ثُمَّ إِنَّ مِنَ النَّاسِ مَنْ حَكَمَ بِوُجُوبِ الْخُلُوِّ مِنْ بَعْدِ الْعَلاَّمَةِ النَّسْفِي، وَاخْتَتَمَ الإِجْتِهَادُ بِهِ، وَعَنَوْا الاجْتِهَادَ فِي الْمَذْهَبِ، وَأَمَّا الاجْتِهَادُ الْمُطْلَقُ فَقَالُوا اخْتَتَمَ بِالأَئِمَّةِ الأَرْبَعَةِ حَتَّى أَوْجَبُوا تَقْلِيدَ وَاحِدٍ مِنْ هٰؤُلاَءِ عَلَى الأُمَّةِ، وَهٰذَا كُلُّهُ هَوَسٌ مِنْ هَوَسَاتِهِمْ لَمْ يَأْتُوا بِدَلِيلٍ، وَلاَ يَعْبَاءُ بِكَلاَمِهِمْ، وَإِنَّمَاهُمْ مِنَ الَّذِينَ حَكَمَ الْحَدِيثُ أَنَّهُمْ أَفْتَوَا بِغَيْرِ عِلْمٍ، فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا»

یعنی "جن لوگوں نے یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ علامہ نسفی کے بعد "اجتہاد فی المذہب" بھی ختم ہو گیا ہے جبکہ اجتہادِ مطلق تو پہلے ہی ائمہ اربعہ پر ختم ہو چکا ہے اس لیے اب امت پر انہی ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید واجب ہے تو یہ ان کی ہوسوں میں سے ایک ہوس ہے جس کی کوئی دلیل ان کے پاس نہیں۔ دراصل ان کی بات قابل اعتناء ہی نہیں' یہ اس حدیث کا مصداق ہیں "خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔"

اور مولانا نظام الدین لکھنوی اپنی شرح مسلّم میں لکھتے ہیں:

«اعْلَمْ أَنَّ بَعْضَ الْمُتَعَصِّبِينَ قَالُوا اخْتَتَمَ الاجْتِهَادُ الْمُطْلَقُ عَلَى الأَئِمَّةِ الأَرْبَعَةِ وَلَمْ يُوْجَدْ مَجْتَهِدٌ مُطْلَقٌ بَعْدَهُمْ، وَالاجْتِهَادُ فِي الْمَذْهَبِ اخْتَتَمَ عَلَى الْعَلاَّمَةِ النَّسْفِي صَاحِبِ الْكَنْزِ وَلَمْ يُوْجَدْ مُجْتَهِدٌ فِي الْمَذْهَبِ بَعْدَهُ، وَهٰذَا غَلَطٌ وَرَجْمٌ بِالْغَيبِ، فَإِنْ سُئِلَ مِنْ أَيْنَ عَلِمْتُمْ هٰذَا، لاَ يَقْدِرُونَ عَلَى إِيرَادِ دَلِيلٍ أَصْلاً، ثُمَّ هُوَ إِخْبَارٌ بِالْغَيبِ وَتَحَكُّمٌ عَلَى قُدْرَةِ اللّٰهِ تَعَالَى، فَمِنْ أَيْنَ يَحْصُلُ عِلْمٌ أَنْ لاَ يُوجَدَ إِلَى يَوم الْقِيَامَةِ أَحَدٌ يَتَفَضَّلُ اللّٰهُ عَلَيْهِ بِنَيلِهِ مُقَامَ الاجْتِهَادِ، فَاجْتَنِبْ عَنْ مِثْلِ هٰذِهِ التَّعَصُّبَاتِ»

"معلوم ہونا چاہیے کہ بعض متعصّبین نے جو یہ کہا ہے کہ "اجتہادِ مطلق ائمہ اربعہ پر ختم ہو گیا ہے اور ان کے بعد کوئی مجتہد مطلق نہیں ہوا۔ اسی طرح اجتہاد فی المذہب

علامہ نسفی صاحب کنز پر ختم ہو گیا اور ان کے بعد کوئی مجتہد فی المذہب نہیں ہوا۔
بالکل غلط اور اٹکل پچو بات ہے۔ اگر ان سے پوچھا جائے تمہیں اس بات کا علم کہاں سے ہوا؟ تو یہ اس پر کوئی دلیل پیش نہیں کر سکیں گے۔ علاوہ ازیں یہ اِخبار بالغیب (غیب کی پیش گوئی) اور اللہ کی قدرت پر بے دلیل حکم لگانا ہے۔ ان کو یہ علم کہاں سے حاصل ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ قیامت تک کسی کو بھی اب مقامِ اجتہاد سے مشرف و مفضل نہیں فرمائے گا؟ ایسے تعصب اور ہٹ دھرمی سے بچ کر رہو۔"

خامسًا : وجوب تقلید ائمہ اربعہ کے خرخشے نے امت مسلمہ میں بہت سے فتنے اور قباحتیں پیدا کی ہیں۔ مثلاً: ① دین حق کو' جو ایک تھا' چار مذہبوں میں تقسیم کر کے مسلمانوں میں فرقہ بندی اور تعصب کو فروغ دیا اور یہ تحزّب و تعصب اس حد تک پہنچا دیا کہ خانہ کعبہ کے اندر بھی چار مصلے قائم کر دیے گئے تھے' وہاں ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھنے تک کے روادار نہ تھے۔

دین حق را چار مذہب ساختند رخنہ در دین نبی انداختند

② حدیثیں گھڑنے کی جسارت کی گئی۔ چنانچہ ان مقلدین ائمہ اربعہ نے اپنے اپنے اماموں کی فضیلت میں اور اپنے مخالف ائمہ کی قدح میں کئی حدیثیں گھڑیں۔ کئی من گھڑت حدیثوں سے اپنے مسلک پر استدلال کیا' بعض احادیث میں اپنے مذہب کو صحیح ثابت کرنے کے لیے تحریف کی' حتی کہ اثباتِ تقلید کے جوش میں ہندوستان کے ایک اونچے درجے کے مقلد عالم نے ایک آیت بھی اپنی طرف سے لکھ ڈالی۔ (ملاحظہ ہو' "ایضاح الادلۃ" مؤلفہ مولانا محمود الحسن دیو بندی' ص: ۹۷' مطبع قاسمی دیو بند' ۱۳۳۰ھ)

③ قرآن و حدیث سے بے اعتنائی اور تقلیدی و فقہی جمود کو فروغ دیا جس طرح کہ اس کا اعتراف سید سلیمان ندوی مرحوم نے بھی تحریک اہلحدیث کی خدمات بیان کرتے ہوئے کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو "تراجم علمائے حدیث" کا مقدمہ' ص: ۳۱' ۳۳)

ان کے علاوہ اور بہت سی قباحتیں ہیں جو تقلید ائمہ کے وجوبی نظریے سے اور مقلدین کے فقہی جمود سے پیدا ہوئیں۔ اس لحاظ سے یہ تقلیدی سلسلہ ہی یکسر اسلام کے خلاف اور

امت مسلمہ کے لیے سخت نقصان دہ ہے چہ جائیکہ اسے تقدس و اہمیت کا یہ درجہ دے دیا جائے کہ جس مسئلے میں یہ چاروں تقلیدی مذاہب متفق ہو جائیں اسے اجماع امت کا مقام مل جائے؟ جسے ذرا بھی دین کی سمجھ ہوگی اور اسلام کی حمیت و عصبیت اس کے دل میں جاگزیں ہوگی وہ کبھی اس تقلیدی نظریے کی حمایت نہیں کرے گا۔

④ **اجماع امت کے منکر اور شیعوں کے نقش قدم پر اہلحدیث ہیں یا مقلدین؟**: رہ گئی مدیر "بینات" کی یہ گوہر افشانی کہ "اہلحدیث اجماع امت سے ہٹ کر شیعوں کے نقش قدم پر ہیں اور حضرات خلفائے راشدین کی پیروی کا جو حکم رسول اللہ ﷺ نے امت کو دیا تھا اس کا رشتہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔" ("اختلاف امت اور صراط مستقیم" ص: ۳۳)

دعوائے اجماع کی حقیقت واضح کرتے ہوئے ہم بتلا آئے ہیں کہ حضرت عمر نے تین طلاقوں کو تین ہی شمار کرنے کا جو حکم نافذ کیا تھا' وہ ایک سیاسی اور تدبیری اقدام تھا' ورنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تعامل عہد رسالت (یعنی طلاقوں کو ایک ہی طلاق شمار کرنے) کے قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عہد خلافت کے ابتدائی دو برسوں میں یہی تعامل رہا۔ پھر آخر عمر میں بھی انہوں نے اپنے اس اقدام پر اظہار ندامت کیا جو بطور تدبیر انہوں نے اختیار کیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں یہی تعامل رہا اور دیگر کئی صحابہ کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اسی کے قائل تھے۔ اب دیکھئے اس مسئلے میں بھی خلفائے راشدین کس طرف ہیں' تین طلاق کو تین شمار کرنے کی طرف یا تین طلاق کو ایک طلاق شمار کرنے کی طرف؟ ظاہر ہے یہ تینوں خلفائے راشدین مذکورہ تصریحات کے مطابق ایک ہی طلاق کے قائل ہیں۔ اب ذرا سوچئے خلفائے راشدین کی عدم پیروی کا اصل مجرم کون ہے؟ اور یوں شیعوں کے پیروکار اہلحدیث ہوئے یا خود مقلدین؟

مزید برآں مقلدین جامدین ہی صحابہ و تابعین کے فہم و منہاج سے انحراف کے راستے پر گامزن ہیں۔ تقلید شخصی پر اصرار کی بجائے خود صحابہ و تابعین کی روش سے انحراف ہے' جس کی وجہ سے انہیں بہت سی صحیح احادیث سے بھی انکار (بصورت تاویلاتِ رکیکہ یا بذریعہ تحریف یا خود ساختہ اصولوں کی بنیاد پر) کرنا پڑ رہا ہے۔ الحمدللہ اہلحدیث اس زلیغ سے

محفوظ اور صحابہ کرام کے منہاج پر قائم ہیں۔

معلوم ہے کہ مدیر "بینات" نے مسئلہ زیر بحث میں خلفائے راشدین کی اطاعت کا یہ نغمہ کیوں اتنے اونچے سروں میں الاپا ہے؟ کہ اہلحدیث کو شیعوں کا پیروکار بنا دیا۔ بے چارے موصوف لاعلمی میں یہی سمجھتے رہے کہ اس مسئلے میں تو کم از کم خلفائے راشدین ہمارے ہی ہمنوا ہیں۔ دراں حالیکہ یہ بات بھی خلافِ واقعہ ہے تاہم موصوف لاعلمی میں مار کھا گئے۔ ورنہ ان مقلدین کے جذبۂ اطاعت خلفائے راشدین کا یہ حال ہے کہ فاتحہ خلف الامام' رفع الیدین' آمین بالجہر اور دیگر بیسیوں مسائل میں خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور اپنے امام کی تقلید پر مصر رہتے ہیں۔ اس وقت ان کو رسول اللہ ﷺ کا وہ فرمان یاد نہیں آتا جس میں خلفائے راشدین کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے اور جس کا حوالہ موصوف نے اہلحدیث کے ضمن میں دیا ہے' اس وقت ان کو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ خلفائے راشدین کی احادیث ٹھکرا کر ہم شیعوں کی پیروی کر رہے ہیں جس کا الزام زیر بحث مسئلے میں انہوں نے اہلحدیث پر عائد کیا ہے۔ گویا اہلحدیث اگر تعامل عہد رسالت و عہد ابوبکر کے مقابلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک وقتی اور اجتہادی اقدام کو نہ مانیں تو وہ خلفائے راشدین کی اطاعت کے منکر اور شیعوں کے پیروکار اور خود مقلدین ایک مسئلے میں نہیں دسیوں اور بیسیوں مسائل میں اپنے قول امام کے مقابلے میں خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مرویات کو درخورِ اعتناء نہ سمجھیں لیکن اس کے باوجود وہ خلفائے راشدین کے اطاعت کنندہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عاشق زار۔ کیا خوب انصاف ہے؟ شاید کسی ایسے ہی موقع کے لیے شاعر نے کہا ہے ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

پھر ذرا یہ بھی فرمائیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو فقیہ اور غیر فقیہ کے خانوں میں کس نے تقسیم کیا ہے؟ اور قیاس کے مقابلے میں غیر فقیہ صحابہ کی روایات کو کس نے ٹھکرایا ہے؟ کیا یہ سب کچھ مقلدین احناف نے نہیں کیا؟ نیز کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو غیر فقیہ کہنا اور اپنے

قیاس کے مقابلے میں ان کی بیان کردہ روایات حدیث کو ٹھکرا دینا کیا یہ صحابہ کرام کی توہین نہیں؟ کیا یہ شیعیت کی پیروی نہیں؟ اپنے گریبان میں جھانکیے اور سوچئے کہ شیعوں کے نقش قدم پر کون ہے؟

اور ذرا آگے چلئے! کیا مقلدین قرآن و حدیث کے مقابلے میں اپنے اماموں کے اقوال کو ترجیح نہیں دیتے؟ یقیناً دیتے ہیں' جس کا اعتراف بڑے بڑے اکابر علماء نے کیا ہے (طوالت کا ڈر ہے ورنہ ایسے دسیوں حوالے اور واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں) کیا اپنے اماموں کو مفترض الطاعۃ سمجھنا اور قرآن و حدیث کے مقابلے میں ان کے اقوال کو ترجیح دینا' وہی نظریۂ امامت معصومہ نہیں جس کے شیعہ قائل ہیں؟ فرق صرف اتنا ہے کہ شیعہ زبان سے اپنے اماموں کو معصوم مانتے ہیں اور مقلدین زبان سے تو نہیں کہتے تاہم عملاً اپنے اماموں کو ''معصوم'' بنا رکھا ہے کہ قرآن و حدیث کو تو چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن قولِ امام چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ خود فیصلہ کر لیجیے' نہیں تو کسی تیسری عدالت سے فیصلہ کروالیجیے کہ شیعوں کے نقش قدم پر کون ہے؟ ع

الزام ہم اُن کو دیتے تھے' قصور اپنا نکل آیا

اگر ہماری بات مقلدین کی طبع نازک پر گراں گزرے تو ہم شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کا قول پیش کیے دیتے ہیں جس میں انہوں نے مقلدین کی بابت اسی خیال کا اظہار فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:

«وَقَدْ غَلاَ النَّاسُ فِي التَّقْلِيدِ وَتَعَصَّبُوا فِي الْتِزَامِ تَقْلِيدِ شَخْصٍ مُعَيَّنٍ، حَتَّى مَنَعُوا الاجْتِهَادَ فِي مَسْئَلَةٍ، وَمَنَعُوا تَقْلِيدَ غَيْرِ إِمَامِهِ فِي بَعْضِ الْمَسَائِلِ، وَهٰذَا هِيَ الدَّاءُ الْعُضَالُ الَّتِي أَهْلَكَتِ الشيعَةَ، فَهٰؤُلاَءِ اَيْضاً أَشْرَفُوا عَلَى هَلاَكٍ، إِلاَّ أَنَّ الشِّيعَةَ قَدْ بَلَغُوا أَقْصَاهَا فَجَوَّزُوا (رَدَّ) النُّصُوصِ بِقَوْلِ مَنْ يَزْعُمُونَ تَقْلِيدَهُ وَهٰؤُلاَءِ أَخَذُوا فِيهَا، وَأَوَّلُو الرِوَايَاتِ الْمَشْهُورَةَ إِلٰى قَوْلِ إِمَامِهِمْ، وَالْحَقُّ تَاوِيلُ قَوْلِ الإِمَامِ إِلٰى رِوَايَاتٍ، إِنْ قَبِلَ وَإِلاَّ

فَالْتَرْكُ»(تنوير العينين في اثبات رفع اليدين، ص:٢٥ طبع لاهور)

"تقلید میں لوگوں نے غلو سے کام لیا ہے اور التزام تقلید شخص معین میں بڑا تعصب برتا ہے حتی کہ کسی مسئلے میں اجتہاد تک کی بھی ممانعت کر دی ہے اور بعض مسائل میں اپنے امام کے سوا کسی اور کی تقلید کے بھی روا دار نہیں۔ یہی وہ سخت بیماری ہے جس نے شیعوں کو ہلاک کیا' سو یہ (مقلدین) بھی ہلاکت کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ شیعہ ہلاکت کی انتہا کو پہنچ چکے ہیں کیونکہ انہوں نے ان لوگوں کے قول کے مقابلے میں جن کی تقلید کا وہ دم بھرتے ہیں' نصوص کے رد کر دینے کو بھی جائز سمجھا ہے' اور ان (مقلدین) کا حال یہ ہے کہ یہ مشہور روایات میں بھی (دُور از کار) تاویلیں کر کے ان کو اپنے امام کی رائے کے مطابق کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ صحیح طرز عمل یہ ہے کہ قول امام کو روایات کے مطابق بنائیں اگر اسے ضرور اپنانا ہی ہے ورنہ (صحیح روایات کے مقابلے میں تو) قولِ امام چھوڑ ہی دینا چاہیے۔"

علاوہ ازیں مسئلہ زیر بحث کے حل کے لیے حنفیہ نے بالخصوص جو حلالہ ملعونہ ایجاد کیا ہے' جس کا فتویٰ حنفی فقہاء دیتے آئے ہیں اور اب بھی دیتے ہیں' کیا وہ شیعوں کا سا طرز عمل نہیں؟ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو اسے زناکاری سمجھتے رہے اور عہد صحابہ و تابعین میں کوئی مسلمان اس ملعون کام کا ارتکاب تو کجا' اس کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ کیا ہمارے ان بھائیوں نے صحابہ و تابعین کے تعامل کو نظرانداز کر کے شیعوں کے متعہ کی طرح حلالے کی صورت میں زناکاری کا راستہ نہیں کھول رکھا ہے؟

دوسرے' حنفیہ کے علاوہ' حلالہ مروجہ کے حرام اور لعنتی فعل ہونے پر پوری امت کا اجماع ہے' صحابہ و تابعین اس کی حرمت پر متفق تھے' تمام ائمہ مجتہدین اس پر متفق رہے' مذاہب مدوّنہ نے بھی اسے حرام سمجھا' حتی کہ امام ابوحنیفہ کے شاگرد امام محمد و امام ابو یوسف وغیرہ بھی علیٰ وجہ التحلیل نکاح کو غلط قرار دیتے ہیں۔ پوری اُمت میں صرف ایک امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں جنھوں نے بشرط تحلیل کیے ہوئے نکاح کو صحیح قرار دیا اور یوں انہوں

نے حلالہ ملعونہ کے جواز کا دروازہ کھولا جس کی بنیاد پر ان کے پیروکار حنفی مقلدین بھی اس کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔ اب ہر شخص سوچ لے کہ ایک ایسا ملعون فعل جس کی حرمت نبی ﷺ کے فرمان سے ثابت ہے اور جس کے حرام ہونے پر پوری امت مسلمہ بھی متفق و مجتمع ہے' اس کا ارتکاب اجماع امت کا انکار ہے یا نہیں؟ گویا حنفی مقلدین ہی شیعوں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور اجماع امت کے منکر بھی وہی ہیں۔

حکومت سے گزارش : آخر میں ہم حکومت سے بھی عرض کریں گے کہ حلالے کے سدباب کے لیے ایک قانون بنایا جائے۔ جس میں حلالے کے مرتکب مرد و عورت کو زناکاری والی سزا دی جائے جیسا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حلالہ کرنے والے مرد و عورت دونوں کو سزائے رجم دینے کا خیال ظاہر فرمایا تھا۔ اسی طرح حلالے کے جواز کا فتویٰ دینے والے مفتی کے لیے بھی کوئی معقول سزا تجویز کی جائے تاکہ کسی مفتی کو یہ جرأت نہ ہو کہ وہ آئندہ ایسے حلالہ مروجہ کے جواز کا فتویٰ دے جو صریحاً قرآن و حدیث کے خلاف صحابہ و تابعین کے تعامل کے برعکس اور اجماع امت کے خلاف ہے۔ فقہی تقلید کی آڑ میں کسی گروہ کو یہ حق دینا یقیناً صحیح نہیں کہ وہ اس طرح کھلم کھلا قرآن و حدیث کی تکذیب' صحابہ و تابعین کے تعامل کی مٹی پلید اور اجماع امت سے انحراف کرے۔ وما علینا الا البلاغ المبین۔

-- II --

عورت کا حق خلع اور اس کے مسائل

تاہم اللہ تعالیٰ نے اس دوسرے پہلو کو بھی ملحوظ رکھا ہے کہ کسی وقت عورت کو بھی مرد سے علیحدہ ہونے کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ جیسے خاوند نامرد ہو' وہ عورت کے جنسی حقوق ادا کرنے پر قادر نہ ہو یا وہ نان و نفقہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو' یا قادر تو ہو لیکن اسے مہیا نہ کرتا ہو' یا بلاوجہ اس پر ظلم و ستم کرتا یا مار پیٹ سے کام لیتا ہو' یا عورت اپنے بدشکل خاوند کو پسند نہ کرتی اور محسوس کرتی ہو کہ وہ اس کے ساتھ نباہ یا اس کے حقوق زوجیت ادا نہیں کر سکتی۔

ان یا ان جیسی دیگر تمام صورتوں میں عورت خاوند کو یہ پیش کش کر کے کہ تو نے مجھے جو مہر اور ہدیہ وغیرہ دیا ہے' وہ میں تجھے واپس کر دیتی ہوں' تو مجھے طلاق دے دے۔ اگر خاوند اس پر رضا مند ہو کر اسے طلاق دے دے' تو ٹھیک ہے بصورت دیگر وہ عورت عدالت یا پنچایت کے ذریعے سے خاوند سے گلو خلاصی حاصل کر سکتی ہے۔

عورت کے اس حق کو "خلع" کہتے ہیں۔ بعض فقہاء عورت کے اس حق خلع کو تسلیم نہیں کرتے' لیکن شریعت نے اسے تسلیم کیا ہے۔ اس لیے اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی تو اسلامی تعلیمات کا اعتدال اور حسن ہے کہ اس میں تمام فطری باتوں اور حقوق کا جواز ہے اور عورت کے لیے بعض دفعہ مذکورہ صورتوں میں علیحدگی کی ضرورت و اہمیت' بلکہ ناگزیریت سے انکار کرنا' حقائق سے آنکھیں چرانا ہے جو کسی طرح بھی پسندیدہ امر نہیں' علاوہ ازیں اسلامی تعلیمات کے بھی مطابق نہیں۔ اس کے مختصر دلائل حسب ذیل ہیں۔

جوازِ خلع کے دلائل: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَن يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ﴾

(البقرۃ۲/ ۲۲۹)

"تمہارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم نے ان (عورتوں) کو جو کچھ (مہر میں) دیا ہے (طلاق دینے کے بعد) اس میں سے کچھ (واپس) لے لو۔ مگر اس صورت میں (یہ جائز ہے) کہ وہ دونوں (میاں بیوی) یہ اندیشہ محسوس کریں کہ وہ اللہ کی حدوں کو قائم نہیں کر سکیں گے۔ پس اگر تم ڈرو کہ واقعی وہ دونوں اللہ کی حدوں کو قائم نہیں کر سکیں گے' تو پھر عورت (خاوند سے گلو خلاصی کرانے کے لیے) جو بھی فدیہ (بدلہ) دے گی' اس میں ان دونوں (لینے دینے والوں) پر کوئی گناہ نہیں۔"

یہ آیت خلع کے جواز میں نص صریح ہے۔ اس میں واضح طور پر بتلایا گیا ہے کہ طلاق کی صورت میں تو مہر میں سے کچھ بھی لینا جائز نہیں ہے۔ البتہ خلع میں (عورت کی طرف سے مطالبۂ طلاق پر طلاق دینے کی صورت میں خاوند کے لیے) مہر کا واپس لینا جائز ہے اس میں لینے والے پر کوئی گناہ ہے نہ دینے والے پر۔ کیونکہ دینے والی اپنی خوشی سے دے رہی ہے اور لینے والا اپنا وہ خرچ وصول کر رہا ہے جو اس نے اس عورت پر اس نقطۂ نظر سے کیا تھا کہ وہ اس کے گھر میں آباد رہے گی' لیکن اب وہ آباد رہنے کے لیے تیار نہیں ہے تو اس کا یہ وہ حق ہے جو واپس لینا چاہے تو لے سکتا ہے۔

آیت میں جوازِ خلع کی وہ وجہ بھی بیان کر دی گئی ہے جس کی بنیاد پر ایسا کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ خوف ہے کہ کسی وجہ سے وہ دونوں اللہ کی حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے' یعنی حق زوجیت کے ادا کرنے میں وہ کامیاب نہیں ہو سکیں گے جو نکاح کا اصل مقصد ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب ایک عورت مذکورہ وجوہات میں سے کسی ایک وجہ سے خاوند کو پسند ہی نہیں کرتی' تو وہ خوش دلی سے خاوند کے ساتھ اپنا تعلق برقرار نہیں رکھ سکتی اور اس کی جنسی خواہش پوری کرنے سے قاصر رہے گی۔ رسول اللہ ﷺ کے طرز عمل اور فیصلے سے بھی خلع کا اثبات ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ثابت بن قیس کی بیوی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور کہنے لگی۔

«یَارَسُولَ اللهِ! ثَابِتُ بْنُ قَیسٍ مَا أَعْتِبُ عَلَیْهِ فِي خُلُقٍ وَلاَ دِینٍ،

وَلٰكِنِّي اَكْرَهُ الْكُفْرَ فِي الإِسْلَامِ، (وفي رواية: وَلٰكِنِّي لاَ أُطِيقُهُ) فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ أَتَرُدِّينَ عَلَيْهِ حَدِيقَتَهُ؟ قَالَتْ نَعَمْ، قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ اقْبَلِ الْحَدِيقَةَ وَطَلِّقْهَا تَطْلِيقَةً»(صحيح البخاري، الطلاق، باب الخلع وكيف الطلاق فيه، ح: ٥٢٧٣-٥٢٧٥)

"اللہ کے رسول! میرا خاوند ثابت بن قیس ہے میں یہ نہیں کہتی کہ وہ بد خلق ہے یا دین کے معاملے میں خراب ہے (یعنی اخلاقی اور دینی اعتبار سے اس میں کوئی عیب نہیں) لیکن میں اس بات سے ڈرتی ہوں کہ مسلمان ہوتے ہوئے میں کفریہ کام میں مبتلا ہو جاؤں (دوسری روایت کے الفاظ ہیں کہ میں اس کے ساتھ نباہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتی) رسول اللہ ﷺ نے اس سے پوچھا' تجھے اس نے جو باغ دیا ہے وہ اسے واپس کر دے گی؟ اس نے کہا' ہاں! تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے اس خاوند سے فرمایا۔ اس سے باغ واپس لے لے اور اسے طلاق دے دے۔"

اس میں کفر یا کفریہ کام سے مراد' خاوند کے حقوق ادا نہ کرنا ہی ہے' کیونکہ وہ خاوند کو ناپسند کرتی تھی' جس کی صراحت دوسری روایت میں ہے کہ میں اس کے ساتھ نباہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتی اور اس کی وجہ دوسری روایات میں یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ خود نہایت حسین و جمیل عورت تھی جب کہ حضرت ثابت اس کے برعکس سیاہ فام اور بد شکل تھے۔ --رضی اللہ عنہا-- (فتح الباری)

جب بد شکل ہونے کی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ نے ایک عورت کو خلع کا حق دے دیا' جب کہ یہ انسان کے اپنے اختیار کا معاملہ بھی نہیں' تو جو خاوند اپنے اختیار سے عورت کے ساتھ ظلم و زیادتی کا معاملہ کرے یا اسے نان و نفقہ مہیا نہ کرے یا وہ اس کے جنسی حقوق ادا نہ کرے یا ادا کرنے کے قابل ہی نہ ہو' تو پھر عورت بذریعہ خلع ایسے خاوندوں سے علیحدگی کیوں اختیار نہیں کر سکتی؟ یقیناً کر سکتی ہے۔ اسلام نے ہر ظلم کا راستہ بند کیا ہے تو عورتوں پر ظلم کا راستہ وہ کیوں بند نہیں کرتا۔ عورت کو خلع کا یہ حق اسی لیے دیا گیا ہے کہ وہ اس کے ذریعے سے اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا انسداد کر سکے۔

نان و نفقہ مہیا نہ کرنے پر علیحدگی کا جواز: صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَفْضَلُ الصَّدَقَةِ مَا تَرَكَ غِنًى، وَالْيَدُ الْعُلْيَا خَيرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلَى، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ، تَقُولُ الْمَرْأَةُ: إِمَّا أَنْ تُطْعِمَنِي، وَإِمَّا أَنْ تُطَلِّقَنِي وَيَقُولُ الْعَبْدُ: أَطْعِمْنِي وَاسْتَعْمِلْنِي، وَيَقُولُ الابْنُ أَطْعِمْنِي إِلَى مَنْ تَدَعُنِي؟ فَقَالُوا: يَا أَبَاهُرَيْرَةَ، سَمِعْتَ هٰذَا مِنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ؟ قَالَ: لَا، هٰذَا مِنْ كِيسِ أَبِي هُرَيْرَةَ»(صحيح البخاري، النفقات، باب وجوب النفقة على الأهل والعيال، ح: ٥٣٥٥)

"افضل صدقہ وہ ہے جو (اہل و عیال کو) بے نیاز چھوڑے (یعنی ان کی ضروریات پوری کرنے کے بعد کیا جائے، تاکہ وہ کسی کے محتاج نہ رہیں) اور بلند (دینے والا) ہاتھ، نچلے (لینے والے) ہاتھ سے بہتر ہے اور آغاز اس سے کرو جس کے (اخراجات کے) کفیل اور ذمے دار تم ہو۔ عورت کہتی ہے، مجھے کھلا، یا مجھے طلاق دے۔ غلام کہتا ہے، مجھے کھلا اور مجھ سے کام لے (بعض روایات میں ہے مجھے کھلا ورنہ مجھے فروخت کر دے) اور بیٹا کہتا ہے، مجھے کھلا، مجھے کس کے سپرد کر رہا ہے؟ لوگوں نے پوچھا، ابو ہریرہ، کیا یہ (سب باتیں) تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہیں؟ انہوں نے کہا، نہیں۔ یہ ابو ہریرہ کی زنبیل سے ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ، تک تو بلاشبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ اس کے بعد کا حصہ وہ ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس حدیث رسول سے سمجھا اور استنباط کیا۔ گویا ایک صحابیِ رسول نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے یہ استنباط کیا کہ ایک مرد جن لوگوں کے اخراجات کا ذمے دار ہے، جن میں اس کی بیوی، غلام اور اولاد ہے (جو ابھی کمانے کے قابل نہیں ہیں) انہیں نان و نفقہ مہیا کرے، ورنہ ان کو آزاد کر دے، یعنی بیوی کو طلاق دے دے، غلام کو فروخت کر دے، اسی طرح اولاد بھی کسی کے سپرد کر دے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے اسی استنباط اور قول سے جمہور علماء نے استدلال کیا ہے کہ جو

شخص اپنی عورت کو نان و نفقہ مہیا نہیں کر سکتا اور اس کی بناء پر عورت علیحدہ ہونا پسند کرے' تو ان کے درمیان تفریق کرا دی جائے یعنی اسے طلاق دلوا دی جائے۔

«وَاسْتَدَلَّ بِقَوْلِهِ: (إِمَّا أَنْ تُطْعِمَنِي وَإِمَّا أَنْ تُطَلِّقَنِي) مَنْ قَالَ: يُفَرَّقُ بَيْنَ الرَّجُلِ وَامْرَأَتِهِ إِذَا أَعْسَرَ بِالنَّفَقَةِ وَاخْتَارَتْ فِرَاقَهُ، وَهُوَ قَوْلُ جُمْهُورِ الْعُلَمَاءِ»(فتح الباري، النفقات: ٩/ ٦٢١)

اس مسئلے میں جمہور علماء نے قرآن مجید کی اس آیت سے بھی استدلال کیا ہے:

﴿ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ﴾ (البقرة٢/ ٢٣١)

''اور تم ان عورتوں کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے مت روکو' تاکہ تم ان پر ظلم و زیادتی کرو۔''

یہ بات اللہ تعالیٰ نے اگرچہ طلاق کے ضمن میں بیان فرمائی ہے کہ جن عورتوں کو تم نے (پہلی یا دوسری) طلاق دی ہے اور ان کی عدت ختم ہونے کے قریب ہے' تو تمہیں اختیار ہے کہ عدت گزرنے سے پہلے پہلے رجوع کر لو' یا پھر ان کو اپنے سے علیحدہ کر دو (یعنی عدت گزر جانے دو) لیکن دونوں صورتوں میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ ان کو رخصت کرنا ہو تب بھی انہیں کوئی ہدیہ وغیرہ دے کر اپنے سے علیحدہ کرو اور اگر رجوع کر کے انہیں اپنے گھر (دوبارہ) بسانا چاہتے ہو' تب بھی تمہاری نیت انہیں صحیح طریقے سے آباد کرنا ہو' انہیں نقصان پہنچانا اور ان پر ظلم و زیادتی کرنا تمہارا مقصد نہیں ہونا چاہیے۔

لیکن اس میں عموم ہے کہ عورت کے ساتھ کسی وقت بھی اور کسی حالت میں بھی ظلم و زیادتی کرنے کی اجازت نہیں ہے' تمہارے گھر میں آباد ہے تب بھی اور طلاق دے کر تم دوبارہ آباد کرنا چاہتے ہو تب بھی۔ اگر ظلم و زیادتی کرو گے تو افسرانِ مجاز یا معاشرے کے ذمے دار افراد اس کا ازالہ کرنے کے ذمے دار ہوں گے اور بیوی کو نان و نفقہ مہیا نہ کرنا یا بلاوجہ مارنا پیٹنا بھی ظلم ہے۔ اگر خاوند حسن سلوک کا اہتمام کرنے سے قاصر ہو گا اور عورت اس بنا پر اس سے علیحدہ ہونا چاہے گی' تو ان کے درمیان جدائی کرانا ضروری ہو گا۔

آثارِ صحابہ و تابعین: بعض آثارِ صحابہ اور تابعین سے بھی مذکورہ موقف کی تائید ہوتی

ہے۔ چنانچہ ''مصنف عبدالرزاق'' وغیرہ کے حوالے سے التعليق المغنى على الدارقطنى میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک سرکلر (سرکاری حکم نامہ) ذکر کیا گیا ہے۔

«أَنَّهُ كَتَبَ إِلَى أُمَرَاءِ الأَجْنَادِ فِي رِجَالٍ غَابُوا عَنْ نِسَائِهِمْ، إِمَّا أَنْ يُّنْفِقُوا وَإِمَّا أَنْ يُطَلِّقُوا وَيَبْعَثُوا نَفَقَةَ مَا حَبَسُوا»(التعليق المغني، مولانا شمس الحق عظيم آبادي، صاحب عون المعبود: ٣/ ٢٩٧ طبع ١٩٦٦ء)

''حضرت عمر نے ان لوگوں کی بابت' جو اپنی بیویوں سے عرصہ' دراز سے دور (غائب) ہیں' لشکروں کے اُمراء کے نام یہ لکھا کہ وہ اپنی بیویوں کا خرچ بھیجیں یا ان کو طلاق دے دیں اور جتنا عرصہ انہوں نے خرچ روکے رکھا ان دنوں کا خرچہ بھی بھیجیں۔''

اسی طرح مشہور جلیل القدر تابعی کا قول ہے کہ ایسا شخص جو اپنی بیوی کا نان و نفقہ مہیا کرنے سے قاصر ہے تو اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کروا دی جائے۔

«عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ فِي الرَّجُلِ لاَ يَجِدُ مَا يُنْفِقُ عَلَى امْرَأَتِهِ، قَالَ يُفَرَّقُ بَيْنَهُمَا»(سنن الدارقطني: ٣/ ٢٩٧، ح: ٣٧٤١)

ابو الزناد کہتے ہیں' میں نے حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا' کیا یہ سنت ہے؟ انہوں نے کہا یہ سنت ہے۔ یہ نہایت قوی مرسل روایت ہے۔ (التعليق المغنى' ٣/ ٢٩٧)

فقہ حنفی کی صراحت: فقہ حنفی میں نان و نفقہ مہیا نہ کرنے کی صورت میں میاں بیوی کے درمیان تفریق کی اجازت نہیں۔ اس میں تفریق کی بجائے اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ بیوی قرض لے کر گزارہ کرتی رہے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ اس موقف میں معقولیت نہیں۔ آخر ایک گھریلو عورت کو زیادہ عرصے تک کون قرض دے گا؟ یا وہ کب تک قرض لے کر گزارہ کرے گی؟ پھر اس کی ادائیگی کب اور کون کرے گا؟ چنانچہ ان مشکلات کو دیکھتے ہوئے فقہائے احناف نے بھی تفریق کی اجازت دے دی' لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ معاملہ شافعی حاکم کی عدالت میں لے جا کر علیحدگی کا فیصلہ لے لیا جائے۔ حنفی حاکم از خود یہ فیصلہ نہ کرے۔ (شرح وقایہ: ٢/ ١٤٤)

لیکن یہ سیدھے طریقے سے ناک پکڑنے کی بجائے' پیچھے سے ہاتھ گھما کر ناک پکڑنے والی بات ہے۔ افسوس' تقلید کی جکڑ بندیوں نے عقل و دانش پر کس طرح پہرے بٹھائے ہوئے ہیں۔ الامان والحفیظ۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو' بالآخر فقہائے احناف نے بھی بالواسطہ عدم نان و نفقہ کی صورت میں تفریق بین الزوجین کی اہمیت کو تسلیم کر لیا ہے۔

نامردی کی صورت میں علیحدگی کا جواز: مرد اگر نامرد ہو تو اس صورت میں بھی نکاح کا مقصد پورا نہیں ہوتا' اس لیے اس صورت میں بھی عورت کی طرف سے طلاق کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔ اگر علاج معالجے کے باوجود مرد صحیح نہ ہو تو فی الفور علیحدگی کرا دی جائے' ورنہ اسے علاج کے لیے ایک سال کی مہلت دی جا سکتی ہے۔ بلوغ المرام میں ہے:

«قَضٰی بِهِ عُمَرُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فِي الْعِنِّينِ أَنْ يُؤَجَّلَ سَنَةً»(بلوغ المرام، النكاح، باب الكفاءة والخيار، سنن الدارقطني: ۳/ ۳۰۵، طبع مدينة منوره)

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نامرد کے بارے میں یہ فیصلہ فرمایا کہ اسے ایک سال تک مہلت دی جائے۔''

اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں حضرت ابو رکانہ عبدیزید رضی اللہ عنہ کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی ام رکانہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دے کر مزینہ قبیلے کی ایک عورت سے شادی کر لی' تو اس عورت نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر حضرت ابو رکانہ رضی اللہ عنہ کی بابت یہ شکایت کی کہ وہ نامرد ہیں' اس لیے آپ میرے اور ان کے درمیان جدائی کروا دیں۔ آپ نے اس معاملے کی تحقیق کی تو یہ بات تو صحیح ثابت نہیں ہوئی' کیونکہ ان کے بیٹے سب باپ کے مشابہ تھے' تاہم آپ نے ابو رکانہ سے کہا' اسے طلاق دے دو' چنانچہ انہوں نے طلاق دے دی۔ (ابوداود' الطلاق' باب نسخ المراجعة بعد التطليقات الثلاث' حدیث :۲۱۹۶- و صحیح ابی داود للالبانی)

اس حدیث میں ایک راوی کی جہالت کی وجہ سے کچھ ضعف ہے' لیکن البانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس حدیث کا متابع موجود ہے جس سے اس ضعف کا انجبار ہو جاتا ہے (ملاحظہ ہو: ارواء الغلیل' ۷/ ۱۴۴) یہی وجہ ہے کہ یہ حدیث انہوں نے صحیح ابی داود میں درج کی ہے۔

اس حدیث سے واضح ہے کہ نبی ﷺ نے محض نامردی کی تہمت ہی پر خاوند کو طلاق کا حکم فرمایا۔ گو حضرت ابو رکانہ رضی اللہ عنہ نامرد نہیں تھے' اس کے باوجود یہ دیکھ کر کہ یہ عورت ان کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی' آپ نے خاوند کو اپنے سے علیحدہ کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ علاوہ ازیں عورت نے بھی علیحدگی کے لیے نامردی کو جواز بنایا' گویا اس کے نزدیک بھی علیحدگی کے لیے نامردانہ پن ایک معقول سبب تھا۔ اس سے فی الجملہ مذکورہ موقف ہی کی تائید ہوتی ہے۔

بعض اور بیماریوں کی وجہ سے علیحدگی کا جواز: اسی طرح خاوند میں کوئی اور ایسی بیماری ہو جسے عورت ناپسند کرے اور شادی سے پہلے اس کی بابت اسے بتلایا نہ گیا ہو' تو وہ پھر بھی نکاح فسخ کرا کے خاوند سے علیحدہ ہو سکتی ہے۔ چنانچہ موطا امام مالک میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

«أَيُّمَا رَجُلٍ تَزَوَّجَ امْرَأَةً وَبِهَا جُنُونٌ أَوْ جُذَامٌ أَوْ بَرَصٌ فَمَسَّهَا، فَلَهَا صَدَاقُهَا كَامِلاً، وَذٰلِكَ لِزَوْجِهَا غَرْمٌ عَلٰى وَلِيِّهَا» (الموطا، النكاح، باب ماجاء في الصداق والحباء: ۲/ ۵۲۶ بتحقيق محمد فؤاد عبدالباقي)

"جس آدمی نے کسی عورت کے ساتھ شادی کی (بعد میں معلوم ہوا کہ) اسے دیوانگی' کوڑھ یا برص کی بیماری ہے (تو اسے اختیار ہے کہ اسے طلاق دے کر رخصت کر دے) اور اس سے اس نے صحبت کی ہے تو اسے اس کا پورا حق مہر دینا ہو گا اور یہ مہر خاوند عورت کے ولی سے وصول کرے گا۔ (جس نے اسے اس کے عیبوں سے آگاہ نہیں کیا' اس لیے بطور تاوان مہر کی رقم عورت کے ولی سے وصول کر کے خاوند کو دی جائے گی۔)"

اس اثر میں مرد کے اختیار کا بیان ہے۔ لیکن اس پر قیاس کرتے ہوئے یہی اختیار اس عورت کو بھی ہو گا جس کی شادی ایسے مرد سے کر دی جائے جس کو مذکورہ بیماریوں میں سے کوئی بیماری یا کوئی اور خطرناک بیماری لگی ہو اور شادی سے پہلے اس بیماری کی اطلاع اسے نہ مل سکی ہو' نیز اس بیماری کی وجہ سے وہ اس کے پاس رہنا پسند نہ کرے تو اسے بھی یہ

حق حاصل ہو گا کہ وہ خاوند سے بذریعۂ طلاق یا بذریعۂ عدالت یا پنچایت نکاح فسخ کرا کے علیحدگی اختیار کر لے۔ چنانچہ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

«وَالْقِيَاسُ: أَنَّ كُلَّ عَيْبٍ يَنْفِرُ الزَّوجُ الآخَرُ مِنْهُ، وَلاَ يَحْصُلُ بِهِ مَقْصُودُ النِّكَاحِ مِنَ الرَّحْمَةِ وَالْمَوَدَّةِ يُوجِبُ الْخِيَارَ، وَهُوَ أَوْلَى مِنَ الْبَيْعِ، كَمَا أَنَّ الشُّرُوطَ الْمُشْتَرَطَةَ فِي النِّكَاحِ أَوْلَى بِالْوَفَاءِ مِنْ شُرُوطِ الْبَيْعِ، وَمَا أَلْزَمَ اللهُ وَرَسُولُهُ مَغْرُوراً قَطُّ، وَلاَ مَغْبُوناً بِمَا غُرَّ بِهِ وَغُبِنَ بِهِ، وَمَنْ تَدَبَّرَ مَقَاصِدَ الشَّرْعِ فِي مَصَادِرِهِ وَمَوَارِدِهِ وَعَدْلِهِ وَحِكْمَتِهِ، وَمَا اشْتَمَلَ عَلَيْهِ مِنَ الْمَصَالِحِ لَمْ يَخْفَ عَلَيْهِ رُجْحَانُ هٰذَا الْقَوْلِ، وَقُرْبُهُ مِنْ قَوَاعِدِ الشَّرِيعَةِ»(زاد المعاد، طبع جديد محقق: ۵/ ۱۸۳)

"قیاس کا تقاضا ہے کہ ہر وہ عیب جو میاں بیوی میں سے ایک کو دوسرے سے متنفر کر دے اور اس کی وجہ سے نکاح کا مقصود --شفقت و محبت-- حاصل نہ ہو' وہ خیار کو واجب کر دے (یعنی وہ ساتھ رہیں یا نہ رہیں' یہ اختیار انہیں ملے) اور یہ خیار اس سے زیادہ اولیٰ ہے جو خرید و فروخت میں ملتا ہے۔ جیسے ان شرطوں کا پورا کرنا' جو نکاح میں باندھی جاتی ہیں' خرید و فروخت کی شرطوں سے اولیٰ ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے کبھی کسی "مغرور" (جس کو فریب دیا جائے) یا "مغبون" (جس سے بددیانتی کی جائے) پر اس چیز کو لازم نہیں کیا ہے جس میں ان کے ساتھ دھوکہ اور بددیانتی کی گئی ہو اور جو شریعت کے مقاصد اور اس کے عدل و حکمت اور اس پر مشتمل مصلحتوں پر غور کرے گا' تو اس رائے کا راجح ہونا اور اس کا قواعد شریعت کے قریب ہونا مخفی نہیں رہے گا۔"

معقول وجہ کے بغیر خلع کے مطالبے پر سخت وعید: مذکورہ تفصیل سے واضح ہے کہ ہر اس خطرناک بیماری کی وجہ سے عورت خلع کروا سکتی ہے جس سے اسے سخت نفرت و کراہت ہو اور اس کی وجہ سے وہ مرد کے وہ حقوق ادا کرنے سے قاصر ہو جو اس پر عائد

ہوتے ہیں۔ چنانچہ امام زہری کا قول ہے:

«يُرَدُّ النِّكَاحُ مِنْ كُلِّ دَاءٍ عُضَالٍ»(زاد المعاد: ٥/ ١٨٤)

''ہر خطرناک بیماری کی وجہ سے نکاح رد کر دیا جائے گا۔''

یعنی اگر عورت کسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہے' تو جیسے مرد کو حق حاصل ہے کہ وہ اسے طلاق دے کر اپنے سے جدا کر دے۔ اسی طرح اگر مرد کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہے جس کی وجہ سے عورت کے لیے مرد کے حقوق زوجیت ادا کرنے مشکل ہوں' تو وہ خلع کے ذریعے سے علیحدگی حاصل کر سکتی ہے۔ جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک اہل کار تھا جس کی بابت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو علم تھا کہ وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے' اسے انہوں نے اپنے کسی کام کے لیے بھیجا' تو اس نے وہاں جا کر ایک عورت سے شادی کر لی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علم میں جب یہ بات آئی' تو انہوں نے اس سے فرمایا: اَعْلَمْتَهَا اَنَّكَ عَقِيمٌ؟ فَانْطَلِقْ فَاَعْلِمْهَا' ثم خَيِّرْهَا' تو نے اس عورت کو بتلایا کہ تو اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ تو حضرت عمر نے اس سے کہا: جا اسے بتلا اور پھر اسے اختیار دے (کہ وہ اس صورت میں اس کے پاس رہنا پسند کرتی ہے یا نہیں؟) (مصنف عبدالرزاق' حدیث:۱۰۳۴۶)

تاہم جیسے کسی معقول وجہ کے بغیر' مرد کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ طلاق کا حق استعمال کرے۔ اسی طرح عورت کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ محض ذائقہ کی تبدیلی کے لیے' معقول سبب کے بغیر' خلع کا مطالبہ کرے۔ اگر کوئی عورت ایسا کرے گی تو اس کے لیے نبی ﷺ نے بڑی سخت وعید بیان فرمائی ہے۔ آپ نے فرمایا:

«أَيُّمَا امْرَأَةٍ سَأَلَتْ زَوجَهَا طَلَاقًا مِنْ غَيْرِ بَأْسٍ، فَحَرَامٌ عَلَيْهَا رَائِحَةُ الْجَنَّةِ»(جامع الترمذي، الطلاق، باب ماجاء في المختلعات، ح:١١٨٧ وارواء الغليل، الخلع:٧/ ١٠٠، ح:٢٠٣٥)

''جس عورت نے بغیر کسی وجہ کے اپنے خاوند سے طلاق کا مطالبہ کیا' تو وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گی۔''

خلع کے چند ضروری مسائل: خلع' طلاق ہے یا فسخ نکاح؟ اس میں فقہاء کا اختلاف

ہے۔ حافظ ابن القیم نے اسے فسخ نکاح قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو زادالمعاد' ۵/۱۹۶-۲۰۰) فقہائے محدثین بھی اسی رائے کے قائل ہیں۔

- خلع' طہر کی حالت ہو' یا حیض کی؟ دونوں حالتوں میں جائز ہے۔
- خلع کی عدت' ایک حیض ہے جیسا کہ احادیث میں صراحت ہے۔
- خلع میں' فدیہ یا معاوضہ زیادہ لینے سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ خاوند اس سے صرف وہی لے جو اس نے مہر یا ہدیہ وغیرہ دیا ہے۔
- خلع میں خاوند کو عدت کے اندر رجوع کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ البتہ دونوں کی رضامندی سے عدت گزرنے کے بعد باہم نکاح جائز ہے۔

-- ۱۲ --

عورت اور مسئلہ شہادت؟

خواتین کے امتیازی مسائل میں ایک مسئلہ عورت کی گواہی کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں "اموال و دُیون" کے بارے میں فرمایا کہ "ان کا ادھار لین دَین کرتے وقت لکھ لیا کرو اور دو مسلمان مردوں کو گواہ بنا لیا کرو۔ اگر دو مرد دستیاب نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنالو۔" (سورۃ البقرۃ:۲/ ۲۸۲)

اس آیت میں دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار دیا گیا ہے اور اس کی وجہ اسی آیت میں یہ بیان کی گئی ہے کہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری عورت اسے یاد کرا دے۔ گویا قرآن کریم کی رُو سے عورت کی گواہی بھی مرد کی گواہی سے آدھی ہے اور اس کی وجہ اس کی ایک فطری کمزوری ہے کہ عورت کا حافظہ مرد کے مقابلے میں کمزور ہے اور وہ نسیان کا زیادہ شکار ہو سکتی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اس حقیقت کو بیان فرمایا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ تَصَدَّقْنَ فَإِنِّي أُرِيتُكُنَّ أَكْثَرَ أَهْلِ النَّارِ، فَقُلْنَ وَبِمَ يَارَسُولَ اللهِ؟ قَالَ تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ، وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ، مَا رَأَيْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَدِينٍ أَذْهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ إِحْدَاكُنَّ، قُلْنَ: وَمَا نُقْصَانُ دِينِنَا وَعَقْلِنَا يَارَسُولَ اللهِ؟ قَالَ أَلَيْسَ شَهَادَةُ الْمَرْأَةِ مِثْلَ نِصْفِ شَهَادَةِ الرَّجُلِ؟ قُلْنَ: بَلٰى، قَالَ: فَذٰلِكَ مِنْ نُقْصَانِ عَقْلِهَا، أَلَيْسَ إِذَا حَاضَتْ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ؟ قُلْنَ: بَلٰى، قَالَ: فَذٰلِكَ مِنْ نُقْصَانِ دِينِهَا»(صحيح البخاري، الحيض، باب

ترك الحائض الصوم، ح:٣٠٤ وصحيح مسلم، الإيمان، باب بيان نقصان الإيمان بنقص الطاعات ... الخ، ح:٧٩)

"اے عورتوں کی جماعت! تم (کثرت سے) صدقہ کیا کرو' اس لیے کہ میرے مشاہدے میں (جب مجھے جہنم دکھائی گئی) یہ بات آئی ہے کہ تمھاری اکثریت جہنمی ہے۔ عورتوں نے کہا' اللہ کے رسول ایسا کیوں ہے؟ آپ نے فرمایا' تم لعن طعن زیادہ کرتی ہو اور خاوند کی ناشکری کرتی ہو' میں نے' عقل اور دین میں کم ہونے کے باوجود تم سے زیادہ سمجھ دار آدمی کی عقل کو ماؤف کرنے والا نہیں دیکھا۔ انھوں نے پوچھا۔ اللہ کے رسول! ہمارے دین اور ہماری عقل میں کیا کمی ہے؟ آپ نے فرمایا: کیا عورت کی گواہی' مرد کی گواہی سے آدھی نہیں ہے؟ عورتوں نے کہا۔ ہاں! کیوں نہیں۔ آپ نے فرمایا' یہ عورت کی عقل کی کمی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ جب عورت کے ایام حیض شروع ہوتے ہیں تو وہ نماز پڑھتی ہے نہ روزے رکھتی ہے؟ عورتوں نے کہا' ہاں! کیوں نہیں۔ آپ نے فرمایا: پس یہ اس کے دین کی کمی ہے۔"

عورت کے عقل و دین میں ناقص ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے عورت ملامت یا حقارت کی مستحق ہے' بلکہ یہ عورت کی ایک فطری کمزوری کی وضاحت ہے' تاکہ مرد اس کمزوری کی وجہ سے عورت کے فتنے سے بچ کر رہیں' چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

«وَلَيْسَ الْمَقْصُودُ بِذِكْرِ النَّقْصِ فِي النِّسَآءِ لَوْمُهُنَّ عَلٰى ذٰلِكَ، لِأَنَّهُ مِنْ أَصْلِ الْخِلْقَةِ، لٰكِنَّ التَّنْبِيهَ عَلٰى ذٰلِكَ تَحْذِيرًا مِنَ الِافْتِتَانِ بِهِنَّ، وَلِهٰذَا رُتِّبَ الْعَذَابُ عَلٰى مَا ذُكِرَ، مِنَ الْكُفْرَانِ وَغَيْرِهِ لَا عَلَى النَّقْصِ»(فتح الباري، الحيض: ١/٥٢٨)

"عورتوں کے نقص (کمی) کے ذکر سے مقصود' ان کو ملامت کرنا نہیں ہے' اس لیے کہ وہ پیدائشی (فطری) چیز ہے۔ اصل مقصود اس سے یہ تنبیہ کرنا ہے کہ مرد ان

عورتوں کے فتنے میں مبتلا ہونے سے بچیں۔ یہی وجہ ہے کہ عورتوں کے جہنمی ہونے کا جو ذکر کیا گیا ہے' تو اس کا سبب (خاوند کی) ناشکری وغیرہ ہے نہ کہ عقل و دین کا نقص۔"

بہرحال قرآن کریم اور حدیث رسول دونوں سے یہ بات ثابت ہے کہ عام حالات میں عورت کی گواہی مرد کی گواہی سے نصف ہے اور اس کی وجہ اس کا مرد سے کم تر ہونا نہیں ہے' بلکہ مرد سے بعض اوصاف میں کم ہونا ہے۔ اس کی تفصیل اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

عورت کی گواہی کی تین قسمیں: عورت کی گواہی کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) مالی معاملات میں گواہی۔

(۲) ان معاملات میں گواہی جن پر صرف عورتیں ہی مطلع ہو سکتی ہیں۔

(۳) حدود و قصاص میں گواہی۔

پہلی قسم کا ذکر تو خود قرآن کریم میں ہے' اس لیے اس میں زیادہ اختلاف نہیں۔ دوسری قسم میں بھی اختلاف کی گنجائش نہیں' کیونکہ ان معاملات میں عورت کی گواہی تسلیم کیے بغیر چارہ ہی نہیں۔ زیادہ اختلاف تیسری قسم ہی میں ہے اور اسی گواہی میں ہی عورت کو عدالتی چکروں میں پڑنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جس میں ایک تو عورت کو بار بار گھر سے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ دوسرے' مردوں کے ساتھ اختلاط ہوتا ہے اور عورت کے حق میں ان دونوں ہی باتوں کو اسلام پسند نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں عدالتی بحث و جرح کا مقابلہ کرنا بھی عورت کے لیے سخت مشکل ہے۔ آئندہ صفحات میں ہم تینوں قسم کی گواہیوں پر قدرے تفصیل سے بعون اللہ و توفیقہ گفتگو کریں گے۔

عدالتی شہادت میں عورت کی فطری کمزوری کی وضاحت: آگے چلنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی بعض فطری کمزوریوں کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے' اسے ذرا واضح کر دیا جائے' کیونکہ آئندہ بحث کا مدار اسی بنیاد پر ہو گا۔

● عورت خلقی طور پر مرد سے کمزور ہے' یہ ایسی واضح اور بدیہی چیز ہے کہ اس پر دلائل پیش کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ اس کا جنسی نام "صنف نازک"

بھی اس امر پر دال ہے۔ نبی ﷺ نے بھی لَا تُكْسِرِ الْقَوَارِيرَ [1] فرما کر ان کو آبگینوں سے تشبیہ دی ہے۔ اسی لیے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

«اِنَّ ضُعْفَ النِّسَاءِ بِالنِّسْبَةِ إِلَى الرِّجَالِ مِنَ الأُمُورِ الْمَحْسُوسَةِ الَّتِي لاَ تَحْتَاجُ إِلَى دَلِيلٍ خَاصٍ»(فتح الباري، الجنائز: ۳/ ۲۳۳)

''مردوں کی نسبت عورتوں کا کمزور ہونا ایسے عام مشاہدے کی بات ہے جو کسی خاص دلیل کی محتاج نہیں۔''

◐ عدالتی شہادت میں بڑے بڑے زبان آور بھی تامل اور حجاب محسوس کرتے ہیں تو عورت جرح سے کس طرح کماحقہ عہدہ برآ ہو سکتی ہے جس کے بارے میں خود قرآن نے کہا ہے ﴿ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ ﴾ قرآن کریم میں مشرکین کے اس نظریے کی تغلیط و تردید کرتے ہوئے کہ -- فرشتے اللہ تعالیٰ کی لڑکیاں ہیں-- اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ أَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنَاتٍ وَأَصْفَاكُم بِالْبَنِينَ ﴿١٦﴾ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمَٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ﴿١٧﴾ أَوَمَن يُنَشَّأُ فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ ﴿١٨﴾ ﴾ (الزخرف۴۳/ ۱۶۔۱۸)

''کیا اللہ نے اپنی مخلوقات میں سے اپنے لیے بیٹیاں رکھیں اور تم کو چن کر بیٹے دیے؟ (حالانکہ ان کا حال یہ ہے) کہ جب ان میں سے کسی کو اس چیز کے ساتھ خوش خبری دی جاتی ہے جس کو وہ رحمٰن کے لیے بطور مثال بیان کرتے ہیں' تو اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے اور دل میں گھٹ رہا ہوتا ہے۔ (کیا تم رب کی طرف اس کو منسوب کرتے ہو) جس کی نشوونما زیورات میں ہوتی ہے اور جھگڑے کے وقت وہ اظہار مدعا پر قادر نہیں۔''

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے عورت کی دو فطری کمزوریوں کی نشاندہی کی۔ ایک' یہ کہ آرائش و زیبائش اور زیورات کی وہ دلدادہ ہے اور دوسری' جھگڑے کے موقعے پر اپنا مافی الضمیر صحیح طریقے سے ادا کرنے سے وہ قاصر رہتی ہے۔

---

[1] صحیح مسلم' الفضائل' باب رحمتہ ﷺ النساء --- الخ' حدیث: ۲۳۲۳۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے جو تشریحات پیش کی ہیں' وہ حسب ذیل ہیں۔ پہلے چند اُردو کے تراجم اور تفاسیر ملاحظہ فرمائیں۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ و تفسیر: "کیا جو کہ آرائش میں نشوونما پائے اور وہ مباحثہ میں قوت بیانیہ نہ رکھے۔"

تفسیر "یعنی گو لڑکی ہونا فی نفسہ موجب عار و مذلت نہیں' جیسا تم سمجھ رہے ہو' لیکن اس میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ باعتبار اپنی اصل وضع کے -- قطع نظر عوارض سے -- ناقص العقل ضعیف الرائے ضرور ہے۔ جب یہ بات ہے تو کیا خدا نے اولاد بنانے کے لیے لڑکی کو پسند کیا ہے جو کہ عادۃً آرائش و زیبائش میں نشوونما پائے (جو کہ علامت اور نیز سبب ہے رغبت الی الحلیہ کا جس کے لوازمِ عادیہ سے ہے ضعف رائے و عقل) اور وہ بوجہ ضعف قوت فکریہ کے مباحثہ میں قوت بیانیہ بھی نہ رکھے۔ چنانچہ ان (عورتوں) کی تقریرات میں ذرا غور کرنے سے مشاہد ہوتا ہے کہ نہ اپنے دعوے کو کافی بیان سے ثابت کر سکیں اور نہ دوسرے کے دعوے کو ہدم کر سکیں' ہمیشہ ادھوری بات کہیں گی یا فضول باتیں اس میں ملا دیں گی جن کو مطلوب میں کچھ دخل نہ ہو کہ اس سے بھی تبیین مقصود میں خلل پڑ جاتا ہے اور مباحثہ کی تخصیص اس حیثیت سے ہے کہ اس میں بوجہ زیادتی احتیاج بیان کے ان کا عجز زیادہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ پس ہر کلام مطول اسی کے حکم میں ہے اور معمولی جملوں کا ادا ہو جانا قوت بیانیہ کی دلیل نہیں' جیسے میں آئی تھی' وہ گئی تھی" (ترجمہ و تفسیر بیان القرآن' ص:۹۴۶' مطبوعہ تاج کمپنی)

ترجمہ و تفسیر از مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی مرحوم: (کیا جو آرائش میں نشوونما پائے) اس سے معلوم ہوا کہ عورت کے لیے زیور کا استعمال اور موافق شرع آرائش کے طریقے اختیار کرنا جائز ہے' چنانچہ اس پر اجماع ہے' لیکن ساتھ ہی پیرایہٗ بیان یہ بتا رہا ہے کہ آرائش میں اتنا انہماک کہ صبح و شام بناؤ سنگھار ہی میں لگی رہے۔ یہ مناسب نہیں' بلکہ یہ ضعف عقل و رائے کی علامت بھی ہے اور اس کا سبب بھی۔

(اور وہ مباحثہ میں قوت بیانیہ بھی نہ رکھے) مطلب یہ ہے کہ عورتوں کی اکثریت ایسی

ہے کہ وہ مافی الضمیر کو قوت اور وضاحت کے ساتھ بیان کرنے پر مَردوں کے برابر قادر نہیں ہوتی۔ اسی لیے اگر کہیں مباحثہ ہو جائے تو اپنے دعوے کو ثابت کرنا اور دوسرے کے دلائل کو ردّ کرنا اس کے لیے مشکل ہوتا ہے' لیکن یہ حکم اکثریت کے اعتبار سے ہے۔ للذا اگر کچھ عورتیں سلیقۂ گفتار کی مالک ہوں اور اس معاملے میں مَردوں سے بھی بڑھ جائیں تو اس آیت کے منافی نہیں' کیونکہ حکم اکثریت پر لگتا ہے اور اکثریت بلاشبہ ایسی ہی ہے۔"
(معارف القرآن' ۷/۷۴۴)

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی مرحوم: (کیا بیٹی (ذات) جو زیوروں میں نشوونما پائے (اور کوئی جھگڑا آ پڑے تو) جھگڑتے وقت (اچھی طرح) اظہارِ (مطلب) نہ کر سکے (وہ خدا کی شان کے زیبا ہے؟)
حاشیہ: عورتوں کو خدا نے ایسا ضعیف القلب پیدا کیا ہے کہ عام جلسوں میں ان سے گفتگو تک کرتے بن نہیں پڑتی اور یہ ان کا خلقی نقصان ہے۔ چنانچہ اب بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے انگریز اپنی بی بیوں کو درباروں میں لیے پھرتے ہیں اور لوگ مارے خوشامد کے ان بی بیوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور ان کی خدمات ملکی گنواتے ہیں' مگر ان عورتوں سے کچھ بھی کہتے بن نہیں پڑتا' ہاں! ان کے شوہران کی طرف سے جواب بھی دیتے ہیں' شکریے بھی ادا کرتے ہیں۔ (قرآن مجید' مطبوعہ ۱۳۲۳ھ)

مولانا احمد رضا بریلوی: (ترجمہ کنز الایمان' تفسیر مولانا نعیم الدین مراد آبادی) --(وہ جو گہنے میں پروان چڑھے) یعنی زیوروں کی زیب و زینت میں ناز و نزاکت کے ساتھ پرورش پائے۔
فائدہ - اس سے معلوم ہوا کہ زیور سے تزین دلیل نقصان ہے' تو مردوں کو اس سے اجتناب چاہیے۔ پرہیزگاری سے اپنی زینت کریں۔ اب آگے آیت میں لڑکی کی ایک اور کمزوری کا اظہار فرمایا جاتا ہے۔ (اور بحث میں صاف بات نہ کرے) یعنی اپنے ضعف حال اور قلت عقل کی وجہ سے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عورت جب گفتگو کرتی ہے اور اپنی تائید میں کوئی دلیل پیش کرنا چاہتی ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے خلاف دلیل پیش کر دیتی ہے۔" (قرآن مجید' ص:۷۸۰' طبع تاج کمپنی)

ترجمہ مولانا احمد علی لاہوری' شیخ التفسیر: "کیا اس کے لیے وہ ہے جو زیور میں پلتی ہے

اور جھگڑے میں بات نہیں کر سکتی۔" (قرآن مجید' ص:۸۰۱)

ترجمہ و تفسیر مولانا ثناء اللہ امرتسری: کیا وہ بیٹی جو زیور میں نشوونما پاتی ہے (اور مقابلے کی گفتگو میں بوجہ خلقی کمزوری کے اچھی طرح بیان نہیں کر سکتی' وہ تو خدا کے لیے اور بیٹے تمہارے لیے..... (قرآن مجید مترجم' ص:۵۸۷' مطبوعہ لاہور)

مولانا عبدالحق حقانی دہلوی: (کیا اس کے لیے وہ ہے کہ جو زیور میں پلتی ہے اور جھگڑے میں بات بھی نہ کر سکے)

تفسیر: عرب بیٹیوں کا پیدا ہونا اپنی عزت کے خلاف جانتے تھے' اس لیے قتل کر ڈالتے تھے اور خبر سن کر بڑا رنج ہوتا تھا۔ پھر ایسی چیز تو آپ لے اور بیٹے تم کو دے۔ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے؟ اس کے علاوہ اولاد سے جو فائدہ متصور ہوتا ہے کہ وہ میدانِ کارزار میں کام دے اور مجالس میں سیف لسانی سے کام لے' یہ بھی ان سے حاصل نہیں۔ اس بات کو اس جملے میں بیان فرماتا ہے اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا کہ کیا جو زیور میں اور آرائش میں پرورش پاتی ہیں (یعنی لڑکیاں) اور جھگڑوں میں گویائی سے عاجز ہیں' کیوں کہ عورت کی تربیت میں زیور و آرائش ہے جو مردانگی کے خلاف ہے اور شرم و لحاظ کی وجہ سے خوب بات نہیں کر سکتیں' وہ اس نے اپنے لیے پسند کی ہیں' ہرگز نہیں۔ یہاں سے ثابت ہوا کہ زنانہ تجمل و آرائش مذموم ہے۔" (تفسیر حقانی' پارہ:۲۵' ۳۲/۴' طبع کراچی)

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم: (کیا اللہ کے حصے میں وہ اولاد آئی جو زیوروں میں پالی جاتی ہے اور بحث و حجت میں اپنا مدعا پوری طرح واضح بھی نہیں کر سکتی) بالفاظ دیگر جو نرم و نازک اور ضعیف و کمزور اولاد ہے وہ تم نے اللہ کے حصے میں ڈالی اور خم ٹھونک کر میدان میں اترنے والی اولاد خود لے اڑے۔ اس آیت سے عورتوں کے لیے زیور کے جواز کا پہلو نکلتا ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے زیور کو ایک فطری چیز قرار دیا ہے۔ (تفہیم القرآن: ۵۳۱/۴)

مولانا امیر علی ملیح آبادی مرحوم: "اور کیا اس نے ایسی زنانیوں کو لے لیا جو زیور میں پلتی ہیں۔" ف: اور زینت کو اپنے نفس کے واسطے کمال سمجھتی ہیں' نہ ان میں عقل کامل ہے اور نہ دین کامل ہے اور نہ ان کے واسطے حجت و امامت ہے۔

"اور مخاصمہ کرنے میں یہ مخلوق صفائی سے بیان نہیں کر سکتی۔" ف : نہ اس کی عبارت ٹھیک ہے اور نہ اپنے دعوے کے موافق بیان کر سکتی ہے اور نہ دعوے پر حجت و برہان لا سکتی ہے اور نہ تلوار سے اپنا جھگڑا فیصل کر سکتی ہے۔ قتادہ نے کہا کہ عورت کو یہ لیاقت نہیں ہوتی کہ اپنے دعوے پر حجت بیان کرے اور اگر کچھ بیان لا دے تو اکثر یہی ہوتا ہے کہ الٹے اپنے اوپر حجت قائم کرتی ہے اور اس کو خبر نہیں ہوتی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہ عورتوں کا حال ہے کہ ان کے لباس میں اور مردوں کے لباس میں فرق ہے اور ان کی میراث کم ہے اور ان کی گواہی ضعیف ہے اور ان کو گھر بیٹھنے کا حکم ہے۔"

(تفسیر مواہب الرحمٰن' پارہ:۲۵' ص:۱۰۳)

مولانا شبیر احمد عثمانی نے بھی اپنے حاشیہ قرآن میں یہی وضاحت کی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی مرحوم: "تو کیا جو زیورات میں پرورش پائے اور مباحثہ میں بھی ژولیدہ بیان ہو (وہ اللہ کی اولاد بننے کے قابل ہے۔)"

حاشیہ : آیت سے فطرت نسوانی کے متعلق دو حقیقتیں ثابت ہوئیں۔ ایک یہ کہ زیور' آرائش و نمائش کا شوق عورت کی سرشت میں داخل ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی قوت استدلال بھی ضعیف ہے۔ ان دونوں کے لیے ملاحظہ ہوں انگریزی تفسیر القرآن کے حاشیے۔ آج دیکھ لیا جائے کہ یورپ اور امریکہ کی زن جدید اپنی آرائش و زیبائش کے سامان پر' اپنی تزئین جمال اور اپنے بناؤ سنگھار پر کتنی دولت ہر سال بے دریغ خرچ کرتی رہتی ہے۔

(تفسیر ماجدی :۹۸۰/۲ تاج کمپنی)

مولانا احمد سعید دہلوی مرحوم: "کیا وہ جو زیور کی زیبائش اور آرائش میں پرورش پائے اور پروان چڑھے اور وہ جھگڑے اور مباحثے میں صاف طور پر اظہار مدعا نہ کر سکے' یہ لوگ اس کو رحمان کی اولاد ٹھہراتے ہیں' یعنی عادۃً لڑکی کی پرورش آرائش اور زیبائش میں ہوتی ہے' ماں باپ زیور پہناتے ہیں' اس کا بناؤ سنگھار کیا جاتا ہے۔ پھر ضعف رائے اور قوت فکر کی کمزوری کا یہ عالم کہ بحث مباحثے اور جھگڑے کے وقت اپنے مدعا کو صاف طور پر بیان بھی نہ کر سکے۔ ایسی کمزور چیز کو خدا کی اولاد قرار دیتے ہو۔" (کشف الرحمٰن :۸۲/۲ ۷' طبع کراچی)

عربی تفاسیر: یہاں تک اُردو و تراجم و تفاسیر کا ذکر ہوا ہے' اب عربی تفاسیر کے اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

التفسیر الکبیر- امام رازی:

﴿أَوَمَنْ يُنَشَّؤُ فِي الْحِلْيَةِ﴾ التَّنْبِيهُ عَلٰى نُقْصَانِهَا، وَهُوَ أَنَّ الَّذِي يُرَبّٰي فِي الْحِلْيَةِ يَكُونُ نَاقِصَ الذَّاتِ، لأَنَّهُ لَوْلاَ نُقْصَانٌ فِي ذَاتِهَا لَمَا احْتَاجَتْ إِلَى تَزْيِينِ نَفْسِهَا بِالْحِلْيَةِ، ثُمَّ بَيَّنَ نُقْصَانَ حَالِهَا بِطَرِيقٍ آخَرَ، وَهُوَ قَوْلُهُ ﴿وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ﴾ يَعْنِي أَنَّهَا إِذَا احْتَاجَتِ الْمُخَاصَمَةَ وَالْمُنَازَعَةَ عَجِزَتْ وَكَانَتْ غَيْرَ مُبِينٍ، وَذٰلِكَ لِضُعْفِ لِسَانِهَا وَقِلَّةِ عَقْلِهَا وَبَلاَدَةِ طَبْعِهَا، وَيُقَالُ قَلَّمَا تَكَلَّمَتِ امْرَأَةٌ فَأَرَادَتْ أَنْ تَتَكَلَّمَ بِحُجَّتِهَا إِلاَّ تَكَلَّمَتْ بِمَا كَانَ حُجَّةٌ عَلَيْهَا، فَهٰذِهِ الْوُجُوهُ دَالَّةٌ عَلٰى كَمَالِ نَقْصِهَا، فَكَيْفَ يَجُوزُ إِضَافَتُهُنَّ بِالْوَلَدِيَّةِ إِلَيهِ»(التفسير الكبير: ۲۷/ ۲۰۲)

یہ اقتباسات صرف ان تفاسیر سے نقل کیے گئے ہیں جن کی عبارتوں اور تشریحات میں قدرے اختلاف ہے اور کئی تفاسیر ایسی ہیں' جن میں لفظ بہ لفظ دوسری تفاسیر کی عبارت نقل کر دی گئی ہے۔ تکرار سے بچتے ہوئے راقم نے ان کی عبارتیں نقل کرنے سے گریز کیا ہے' البتہ ان تفاسیر کے حوالے ذیل میں درج ہیں جن میں مذکورہ بالا تفسیر ہی کی گئی ہے۔

جامع البیان عن تاویل آی القرآن- تفسیر ابن جریر طبری:

«أَوَمَنْ يُنْبَتُ فِي الْحِلْيَةِ وَيُزَيَّنُ بِهَا ﴿وَهُوَ فِي الْخِصَامِ﴾ يَقُولُ: وَهُوَ فِي مُخَاصَمَةِ مَنْ خَاصَمَهُ عِنْدَ الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ، وَمَنْ خَصَمَهُ، بِبُرْهَانٍ وَحُجَّةٍ، لِعَجزِهِ وَضَعْفِهِ، جَعَلْتُمُوهُ جُزْءَ اللّٰهِ مِنْ خَلْقِهِ وَزَعَمْتُمْ أَنَّهُ نَصِيبُهُ مِنْهُمْ»(۱۳/ ۷۳)

تفسیر ابی السعود- امام ابو مسعود محمد بن العمادی:

﴿وَهُوَ﴾ مَعَ مَا ذُكِرَ مِنَ الْقُصُورِ ﴿فِي الْخِصَامِ﴾ أَيِ الْجِدَالَ

الَّذِي لاَ يَكَادُ يَخْلُو عَنْهُ الإنْسَانُ فِي الْعَادَةِ ﴿غَيرُ مُبِينٍ﴾ غَيْرَ قَادِرٍ عَلٰى تَقْرِيرِ دَعْوَاهُ وَإِقَامَةِ حُجَّتِهِ لِنُقْصَانِ عَقْلِهِ وَضُعْفِ رَأْيِهِ»(٨/ ٤٢، طبع بيروت لبنان)

تفسیر غرائب القرآن و رغائب الفرقان - نظام الدین الحسن بن محمد النیساپوری:

«وَهِيَ أَنَّهُ يُرَبَّى أَو يَتَرَبَّى فِي الزِّينَةِ وَالنُّعُومَةِ وَهُوَ إِذَا احْتَاجَ إِلَى الْمُخَاصَمَةِ لاَ يُبَيِّنُ وَلاَ يُعْرِبُ عَمَّا فِي ضَمِيرِهِ لِعِجْزِهِ عَنِ الْبَيَانِ وَلِقِلَّةِ عَقْلِهِ، قَالَتِ الْعُقَلاَءُ فَلَمَّا تَكَلَّمَتِ امْرَأَةٌ فَأَرَادَتْ اَنْ تُعْرِبَ عَنْ حُجَّتِهَا إِلاَّ نَطَقَتْ بِمَا هُوَ حُجَّةٌ عَلَيْهَا»(پاره: ٢٥، ص: ٤٥، طبع مصر)

تفسیر المراغی - احمد مصطفی المراغی:

﴿أَوَمَنْ . . .﴾ أَي أَوَقَدْ جَعَلُوا للهِ الأُنْثٰى الَّتِي تَتَرَبَّى فِي الزِّينَةِ، وَإِذَا خُوصِمَتْ لاَ تَقْدِرُ عَلٰى إِقَامَةِ حُجَّةٍ وَلاَ تَقْرِيرِ دَعْوٰى، لِنُقْصَانِ عَقْلِهَا وَضُعْفِ رَأْيِهَا؟ وَمَا كَانَ يَنْبَغِي لَهُمْ اَنْ يَفْعَلُوا ذٰلِكَ، وَفِي قَوْلِهِ ﴿يُنَشَّأُ فِي الْحِلْيَةِ﴾ إِيمَاءٌ إِلٰى مَا فِيهِنَّ مِنَ الدَّعَةِ وَرَخَاوَةِ الْخَلْقِ بِضُعْفِ الْمُقَاوَمَةِ الْجِسْمِيَّةِ وَاللِّسَانِيَّةِ، كَمَا أَنَّ فِيهِ دَلاَلَةٌ عَلٰى أَنَّ النَّشُوَّ فِي الزِّينَةِ وَنُعُومَةِ الْعَيْشِ مِنَ الْمَعَايِبِ وَالْمَذَامِّ لِلرِّجَالِ»(٩/ ٦٤، پاره٢٥، ص: ٧٧، طبع مصر)

فتح البیان فی مقاصد القرآن - سید نواب صدیق حسن خان:

﴿غَيْرُ مُبِينٍ﴾ اَيْ عَاجِزٌ عَنْ أَنْ يَقُومَ بِأَمْرِ نَفْسِهِ وَإِذَا خُوصِمَ لاَ يَقْدِرُ عَلٰى إِقَامَةِ حُجَّتِهِ وَتَقْرِيرِ دَعْوَاهُ، وَدَفْعِ مَا يُجَادِلُهُ بِهِ خَصْمُهُ لِنُقْصَانِ عَقْلِهِ، وَضُعْفِ رَأْيِهِ. . . »(٦/ ٢٢٤)

تفسیر البحر المحیط - ابو حیان الاندلسی:

«وَهُوَ إِنْ خَاصَمَ لاَ يُبَيِّنُ لِضُعْفِ الْعَقْلِ وَنَقْصِ التَّدَبُّرِ وَالتَّأَمُّلِ ... وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ وَمُجَاهِدٌ وَقَتَادَةُ وَالسُّدِّيُّ وَيَدُلُّ عَلَيهِ قَوْلُهُ ﴿وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ﴾ ... اَي لاَ يُظْهِرُ حُجَّةً وَلاَ يُقِيمُ دَلِيلاً وَلاَ يَكْشِفُ عَمَّا فِي نَفْسِهِ كَشْفًا وَاضِحًا وَيُقَالُ قَلَّمَا تَجِدُ امْرَأَةً لاَ تُفْسِدُ الْكَلاَمَ وَتُخْلِطُ الْمَعَانِي»(٨/٨، طبع رياض، سعودي عرب)

تفسیر الکشاف - علامہ جار اللہ زمخشری:

«اَي يَتَرَبَّى فِي الزِّينَةِ وَالنِّعْمَةِ، وَهُوَ إِذَا احْتَاجَ إِلٰى مَجَانَاةِ الْخُصُومِ وَمَجَارَاةِ الرِّجَالِ كَانَ غَيرَ مُبِينٍ، لَيسَ عِنْدَهُ بَيَانٌ، وَلاَ يَأْتِي بِبُرْهَانٍ يُحْتَجُّ بِهِ مَنْ يُخَاصِمُهُ وَذٰلِكَ لِضُعْفِ عُقُولِ النِّسَاءِ وَنُقْصَانِهِنَّ عَنْ فِطْرَةِ الرِّجَالِ»(٤/ ٢٤٣)

تفسیر المظہری - قاضی ثناء اللہ پانی پتی:

«اَي يَنْبُتُ وَيَكْبُرُ فِي الْحِلْيَةِ يَعْنِي النِّسَاءَ فَإِنَّ حُسْنَهُنَّ مُنْحَصِرٌ فِي الصُّورَةِ فَيَتَزَيَّنَّ بِالْحِلْيَةِ لِيَزْدَدْنَ حُسْنُهُنَّ بِخِلاَفِ الرِّجَالِ فَإِنَّ حُسْنَهُمْ غَالِبًا بِالْمَعَانِي وَالأَوْصَافِ وَذٰلِكَ غَيرُ مُحْتَاجٍ إِلَى الْحِلْيَةِ وَفِيهِ إِشْمَامٌ بِأَنَّ النَّشْأَ فِي الزِّينَةِ مِنَ الْمَعَايِبِ فَعَلَى الرِّجَالِ اَنْ يَّجْتَنِبُوا وَيَتَزَيَّنُوا بِلِبَاسِ التَّقْوٰى ﴿وَهُوَ فِي الْخِصَامِ﴾ اَي فِي الْمَحَاجَّةِ بِاللِّسَانِ وَبِالسِّنَانِ ﴿غَيرُ مُبِينٍ﴾ اَي غَيرُ مُظْهِرٍ حُجَّتَهُنَّ لِنُقْصَانِ عَقْلِهِنَّ وَضُعْفِ أَبْدَانِهِنَّ وَقُلُوبِهِنَّ قَالَ قَتَادَةُ وَالْمَعْنٰى أَمِ اتَّخَذَ مِنْ مَخْلُوقَاتِهِ بَنَاتٍ مَبْغُوضَاتٍ مَكْرُوهَاتٍ مُوجِبَاتٍ لِسَوَادِ الْوَجْهِ نَاشِيَاتٍ فِي الْحِلْيَةِ ضَعِيفَاتٍ قَلْبًا وَقَالِبًا وَعَقْلاً»(٨/ ٣٤٢، طبع دهلي)

انوار التنزیل و اسرار التاویل - ناصر الدین ابوالخیر عبداللہ بن عمر البیضاوی:

«اي أَوَ جَعَلُوا لَهُ، اَوِ اتَّخَذَ مَنْ يَّـتَرَبّٰى فِي الزِّينَةِ يَعْنِي الْبَنَاتِ ﴿وَهُوَ فِي الْخِصَامِ﴾ فِي الْمُجَادَلَةِ ﴿غَيرُ مُبِينٍ﴾ مُقَرِّرٌ لِمَا يَدَّعِيهِ مِنْ نُقْصَانِ الْعَقْلِ وَضُعْفِ الرَّأْيِ»(٥/٨٨)

تفسیر جلالین - للسیوطی والمحلی :

﴿وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيرُ مُبِينٍ﴾ مُظْهِرُ الْحُجَّةِ لِضُعْفِهَا عَنْهَا بِالأُنُوثَةِ» (حواله مذكور بأسفلها)

تفسیر ابن کثیر - عمادالدین ابوالفداء اسماعیل بن کثیر الدمشقی :

«أَيِ الْمَرْأَةُ نَاقِصَةٌ يَكْمُلُ نَقْصُهَا بِلُبْسِ الْحُلِيِّ مُنْذُ تَـكُونُ طِفْلَةً وَإِذَا خَاصَمَتْ فَلاَ عِبَارَةَ لَهَا بَلْ هِيَ عَاجِزَةٌ عِيِيَّةٌ أَوَ مَنْ يَكُونُ هٰكَذَا يُنْسَبُ إِلٰى جَنَابِ اللهِ الْعَظِيمِ، فَالأُنْثٰى نَاقِصَةُ الظَّاهِرِ وَالْبَاطِنِ فِي الصُّورَةِ وَالْمَعْنٰى، فَيَكْمُلُ نَقْصُ ظَاهِرِهَا وَصُورَتِهَا بِلُبْسِ الْحُلِيِّ وَمَا فِي مَعْنَاهُ لِيُجْبَرَ مَا فِيهَا مِنْ نَقْصٍ . . . وَأَمَّا نَقْصُ مَعْنَاهَا فَإِنَّهَا ضَعِيفَةٌ عَاجِزَةٌ عَنِ الانْتِصَارِ عِنْدَ الانْتِصَارِ لاَ عِبَارَةَ لَهَا وَلاَ هِمَّةَ . . . »(تفسير ابن كثير: ٤/١٥٩)

روح البیان - الشیخ اسماعیل :

«غَيْرُ قَادِرٍ عَلٰى تَقْرِيرِ دَعْوَاهُ وَمُقَامَةِ حُجَّتِهِ كَمَا يَقْدِرُ الرَّجُلُ عَلَيْهِ لِنُقْصَانِ عَقْلِهِ وَضُعْفِ رَأْيِهِ . . . وَهٰذَا بِحَسْبِ الْغَالِبِ . . . »

(٨/ ٣٥٨)

- روح المعانی 108/14- علامہ شہاب الدین محمود آلوسی۔
- تفسیر زاد المسیر 306/7- امام ابن الجوزی۔
- تفسیر القاسمی' 330/8- جمال الدین القاسمی۔
- تفسیر الدرالمنثور 718/5- امام سیوطی۔

- تنویر المقباس' تفسیر ابن عباس برحاشیہ الدرالمنثور - 124/5
- فتح القدیر' 630/4 امام شوکانی-
- معالم التنزیل ' 391/7 الشیخ ابومحمد البغوی' صاحب المصابیح برحاشیہ ابن کثیر-
- لباب التاویل فی معانی التنزیل' المعروف تفسیر الخازن ' 108/4-
- تفسیر مدارک التنزیل للنسفی' برحاشیہ تفسیر الخازن المذکور-
- تفسیر الجواہر' الشیخ الطنطاوی' الجزء العشرون' ص 165-

ایک تفسیری اختلاف اور اس کی حقیقت: اب تک اَوَمَنْ یُّنَشَّؤُ فِی الْحِلْیَةِ کی تفسیر یہ بیان کی گئی ہے کہ اس سے مراد لڑکیاں (عورتیں) ہیں اور ان کی صفات یہ بیان کی گئی ہیں کہ وہ زیورات کی دلدادہ اور اظہار مافی الضمیر (بحث و تکرار کے موقع) پر غیر قادر ہیں' لیکن ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد بت ہیں' جس کا مطلب یہ ہو گا کہ یہ دونوں صفات گویا پتھر کی مورتیوں کی ہیں' لیکن قرآن کریم کے سیاق سے اس قول کی تائید نہیں ہوتی۔ بلاشبہ بعض پجاری سونا چاندی کا نذرانہ بھی اپنے بتوں کے لیے پیش کرتے ہیں لیکن وہ بالعموم پتھر کی مورتیوں کو بطور زیور نہیں پہنایا جاتا ہے' بلکہ وہ مہنتوں اور پنڈتوں کے ہتھے چڑھتا ہے اور وہ اس آمدنی سے گلچھرے اڑاتے ہیں۔ اسی طرح اگر قرآن دوسری صفت یہ بیان کرتا کہ وہ جھگڑا کرنے پر قادر نہیں' تب تو یہ دوسری صفت ان پتھر کی مورتیوں پر صادق آسکتی تھی' لیکن قرآن نے یہ نہیں کہا کہ وہ جھگڑا کرنے پر قادر نہیں' بلکہ یہ کہا ہے کہ جھگڑے کے وقت وہ اظہار بیان پر قادر نہیں۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مورتیاں اس سے مراد نہیں' بلکہ طبقۂ اناث ہی مراد ہے اور اسی کی یہ دونوں صفتیں بیان کی گئی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر مفسرین نے اس دوسرے قول کا ذکر سرے سے کیا ہی نہیں ہے۔ جیسا کہ اردو تفاسیر میں کسی میں بھی یہ دوسرا قول منقول نہیں ہے۔ صرف چند عربی تفاسیر میں یہ قول نقل کیا گیا ہے' جیسے تفسیر روح المعانی' تفسیر طبری' تفسیر البحر المحیط' تفسیر مواہب

الرحمٰن (اردو) تفسیر فتح البیان اور تفسیر فتح القدیر۔ لیکن اوّل الذکر چاروں مفسرین نے اس کی تردید کی ہے کہ قرآن مجید کا سیاق کلام اس کی تائید نہیں کرتا اور انہوں نے قولِ اول ہی کو ترجیح دی ہے اور آخرالذکر دونوں مفسرین نے بھی تفسیر تو جمہور مفسرین کی رائے کے مطابق ہی کی ہے' لیکن بعد میں بطور اختلاف کے دوسرا قول بھی نقل کر دیا ہے۔ جس سے واضح ہے کہ ان کے نزدیک بھی قول وہی راجح اور صحیح ہے جس کے مطابق انہوں نے تفسیر کی ہے۔ اس اعتبار سے اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُ سے لڑکیاں مراد لینے میں تقریباً تمام مفسرین امت کا اتفاق ہے ایک اختلافی اور مرجوح قول کے ذکر کر دینے سے اس اتفاق پر کوئی اثر نہیں پڑتا' کیونکہ اس کی تائید کسی مفسر نے نہیں کی ہے۔

ضعف حافظہ' نسیان اور ذُہول: جہاں تک عورت کی دماغی و ذہنی صلاحیتوں کی کمزوری کا (بہ مقابلہ رجال) تعلق ہے' جس کی وجہ سے ضعف حافظہ' نسیان اور ذہول کا وہ زیادہ شکار ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت بھی اگرچہ مذکورہ اقتباسات سے ہو جاتی ہے' تاہم مفسرین نے عورت کی نصف شہادت کی حکمت اور علت پر بحث کرتے ہوئے بھی اس نکتے کی وضاحت کی ہے۔ چنانچہ علامہ رشید رضا مصری لکھتے ہیں:

«وَالسَّبَبُ الصَّحِيحُ أَنَّ الْمَرْأَةَ لَيْسَ مِنْ شَأْنِهَا الاشْتِغَالُ بِالْمُعَامَلَاتِ الْمَالِيَّةِ وَنَحْوِهَا مِنَ الْمُعَاوَضَاتِ، فَلِذٰلِكَ تَكُونُ ذَاكِرَتُهَا فِيهَا ضَعِيفَةً وَلَا تَكُونُ كَذٰلِكَ فِي الْأُمُورِ الْمَنْزِلِيَّةِ الَّتِي هِيَ شُغْلُهَا فَإِنَّهَا فِيهَا أَقْوٰى ذَاكِرَةً مِنَ الرَّجُلِ يَعْنِي أَنَّ مِنْ طَبْعِ الْبَشَرِ ذُكْرَانًا وَإِنَاثًا أَنْ يَّقْوٰى تَذَكُّرُهُمْ لِلْأُمُورِ الَّتِي تُهِمُّهُمْ وَيَكْثُرُ اشْتِغَالُهُمْ بِهَا وَلَا يُنَافِي ذٰلِكَ اشْتِغَالَ بَعْضِ نِسَاءِ الْأَجَانِبِ فِي هٰذَا الْعَصْرِ بِالْأَعْمَالِ الْمَالِيَّةِ فَإِنَّهُ قَلِيلٌ لَا يُعَوَّلُ عَلَيْهِ، وَالْأَحْكَامُ الْعَامَّةُ إِنَّمَا تُنَاطُ بِالْأَكْثَرِ فِي الْأَشْيَاءِ وَبِالْأَصْلِ فِيهَا»(تفسير المنار: ۳/ ۱۲۴-۱۲۵)

بالکل اسی انداز کی بات صاحب المراغی نے کی ہے۔ فرماتے ہیں:

«وَهٰذِهِ الْعِبَارَةُ لِبَيَانِ سِرِّ تَشْرِيعِ الْحُكْمِ فِي اشْتِرَاطِ الْعَدَدِ فِي النِّسَاءِ إِذْقَدْ جَرَتِ الْعَادَةُ أَنْ لَا تَشْتَغِلَ بِالْمُعَامَلَاتِ الْمَالِيَّةِ وَنَحْوِهَا مِنَ الْمُعَاوَضَاتِ، فَتَكُونُ ذَاكِرَاتُهَا ضَعِيفَةٌ فِيهَا، بِخِلَافِ الْأُمُورِ الْمَنْزِلِيَّةِ فَإِنَّ ذَاكِرَتَهَا فِيهَا أَقْوٰى مِنْ ذَاكِرَةِ الرَّجُلِ فَقَدْ جُبِلَ الْإِنْسَانُ عَلٰى أَنْ يَقْوٰى تَذَكُّرُهُ لِمَا يَهْتَمُّ بِهِ وَيَعْنِي بِشَأْنِهِ، وَاشْتِغَالُ النِّسَاءِ فِي هٰذَا الْعَصْرِ بِالْمَسَائِلِ الْمَالِيَّةِ لَا يُغَيِّرُ هٰذَا الْحُكْمَ، لِأَنَّ الْأَحْكَامَ إِنَّمَا تَكُونُ لِلْأَعَمِّ الْأَكْثَرِ، وَعَدَدُ هٰؤُلَاءِ قَلِيلٌ فِي كُلِّ أُمَّةٍ وَجِيلٍ»(تفسير المراغي، تفسير سورة البقرة آیت: ۲۸۲، ۱/ ٤٣٤)

یعنی "اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰی" یہ عورتوں کی بابت اس حکم کی مشروعیت کی علت ہے جس میں ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ عادۃً عورت کا اشتغال مالیات اور اس قسم کے دیگر معاوضات سے نہیں ہوتا' اس لیے ایسے معاملات میں اس کی یادداشت کمزور ہوتی ہے' بخلاف گھریلو امور کے کہ ان میں عورت کی یادداشت مرد سے زیادہ قوی ہوتی ہے' کیونکہ انسان کی جبلت میں یہ ہے کہ جس چیز کا فکر اور اہتمام اس کے ذمے ہو' اس میں اس کی یادداشت زیادہ ہوتی ہے۔ اس زمانے میں بہت سی عورتوں کا مالیات میں اشتغال' اس حکم کی تبدیلی کا باعث نہیں ہو سکتا' اس لیے کہ احکام کی بنیاد اکثریت پر ہوتی ہے اور ایسی عورتوں کی تعداد ہر امت اور ہر نسل میں بہت قلیل ہوتی ہے۔"

امام رازی لکھتے ہیں:

﴿اَنْ تَضِلَّ﴾ وَالْمَعْنٰى أَنَّ النِّسْيَانَ غَالِبٌ (عَلٰى) طِبَاعِ النِّسَاءِ لِكَثْرَةِ الْبَرْدِ وَالرُّطُوبَةِ فِي أَمْزِجَتِهِنَّ وَاجْتِمَاعُ الْمَرْأَتَيْنِ عَلَى النِّسْيَانِ أَبْعَدُ فِي الْعَقْلِ مِنْ صُدُورِ النِّسْيَانِ عَلَى الْمَرْأَةِ الْوَاحِدَةِ فَأُقِيمَتِ

الْمَرْأَتَانِ مَقَامَ الرَّجُلِ الْوَاحِدِ حَتَّى أَنَّ إِحْدَاهُمَا لَوْ نَسِيَتْ ذَكَّرَتْهَا الْأُخْرٰى فَهٰذَا هُوَ الْمَقْصُودُ مِنَ الْآيَةِ»(تفسير الكبير: ۷/ ۱۱۳)

"مطلب یہ ہے کہ نسیان عورتوں کی طبیعتوں پر غالب ہے' ان کے مزاج میں ٹھنڈک اور رطوبت کی کثرت کی وجہ سے' اور دو عورتوں کا نسیان پر جمع ہونا عقلاً ایک عورت سے نسیان کے صدور سے زیادہ بعید ہے۔ اس لیے دو عورتوں کو ایک مرد کے قائم مقام کیا گیا ہے تاکہ ایک عورت اگر بھول جائے' تو دوسری اسے یاد کرا دے۔ آیت کا مقصود یہی ہے۔"

علامہ ابو حیان اندلسی کی عبارت بھی تقریباً یہی ہے۔ (البحر المحیط' 350/2)

نواب صدیق حسن خان اور امام شوکانی رحمہما اللہ لکھتے ہیں:

«قَالَ أَبُو عُبَيْدٍ مَعْنٰى تَضِلَّ تَنْسٰى أَيْ لِنَقْصِ عَقْلِهِنَّ وَضَبْطِهِنَّ، وَهٰذِهِ الْآيَةُ تَعْلِيلٌ لِاعْتِبَارِ الْعَدَدِ فِي النِّسَاءِ ... وَإِنَّمَا اعْتُبِرَ فِيهِمَا هٰذَا التَّذْكِيرُ لِمَا يَلْحَقُهُمَا مِنْ ضُعْفِ النِّسَاءِ بِخِلَافِ الرِّجَالِ» (فتح البيان: ۱/ ۳۴۳-۳۴۴ وفتح القدير للشوكاني: ۱/ ۲۷۲)

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

﴿أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرٰى﴾ بَيَانٌ لِحِكْمَةِ مَشْرُوعِيَّةِ الْحُكْمِ وَاشْتِرَاطِ الْعَدَدِ فِي النِّسَاءِ أَيْ شُرِعَ ذٰلِكَ إِرَادَةَ أَنْ تُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرٰى إِنْ ضَلَّتْ إِحْدَاهُمَا، لِمَا أَنَّ النِّسْيَانَ غَالِبٌ عَلٰى طَبْعِ النِّسَاءِ لِكَثْرَةِ الرُّطُوبَةِ فِي أَمْزِجَتِهِنَّ»(روح المعاني، سورة البقرة: ۲۸۲، ۳/ ۹۵)

"اس میں بھی مشروعیت حکم اور ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کے اشتراط کی حکمت یہی بیان کی گئی ہے کہ چونکہ عورتوں کے مزاج میں کثرت رطوبت کی وجہ سے عورتوں کی طبیعتوں پر نسیان کا غلبہ رہتا ہے' اس لیے یہ مشروع کر دیا گیا کہ ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتیں ہوں' تاکہ ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد

کرا دے۔"

علامہ جمال الدین قاسمی لکھتے ہیں:

«وَلَمَّا شُرِطَ فِي الْقِيَامِ مَقَامَ الْوَاحِدِ مِنَ الرِّجَالِ، الْعَدَدَ مِنَ النِّسَاءِ عَلَّلَهُ بِمَا يُشِيرُ إِلَى نَقْصِ الضَّبْطِ فِيهِنَّ فَقَالَ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا»

(تفسير القاسمي پاره: ٣، ص: ٣٨٢)

"جب ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کی گواہی کو ضروری قرار دے دیا' تو پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی علت یہ بیان فرمائی کہ ان عورتوں میں ضبط کی کمی ہے۔ (اور عورت کے بھولنے کا امکان ہے) اس لیے فرمایا کہ اگر ایک بھول جائے' تو دوسری یاد کرا دے۔"

ملا جیون لکھتے ہیں:

«إِنَّمَا جُعِلَتِ الْمَرْأَتَانِ مَقَامَ رَجُلٍ وَاحِدٍ وَلَمْ يَكْتَفِ بِوَاحِدَةٍ مِنْهُمَا لأَجَلِ أَنْ نَسِيَتْ إِحْدَاهُمَا الشَّهَادَةَ فَتُذَكِّرَ صَاحِبَتُهَا الأُخْرٰى لأَنَّ النِّسْيَانَ فِي الْمَرْأَةِ غَالِبٌ»(التفسيرات الاحمدية، ص: ١٨٠)

"دو عورتوں کو ایک مرد کے قائم مقام اس لیے کیا گیا ہے اور ایک عورت پر کفایت نہیں کی' کہ اگر ایک شہادت بھول جائے' تو دوسری اس کو یاد کرا دیا کرے' کیونکہ نسیان عورت پر غالب ہے۔"

<u>گواہی میں عورت پر مرد کی فطری برتری</u>: ان حوالہ جات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ بیرونی معاملات میں عدم اشتغال کی وجہ سے بیرون خانہ کی ذمے داریوں سے بوجوہ مذکورہ عورت مرد کی طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ اس لیے شہادت کا مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ایک ہے جن میں شریعت اسلامیہ نے مرد و عورت کے درمیان (ان کے دائرہ عمل کے اختلاف اور فطری صلاحیتوں کے تفاوت کی وجہ سے) فرق کیا ہے اور اس معاملے میں بھی مرد کو عورت پر ایک گونہ فضیلت حاصل ہے۔ کیونکہ ایسے گواہ کے مقابلے میں جس میں عقل و ضبط کی کمی ہو' کامل العقل اور کامل الضبط گواہ کو ترجیح دینا' ایک فطری

امر ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ حدیث ((الیس شہادۃ المرأۃ مثل نصف شہادۃ الرجل)) (صحیح البخاری' الشہادات' باب شہادۃ النساء --- حدیث: ۲۶۵۸) کے ذیل میں امام مہلب کا قول نقل کرتے ہیں:

«يُسْتَنْبَطُ مِنْهُ التَّفَاضُلُ بَيْنَ الشُّهُودِ بِقَدَرِ عَقْلِهِمْ وَضَبْطِهِمْ، فَتُقَدَّمَ شَهَادَةُ الْفَطِنِ الْيَقِظِ عَلَى الصَّالِحِ الْبَلِيدِ»(فتحُ الباري، الشهادات، باب شهادة النساء: ۵/۳۲۹)

قاضی ابوبکر ابن العربی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے چھ باتوں میں مرد کو عورت پر فضیلت دی ہے' ان میں سے ایک یہ ہے کہ نقصان عقل کی وجہ سے عورت کی گواہی کو مرد کی گواہی سے نصف قرار دیا گیا ہے۔" (احکام القرآن ۱/ ۲۵۳)

اور امام رازی اور امام ابو حیان اُندلسی رحمہما اللہ بھی لکھتے ہیں کہ مسئلہ شہادت میں مرد کو عورت پر فضیلت حاصل ہے۔ (فيه دلالة على تفضيل الرجل على المرأة) (تفسیر الکبیر' ۷/ ۱۲۲- تفسیر البحر المحیط' ۲/ ۳۵۰)

اور حافظ ابن قیم رحمہ اللہ اس نکتے کی وضاحت اس طرح فرماتے ہیں:

«وَهُوَ سُبْحَانَهُ أَمَرَ بِإِشْهَادِ امْرَأَتَيْنِ لِتَوْكِيدِ الْحِفْظِ، لأَنَّ عَقْلَ الْمَرْأَتَيْنِ وَحِفْظَهُمَا يَقُومُ مَقَامَ عَقْلِ رَجُلٍ وَحِفْظِهِ، وَلِهٰذَا جُعِلَتْ عَلَى النِّصْفِ مِنَ الرَّجُلِ فِي الْمِيرَاثِ وَالدِّيَةِ وَالْعَقِيقَةِ وَالْعِتْقِ، فَعِتْقُ امْرَأَتَيْنِ يَقُومُ مَقَامَ عِتْقِ رَجُلٍ، كَمَا صَحَّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ» (اعلامُ الموقعين: ۱/ ۱۰۲ به تحقيق عبدالرحمن الوكيل، والطرق الحكمية، ص: ۱۳۱)

"اللہ تعالیٰ نے ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کی گواہی کا حکم اس لیے دیا ہے' تاکہ عورت کی یادداشت میں کوتاہی کا ازالہ ہو جائے کیونکہ دو عورتوں کی عقل اور ان کی یادداشت ایک مرد کی عقل اور اس کی یادداشت کے برابر ہوتی ہے۔ اس لیے عورت کا مرد کے مقابلے میں میراث' دیت (قتل خطا کی صورت میں) اور عقیقے میں

آدھا حصہ ہے اور عتق میں بھی نصف حصہ ہے یعنی ایک مرد کا آزاد کرنا (اجر و ثواب میں) دو عورتوں کی آزادی کے برابر ہے' جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے۔"

اس کی مزید کچھ تفصیل آگے آئے گی۔

ان حقائق کے ساتھ یہ حقیقت بھی محتاج بیان نہیں کہ اسلام نے اس امر پر بڑا زور دیا ہے کہ عورت گھر کی چار دیواری کے اندر صرف وہ گھریلو امور سرانجام دے جس کے لیے خالق کائنات نے اس کو پیدا کیا ہے اور معاشی جدوجہد اور دیگر بیرونی سرگرمیوں سے دامن کش رہے اور اگر کسی وقت گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت پیش آئے' تو پردے کا اہتمام کر کے نکلے۔ شریعت اسلامیہ نے عورت کی عفت و عصمت کی حفاظت کو اتنی اہمیت دی ہے کہ بغیر محرم کے سفر کرنے سے بھی اسے روک دیا ہے' تاکہ عورت کی عزت خطرے میں نہ پڑے۔ حتیٰ کہ بعض موقعوں پر اپنی بیوی کی حفاظت کو جہاد فی سبیل اللہ سے بھی زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ نبی ﷺ نے جب یہ مسئلہ بیان فرمایا کہ کوئی عورت ذی محرم کے بغیر سفر نہ کرے' اسی طرح کوئی شخص کسی عورت کے پاس اس کے ذی محرم کی غیر موجودگی میں نہ جائے' تو ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! میں تو فلاں فلاں لشکر کے ساتھ (جہاد کے لیے) جانا چاہتا ہوں' میرا نام بھی درج کیا جا چکا ہے جبکہ میری بیوی حج کے لیے پابہ رکاب ہے۔ میں کیا کروں؟ آپ نے فرمایا ((فَحُجَّ مع امرأتک)) "تم اپنی بیوی کے ساتھ جا کر حج کرو۔" (صحیح بخاری' کتاب جزاء الصید' باب حج النساء' حدیث : ۱۸۶۲ و کتاب الجھاد' باب کتابة الامام الناس' حدیث : ۳۰۶۱)

مردوں سے مخفی رہنے والے معاملات میں تنہا عورت کی گواہی قبول ہے : ان تفصیلات سے واضح ہے کہ اسلام عورت کے گھر سے زیادہ خروج کو پسند نہیں کرتا۔ اس لیے عدالتی شہادتوں کے کھکھیڑ میں بھی اسے الجھانا اس کی ہدایات و تعلیمات سے میل نہیں کھاتا۔ بنابریں اسلام میں عورت کی شہادت کو صرف ضرورۃً ہی تسلیم کیا گیا ہے' یعنی جہاں اس کی شہادت ناگزیر ہو' وہاں اس کی شہادت قبول کی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے معاملات میں جن پر صرف عورتیں ہی مطلع ہو سکتی ہیں' عورتوں کی گواہی بالاتفاق مقبول

ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

«وَاتَّفَقُوا عَلٰى قُبُولِ شَهَادَتِهِنَّ مُفْرَدَاتٍ فِيمَا لاَ يَطَّلِعُ عَلَيْهِ الرِّجَالُ، كَالحَيْضِ وَالْوِلاَدَةِ وَالاسْتِهْلاَلِ وَعُيُوبِ النِّسَاءِ»(فتح الباري، الشهادات، بابُ شهادة النساء: ٥/ ٣٢٨)

''ایسے معاملات میں جن پر مرد مطلع نہیں ہو پاتے' تنہا عورتوں کی گواہی کے قبول کرنے پر سب کا اتفاق ہے جس طرح حیض' ولادت' استہلال اور عورتوں کے عیوب ہیں۔''

جن ائمہ و فقہاء و مفسرین نے اس اصول کا ذکر کیا ہے' وہ حسب ذیل ہیں' اختصار کے پیش نظر ان کی اصل عبارتیں نقل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ہے' ویسے بھی یہ اتفاقی مسئلہ ہے' اسلئے بھی اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ بنابریں حوالوں پر کفایت کی جاتی ہے۔

- المغني مع الشرح الكبير - ابن قدامه مقدسی (فقه حنبلی) ج : 10 ' ص : 189 ' طبع قديم۔
- الهداية مع فتح القدير - ج : 7 ' ص : 372 ' طبع مصر (فقه حنفی)
- بدائع الصنائع ' كاسانی - ج : 6 ' ص : 277 ' (فقه حنفی)
- المهذب - ج : 2 ' ص : 333 ' (فقه شافعی)
- المدونة الكبرىٰ - ج : 4 ' ص : 81 ' (فقه مالكی)
- بداية المجتهد - ج : 2 ' ص : 465 ' (فقه مالكی)
- فقه الامام سعيد بن المسيب - ج : 4 ' ص : 193۔
- تفسير غرائب القرآن ورَغائب الفرقان - ج : 3 ' ص : 91۔
- تفسير الجامع لاحكام القرآن - للقرطبی ' ج : 3 ' ص : 391۔
- تفسير الدرالمنثور - للسيوطی ' ج : 1 ' ص : 371۔
- تفسير فتح القدير - للشوكانی ' ج : 1 ' ص : 272۔
- تفسير روح المعانی - علامه آلوسی ' ج : 3 ' ص : 58۔

- تفسیر المظھری' قاضی ثناء اللّٰہ پانی پتی - ج:1' ص:426' (عربی)
- تفسیر البحر المحیط - لابی حیان' ج:2' ص:347-
- التفسیرات الاحمدیہ - ص:179 - ملاجیون
- المحلّٰی لابن حزم - ج:10' مسئلہ:1790 - کتاب الشھادات
- الطرق الحکمیة فی السیاسة الشرعیة - لابن القیم - ص:134 - 138-
- اعلام الموقعین عن رب العالمین لابن القیم - ج:1' ص:104' بہ تحقیق عبدالرحمٰن الوکیل-
- کنز الایمان - ترجمہ مولانا احمد رضا بریلوی - حاشیہ مولانا نعیم الدین مراد آبادی - ص:77-

صرف عورتوں کی موجودگی میں پیش آنے والے واقعات میں عورت کی گواہی بھی قبول ہے: ان تمام کتابوں میں یہ اصول متفقہ طور پر بیان کیا گیا ہے کہ ان مخصوص نسوانی مسائل کے فیصلے کے لیے' جن کا علم مردوں کو نہیں ہوتا' تنہا عورتوں کی گواہی کافی ہے اور اس کی علت یہ ہے کہ ایسے مسائل میں اگر عورتوں کی شہادت کو قبول نہیں کیا جائے گا' تو بہت سے حقوق ضائع ہو جائیں گے۔

اسی اصول اور علت کی بنیاد پر شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم رحمہما اللہ نے لکھا ہے کہ اسی کے ذیل میں وہ واقعات و معاملات بھی آ جاتے ہیں کہ جن پر مردوں کو اطلاع نہ ہو سکے' صرف عورتوں کے علم میں آئے ہوں' کیونکہ اس واقعے اور حادثے کے وقت کوئی مرد موجود نہ تھا' یعنی ایک مسائل کی قسم وہ ہے جو لَا يَطَّلِعُ عَلَيْهِ الرِّجَالُ یا لَا يَطَّلِعُ عَلَيْهِ غَيْرُهُنَّ سے تعبیر کیے گئے ہیں' یعنی ایسے نسوانی مسائل کہ جن پر بالعموم مرد آگاہ ہی نہیں ہوتے اور دوسری قسم معاملات کی وہ ہے کہ جسے لم یطلع علیه الرجال یا لم یطلع علیه غیر ھن سے تعبیر کیا جا سکتا ہے' یعنی ایسے واقعات و حادثات' جو صرف عورتوں کے سامنے ہوئے ہوں' وہاں مرد کوئی نہ ہو اس لیے عورتوں کے سوا گواہ ہی کوئی نہ ہو۔ مثلاً شادی بیاہ کے مواقعے پر ایسی جگہ جہاں صرف عورتیں ہی عورتیں ہوں۔ زنانہ کالج' جہاں عورتیں ہی

عورتیں ہوں۔ لیڈیز کلب یا خواتین کا کوئی بھی اجتماع' جہاں مرد نہ ہوں۔ وہاں کوئی واقعہ پیش آ جائے' کوئی حادثہ ہو جائے تو یہاں بھی تنہا عورتوں کی گواہی فیصلے کے لیے کافی ہو گی' کیونکہ اس مقام پر عورت کی واقعاتی شہادت کو نظرانداز کرنے سے بہت سے حقوق ضائع ہو جائیں گے۔

یہ اسی نظریۂ ضرورت کے تحت ہے کہ بعض موقعوں پر ایسے افراد کی گواہی بھی قبول کر لی جاتی ہے' عام معاملات میں جن کی گواہی نامقبول ہے۔ جیسے ذمی اور غیر مسلم کی گواہی نامقبول ہے' لیکن اگر دوران سفر کسی مسلمان کو (کسی حادثے یا شدید بیماری کی وجہ سے) اپنی موت کا یقین ہو جائے اور وہاں اس وقت ذمیوں کے علاوہ ایسے مسلمان افراد نہ مل سکیں جن کے سامنے وہ وصیت کر دے تو ایسے موقعے پر بالاتفاق' قرآن و حدیث کے نصوص کی رُو سے ذمی غیر مسلموں کی گواہی مع الحلف جائز ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

«وَهٰذَا مَبْنِيٌّ عَلٰى اَصْلٍ، وَهُوَ أَنَّ الشَّهَادَةَ عِنْدَ الْحَاجَّةِ، يَجُوزُ فِيهَا مِثْلُ شَهَادَةِ النِّسَاءِ فِيمَا لاَ يَطَّلِعُ عَلَيْهِ الرِّجَالُ»(مختصر الفتاوى المصرية، ص: ٦٠٤)

"غیر مسلم کی یہ گواہی نظریۂ ضرورت کی اصل پر مبنی ہے جس کے تحت عورتوں کی گواہی کو ایسے معاملات میں جائز کیا گیا ہے جس پر مرد مطلع نہیں ہو سکتے۔"

اس نظریۂ ضرورت کا ذکر' جس کے تحت عورت کی گواہی قابل قبول ہے' امام مالک نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ المدونۃ الکبریٰ میں ہے۔

«قَالَ مَالِكٌ : لاَ يَجُوزُ إِلاَّ حَيْثُ ذَكَرَهَا اللهُ فِي الدَّيْنِ أَوْ مَا لاَ يَطَّلِعُ عَلَيْهِ أَحَدٌ إِلاَّ هُنَّ لِلضَّرُورَةِ إِلَى ذٰلِكَ»(٤/ ٨٤)

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ "عورت کی گواہی صرف دَین (ادھار) کے معاملے میں جائز ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یا پھر ایسے معاملات میں ان کی گواہی جائز ہے۔ جن پر عورتوں کے سوا کوئی اور مطلع نہ ہو سکے کیونکہ ضرورت اس کی متقاضی ہے۔" امام شوکانی نے بھی کہا ہے: الا فیما لا یطلع علیہ غیرھن للضرورۃ۔ (فتح القدیر: ۱/۳۸۲)

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

«وَأَجَازَ الْعُلَمَاءُ شَهَادَتَهُنَّ مُنْفَرِدَاتٍ فِيمَا لاَ يَطَّلِعُ عَلَيْهِ غَيْرُهُنَّ لِلضَّرُورَةِ وَعَلٰى مِثْلِ ذٰلِكَ أُجِيزَتْ شَهَادَةُ الصِّبْيَانِ فِي الْجَرْحِ فِيمَا بَيْنَهُمْ»(پارہ: ۳، ص: ۳۹۱)

چونکہ عورت کی گواہی اسی نظریۂ ضرورت پر مبنی ہے' اس لیے امام مالک یہ بھی کہتے ہیں کہ دو مرد گواہوں کے مقابلے میں چار عورتیں ضروری نہیں ہیں۔ (جیسا کہ امام شافعی کی رائے ہے) بلکہ فیصلے کے لیے دو عورتوں کی گواہی بھی کافی ہے کیونکہ جب ضرورۃ مرد کی گواہی یہاں ساقط ہے' تو پھر وہی نصابِ شہادت کافی ہے جو مردوں کے لیے ہے۔ چنانچہ بدائع الصنائع میں امام کاسانی لکھتے ہیں:

«وَجْهُ قَوْلِ مَالِكٍ أَنَّ شَهَادَةَ الرِّجَالِ لَمَّا سَقَطَ اعْتِبَارُهَا فِي هٰذَا الْبَابِ لمكان الضَّرُورَةِ وَجَبَ الاكْتِفَاءُ بِعَدَدِهِمْ مِنَ النِّسَاءِ» (۶/ ۲۷۸)

بہرحال اسی نظریۂ ضرورت کے تحت دوسری قسم کے معاملات میں بھی عورت کی گواہی مقبول ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

«كَمَا تُقْبَلُ شَهَادَةُ النِّسَاءِ فِي الْحُدُودِ إِذَا اجْتَمَعْنَ فِي الْعُرْسِ وَالْحَمَّامِ، وَنَصَّ عَلَيْهِ أَحْمَدُ فِي رِوَايَةِ بَكْرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ أَبِيهِ وَنَقَلَ ابْنُ صَدَقَةَ فِي الرَّجُلِ يُوصِي بِأَشْيَاءَ لأَقَارِبِهِ وَيُعْتِقُ، وَلاَ يَحْضُرُهُ إِلاَّ النِّسَاءُ، هَلْ يَجُوزُ شَهَادَتُهُنَّ فِي الْحُقُوقِ وَالصَّحِيحُ قُبُولُ شَهَادَةِ النِّسَاءِ فِي الرَّجْعَةِ»(الاختيارات العلمية مع الفتاوى: ۴/ ۲۱۳ طبع، ۱۳۲۹ھ)

"یعنی کفار کی شہادت عندالضرورت اسی طرح جائز ہے' جس طرح حدود میں عورتوں کی شہادت مقبول ہے جب کہ وہ شادی یا حمام وغیرہ میں جمع ہوں (اور وہاں مرد کوئی نہ ہو) امام احمد سے بھی اس بارے میں صراحت منقول ہے اور ابن صدقہ

نے نقل کیا ہے کہ ایک آدمی اگر اپنے رشتے داروں کے لیے وصیت کرتا ہے اور غلام آزاد کرتا ہے، لیکن اس وقت (گواہ) عورتوں کے سوا اور کوئی نہ ہو، تو کیا حقوق میں عورتوں کی گواہی قبول ہوگی؟ اور صحیح بات یہ ہے کہ رجوع میں عورتوں کی شہادت قبول ہے۔"

یہاں عبارت میں کچھ ابہام ہے۔ اس کی وضاحت ابن قیم کی عبارت سے ہو جاتی ہے۔

«قَالَ: الإِمَامُ أَحْمَدُ فِي الرَّجُلِ: يُوصِي وَلاَ يَحْضُرُهُ إِلاَّ النِّسَاءُ، قَالَ: أُجِيزُ شَهَادَةَ النِّسَاءِ، فَظَاهِرُ هٰذَا أَنَّهُ أَثْبَتَ الْوَصِيَّةَ بِشَهَادَةِ النِّسَاءِ عَلَى الانْفِرَادِ إِذَا لَمْ يَحْضُرْهُ الرِّجَالُ، وَذَكَرَ الْخَلاَّلُ عَنْ أَحْمَدَ أَنَّهُ سُئِلَ عَنِ الرَّجُلِ يُوصِي بِأَشْيَاءَ لأَقَارِبِهِ وَيُعْتِقُ، وَلاَ يَحْضُرُهُ إِلاَّ النِّسَاءُ هَلْ يَجُوزُ شَهَادَتُهُنَّ، قَالَ: نَعَمْ، تَجُوزُ شَهَادَتُهُنَّ فِي الْحُقُوقِ»(الطرق الحكمية، ص: ١٤٢)

امام ابن قیم اس دوسری قسم کے معاملات میں عورت کی گواہی پر علماء کا اتفاق بتلاتے ہیں:

«وَقَدِ اتَّفَقَ الْعُلَمَآءُ عَلَى أَنَّ مَوَاضِعَ الْحَاجَاتِ يُقْبَلُ فِيهَا مِنَ الشَّهَادَاتِ مَا لاَ يُقْبَلُ فِي غَيْرِهَا مِنْ حَيْثُ الْجُمْلَةِ، وَإِنْ تَنَازَعُوا فِي بَعْضِ التَّفَاصِيلِ، وَقَدْ أَمَرَ اللهُ سُبْحَانَهُ بِالْعَمَلِ بِشَهَادَةِ شَاهِدَيْنِ مِنْ غَيْرِ الْمُسْلِمِينَ عِنْدَ الْحَاجَةِ فِي الْوَصِيَّةِ فِي السَّفَرِ، مُنَبِّهًا بِذٰلِكَ عَلَى نَظِيرِهِ وَمَا هُوَ أَوْلَى مِنْهُ كَقُبُولِ شَهَادَةِ النِّسَاءِ مُنْفَرِدَاتٍ فِي الأَعْرَاسِ وَالْحَمَّامَاتِ وَالْمَوَاضِعِ الَّتِي تَنْفَرِدُ النِّسَاءُ بِالْحُضُورِ فِيهَا، وَلاَ رَيْبَ أَنَّ قُبُولَ شَهَادَتِهِنَّ هُنَا أَوْلَى مِنْ قُبُولِ شَهَادَةِ الْكُفَّارِ عَلَى الْوَصِيَّةِ فِي السَّفَرِ، وَكَذٰلِكَ عَمَلُ الصَّحَابَةِ وَفُقَهَاءِ الْمَدِينَةِ بِشَهَادَةِ الصِّبْيَانِ عَلَى تَجَارُحِ بَعْضِهِمْ بَعْضًا، فَإِنَّ الرِّجَالَ لاَ يَحْضُرُونَ مَعَهُمْ فِي لَعِبِهِمْ، وَلَوْ لَمْ تُقْبَلْ شَهَادَتُهُمْ وَشَهَادَةُ النِّسَاءِ مُنْفَرِدَاتٍ لَضَاعَتِ الْحُقُوقُ وَتَعَطَّلَتْ وَأُهْمِلَتْ مَعَ

غَلَبَةِ الظَّنِّ أَوِ الْقَطْعِ بِصِدْقِهِمْ، وَلاَسِيَمَا إِذَا جَاءُوْا مُجْتَمِعِينَ قَبْلَ تَفَرُّقِهِمْ وَرُجُوعِهِمْ إِلَى بُيُوتِهِمْ وَتَوَاطَؤُوا عَلٰى خَبَرٍ وَاحِدٍ، وَفَرَّقُوا وَقْتَ الأَدَاءِ وَاتَّفَقَتْ كَلِمَتُهُمْ، فَإِنَّ الظَّنَّ الْحَاصِلَ حِينَئِذٍ مِنْ شَهَادَتِهِمْ أَقْوٰى بِكَثِيرٍ مِنَ الظَّنِّ الْحَاصِلِ مِنْ شَهَادَةِ رَجُلَيْنِ، وَهٰذَا مِمَّا لاَ يُمْكِنُ دَفْعُهُ وَجَحْدُهُ، فَلاَ نَظُنُّ بِالشَّرِيعَةِ الْكَامِلَةِ الْفَاضِلَةِ الْمُنْتَظِمَةِ لِمَصَالِحِ الْعُبَّادِ فِي الْمَعَاشِ وَالْمَعَادِ أَنَّهَا تُمْهِلُ مِثْلَ هٰذَا الْحَقِّ وَتُضَيِّعُهُ مَعَ ظُهُورِ أَدِلَّتِهِ وَقُوَّتِهَا، وَتَقْبَلُهُ مَعَ الدَّلِيْلِ الَّذِي هُوَ دُونَ ذٰلِكَ»(أعلام الموقعين: ۱/ ۱۰۲)

"علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ضرورت کے مواقع پر ایسی شہادات بھی قبول ہوں گی جو عام حالات میں ناقابل قبول ہوتی ہیں۔ اگرچہ ان کی بعض تفصیلات میں علماء کے مابین اختلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سفر میں وصیت کے موقعے پر ضرورت کے تحت دو غیر مسلم گواہوں کی گواہی پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔ جس سے مقصود اس قسم کے معاملات یا اس سے بھی اولیٰ قضایا میں تنبیہ کرنا ہے (یعنی نشاندہی کرنا ہے) جیسے تنہا عورتوں کی گواہی کا قبول کرنا ہے شادی کے مواقع' حمامات اور ایسی جگہوں میں جہاں صرف عورتیں ہی موقعے پر حاضر ہوں۔ بلاشبہ ایسے مواقع پر عورتوں کی گواہی کا قبول کرنا' دوران سفر وصیت میں کفار کی شہادت قبول کرنے کی نسبت زیادہ اولیٰ ہے۔

اسی طرح صحابہ کرام اور فقہائے مدینہ نے بچوں کی شہادت کے معاملے میں طرز عمل اختیار کیا ہے جب کہ ان بچوں کے مابین آپس میں کوئی حادثہ رونما ہو جائے (یعنی عندالضرورت یہاں بچوں کی گواہی بھی قبول ہو گی) اس لیے کہ مرد بچوں کے ساتھ ان کے کھیلوں میں شریک نہیں ہوتے۔ اگر ان بچوں کی اور تنہا عورتوں کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی تو بہت سے حقوق غلبۂ ظن یا گواہوں کی قطعی صداقت کے باوجود ضائع' معطل اور مہمل ہو جائیں گے۔ بالخصوص جب کہ

موقعے کے گواہ متفرق ہونے اور اپنے گھر میں جانے سے قبل مجتمع ہو کر گواہی دیں اور کسی ایک خبر پر متفق ہوں اور ادائیگی شہادت کے وقت کلمات میں فرق ہونے کے باوجود نفس موضوع پر اتفاق ہو' تو ایسی گواہی سے اس وقت جو ظن حاصل ہو گا۔ وہ اس ظن سے زیادہ قوی ہو گا جو دو آدمیوں کی گواہی سے حاصل ہوتا ہے۔

یہ ایسی بات ہے جس کا رد اور انکار ممکن نہیں۔ پس ہم نہیں سمجھ سکتے کہ جو شریعت کامل ہو اور دنیا و آخرت کے معاملے میں بندوں کے مصالح کو محیط و منتظم ہو' وہ اس قسم کے حق کو مہمل چھوڑ دے گی اور دلائل کے ظہور اور قوت کے باوجود اسے ضائع کر دے گی' جب کہ اس سے بھی کم تر دلیل کے ساتھ اس نے فیصلے کو قبول کیا ہے۔"

دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے نظائر: دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی بعض مثالیں ہمیں ملتی ہیں جن میں صحابہ نے تنہا عورتوں کی گواہی پر فیصلے کیے یہ مثالیں انہی حالات کی ہیں کہ جب مرد موقعے پر نہیں تھے' مثلاً: ایک شخص نے نشے میں اپنی عورت کو تین طلاقیں دے دیں' جس پر چار عورتوں نے گواہی دی۔ یہ معاملہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو' آپ نے عورتوں کی گواہی کو جائز قرار دیا اور طلاق کو نافذ کر کے میاں بیوی کے درمیان تفریق کرا دی۔

اسی طرح ایک عورت نے چند عورتوں کی موجودگی میں ایک بچے کو اپنے پیروں سے روند کر ہلاک کر دیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صرف چار عورتوں کی گواہی پر فیصلہ کیا اور دیت دلوائی۔

حضرت شریح سے بھی گھریلو سامان کے جھگڑے میں ایسا فیصلہ منقول ہے جو انہوں نے صرف چار عورتوں کی گواہی پر دیا۔ (ملاحظہ ہو: الطرق الحکمیۃ ص :۱۳۵۔ المحلی' کتاب الشہادات' ۱۰/۵۷۲-۵۷۳)

بہرحال جب عورتوں کی گواہی ان معاملات میں بالاتفاق جائز ہے جو تحت الثیاب ہوں جن پر عادۃً صرف عورتیں ہی مطلع ہو سکتی ہوں' جیسے ولادت' بکارت' استہلال' حیض اور حمل وغیرہ اور اس کی بنیاد اس نظریۂ ضرورت پر ہے کہ اگر یہاں عورتوں کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی تو بہت سے حقوق ضائع ہو جائیں گے۔ اسی طرح اس اصول کے تحت وہاں بھی

عورتوں کی گواہی قابل قبول ہونی چاہیے' جہاں وقوعہ کے وقت عورتوں کے سوا اور کوئی گواہ نہ ہو۔ عورت کی یہ واقعاتی شہادت بھی عقل وقیاس کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔

عورت کا نصاب شہادت: البتہ فقہاء کے مابین اس امر میں اختلاف ہے کہ جن نسوانی مسائل میں عورت کی شہادت قبول ہے' اس کا نصابِ شہادت کیا ہو؟ امام شافعی اور جمہور نے قرآن کے نصابِ شہادت کا اعتبار کرتے ہوئے چار عورتوں کو ضروری قرار دیا ہے اور امام مالک کے نزدیک دو عورتیں بھی کافی ہیں' جب کہ احناف کے نزدیک ایک عورت بھی کافی ہے۔ اگر ایک سے زیادہ (۲ یا ۳) ہوں' تو احوط ہے۔ اس کی تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہوں:

❁ الهداية مع فتح القدير ' 372/7 ❁ بدائع الصنائع ' 277/6' 278 ❁ المدونة الكبرى ' 79/4' 80 ❁ بداية المجتهد ' 465/2 ❁ ' تفسير غرائب القرآن ' پارہ 3' ص 91 ❁ المهذب ' 333/2' 334 ❁ الطرق الحكميه ' 137 ❁ المحلى' كتاب الشهادات ❁ اعلام الموقعين '102/1 ❁ فتح الباری ' 266/5۔

ایک ضروری وضاحت: یہ خیال رہے کہ عورت کا یہ نصاب شہادت صرف ان نسوانی مسائل کے ضمن میں فقہاء نے بیان کیا ہے جن پر مرد مطلع نہیں ہو پاتے۔ اس لیے یہ نصاب شہادت قسم اوّل کا ہے۔ قسم دوم میں' یعنی ایسے معاملات میں کہ جن میں موقعے کی گواہ صرف عورتیں ہی ہوں' وہاں ان کا نصابِ شہادت کیا ہو؟ مجھے اس سلسلے میں فقہی کتابوں میں کچھ نہیں ملا۔ اس لیے راقم کے خیال میں یہاں ابن حزم کا نقطۂ نظر اپنانا چاہیے کہ عورت کا نصاب مرد سے دگنا ہو۔ یعنی زنا کے کیس میں آٹھ عورتوں کی گواہی اور باقی کیسوں میں ۴ عورتیں ضروری ہوں' تاکہ نصوص قرآن و حدیث سے تصادم نہ ہو۔ بہرحال یہ مسئلہ اہل علم کے غور و فکر کے قابل ہے۔

اموال و دیون میں عورت کی گواہی: جہاں تک اموال و دیون کا تعلق ہے اسکی بابت چونکہ نص قرآنی ﴿ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَإِنْ لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَ امْرَاَتَانِ ﴾ (البقرة : ۲۸۲/۲) موجود ہے۔ اس لیے اس میں علماء کے مابین زیادہ اختلاف نہیں۔ سب کے نزدیک ان معاملات میں دو مرد گواہ ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں۔ امام ابن قیم لکھتے ہیں:

«وَقَدِ اتَّفَقَ الْمُسْلِمُونَ عَلٰى أَنَّهُ يُقْبَلُ فِي الْأَمْوَالِ رَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ، وَكَذٰلِكَ تَوَابِعُهَا مِنَ الْبَيْعِ، وَالْأَجَلِ فِيهِ، وَالْخِيَارِ فِيهِ، وَالرَّهْنِ، وَالْوَصِيَّةِ لِلْمُعَيَّنِ، وَهِبَتِهِ وَالْوَقْفِ عَلَيْهِ، وَضَمَانِ الْمَالِ، وَإِتْلَافِهِ، وَدَعْوٰى رِقِّ مَجْهُولِ النَّسَبِ، وَتَسْمِيَةِ الْمَهْرِ، وَتَسْمِيَةِ عِوَضِ الْخُلْعِ، يُقْبَلُ فِي ذٰلِكَ رَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ»(اعلام الموقعين: ١/ ٩٧)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

«أَمَّا اتِّفَاقُهُمْ عَلٰى جَوَازِ شَهَادَتِهِنَّ فِي الْأَمْوَالِ فَلِلْآيَةِ الْمَذْكُورَةِ ... وَأَمَّا اخْتِلَافُهُمْ فِي النِّكَاحِ وَنَحْوِهِ فَمَنْ أَلْحَقَهَا بِالْأَمْوَالِ فَذٰلِكَ لِمَا فِيهَا مِنَ الْمُهُورِ وَالنَّفَقَاتِ وَنَحْوِ ذٰلِكَ، وَمَنْ أَلْحَقَهَا بِالْحُدُودِ فَلِأَنَّهَا تَكُونُ اسْتِحْلَالًا لِلْفُرُوجِ وَتَحْرِيمَهَا بِهَا، قَالَ: وَهٰذَا هُوَ الْمُخْتَارُ، وَيُؤَيِّدُ ذٰلِكَ قَوْلُهُ تَعَالٰى ﴿وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِنْكُمْ﴾ ثُمَّ سَمَّاهَا حُدُودًا فَقَالَ ﴿تِلْكَ حُدُودُ اللهِ﴾ وَالنِّسَاءُ لَا يُقْبَلْنَ فِي الْحُدُودِ»(فتح الباري الشهادات: ٥/ ٣٢٨، ٣٢٩)

الشیخ اسماعیل حقی لکھتے ہیں:

«شَهَادَةُ النِّسَاءِ مَعَ الرِّجَالِ فِي الْأَمْوَالِ جَائِزَةٌ مَعَ الْإِجْمَاعِ دُونَ الْحُدُودِ وَالْقِصَاصِ»(تفسير روح البيان پاره: ٣، ص: ٤٤١)

مزید اس کے لیے دیکھیے: ❁ تفسیر غرائب القرآن - پارہ 3 ص 91 ❁ تفسیر الخازن' جلد اول - پارہ 3 ص 215 ❁ تفسیر القرطبی - پارہ 3 ص 391 ❁ احکام القرآن' للجصاص - پارہ 3 ص 598 اور دیگر تفاسیر و کتب فقہ- اس مسئلہ پر چونکہ اتفاق ہے' اس لیے اس پر زیادہ بحث کی ضرورت نہیں۔

ایک قابل غور نکتہ: تاہم ایک نکتہ ضرور قابل غور ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی اس وقت قابل قبول ہے جب کہ دو مرد گواہ میسر نہ ہوں' یا مطلقاً ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی گواہی کی اجازت ہے۔ جمہور مفسرین کی رائے میں تو یہ اجازت

مطلقاً ہے۔ یعنی گواہ بنانے والے کی رائے پر موقوف ہے کہ وہ دُیون و اموال میں دو مردوں کو گواہ بنا لے یا ایک مرد اور دو عورتوں کو۔ دونوں طرح جائز ہے۔ لیکن بعض لوگ ﴿ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ ﴾ کو ﴿ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوا رَجُلَيْنِ ﴾ کے معنی میں لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مالیات کے معاملے میں بھی ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی گواہی اس صورت میں جائز ہو گی جب دو مردوں کا بطور گواہ ملنا مشکل ہو۔ جس طرح پانی کے ہوتے ہوئے تیمم کی اجازت نہیں۔ اسی طرح مرد گواہ میسر ہونے کی صورت میں ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کو گواہ بنانا صحیح نہیں۔

ان میں سے کون سی رائے صحیح ہے؟ اس پر اہل علم غور کر سکتے ہیں' تاہم سیاق کلام سے دوسری رائے کی تائید ہوتی ہے اور دیگر مذکورہ مباحث سے بھی اس کی ایک گونہ ترجیح کا پہلو نکلتا ہے۔

فقہاء کے درمیان ایک اختلاف یہ بھی ہے کہ اموال کے علاوہ دیگر حقوق میں عورت کی گواہی قبول ہے یا نہیں' فقہاء احناف حدود و قصاص کے علاوہ دیگر تمام حقوق و معاملات میں ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی گواہی کو جائز مانتے ہیں' جب کہ دوسرے فقہاء اسے اموال و دیون تک محدود رکھتے ہیں۔ بہرحال یہ اختلاف اس وقت ہمارے دائرہ بحث سے باہر ہے۔

حدود و قصاص میں عورت کی گواہی: عورت کی گواہی کی تیسری قسم حدود و قصاص میں گواہی ہے یعنی اس میں عورت کی گواہی قبول ہے یا نہیں؟ فقہاء ان معاملات میں اس کی گواہی قبول کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ بعض متجد دین نے اس مسئلے کو بڑی شدت' بلکہ تحدی کے ساتھ اٹھایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فقہاء کی یہ رائے کہ حدود و قصاص میں عورت کی گواہی قبول نہیں' قرآن کے خلاف ہے' قرآن نے یہ تفریق نہیں کی۔ جب کہ تمام فقہاء کے درمیان اس امر پر اتفاق ہے کہ حدود و قصاص میں عورت کی گواہی نامقبول ہے۔ اس لیے سب سے پہلے اتفاق بین جمیع الفقہاء کے سلسلے میں اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

«وَاتَّفَقُوا عَلٰى أَنَّ شَهَادَةَ النِّسَاءِ غَيْرُ جَائِزَةٍ، وَلاَ مَقْبُولَةٍ فِي الْعُقُوبَاتِ ، وَالْحُدُودِ»(الخازن: ۱/ ۲۱۵)

«أَمَّا اتِّفَاقُهُمْ عَلَى مَنْعِهَا فِي الْحُدُودِ وَالْقِصَاصِ، فَلِقَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ﴾»(فتح الباري، الشهادات، باب شهادة النساء: ٥/ ٣٢٨، ٣٢٩)

«أَنَّ فِي الزِّنَا يَجِبُ شَهَادَةُ أَرْبَعَةٍ مِنَ الرِّجَالِ بِالاتِّفَاقِ، لِقَوْلِهِ تَعَالَى ﴿ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ﴾ وَفِي غَيْرِ الزِّنَا مِنَ الْحُدُودِ وَالْقِصَاصِ، تُقْبَلُ فِيهَا شَهَادَةُ رَجُلَيْنِ، فَحَسْبَ بِالاتِّفَاقِ»(التفسيرات الأحمدية: ١٧٩)

«وَاشْتِرَاطُ عَدَمِ تَيَسُّرِ رَجُلَيْنِ لِلاِسْتِشْهَادِ بِالْمَرْأَتَيْنِ مَعَ الرَّجُلِ يُشْعِرُكَوْنَهُمَا بَدَلاً مِنَ الرَّجُلِ، وَأَنَّ الأَصْلَ عَدَمُ الاِسْتِشْهَادِبِهِنَّ لِلشُّبْهَةِ الْبَدَلِيَّةِ، لاَ يَجُوزُ شَهَادَةُ النِّسَاءِ فِيمَا يَنْدَرِىءُ بِالشُّبُهَاتِ مِنَ الْحُدُودِ وَالْقِصَاصِ إِجْمَاعًا»(تفسير المظهري: ١/ ٤٢٢)

اسی طرح تمام فقہی کتابوں میں صراحت کی گئی ہے کہ زنا وغیرہ جیسے جرم کے ثبوت کے لیے مرد گواہ ضروری ہیں۔ دیکھیے: ❁ المغنی' 175/10 ❁ المدونۃ الکبری' 83/4' 84 ❁ بدایۃ المجتہد' 465/2 ❁ بدائع الصنائع' 277/6 ❁ التشریع الجنائی الاسلامی' 410/2 ❁ فقہ السنۃ' 355/2- المہذب' 332/2-

<u>فقہائے کرام کے استدلال کی بنیادیں</u>: ۱- اس طرح تمام فقہاء کے درمیان اس امر پر اتفاق ہے کہ حدود و قصاص میں عورت کی گواہی قبول نہیں اور ان سب کا استدلال اس بات پر ہے کہ قرآن کریم نے ان معاملات میں گواہوں کا ذکر جن الفاظ (صیغوں) میں کیا ہے۔ وہ سب مذکر کے صیغے ہیں' مثلاً: زنا اور قذف کے بارے میں حکم دیا کہ چار گواہ مرد ہوں۔ فرمایا:

﴿ وَٱلَّٰتِي يَأۡتِينَ ٱلۡفَٰحِشَةَ مِن نِّسَآئِكُمۡ فَٱسۡتَشۡهِدُواْ عَلَيۡهِنَّ أَرۡبَعَةً مِّنكُمۡ﴾ (النساء٤/ ١٥)

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً ﴾

(النور ٢٤/ ٤)

طلاق اور رجعت کے بارے میں دو عادل مرد گواہ بنانے کا حکم دیا' فرمایا:

﴿ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنكُمْ ﴾ (الطلاق ٦٥/ ٢)

ان کے علاوہ چند اور مقامات ہیں جہاں قرآن کریم میں گواہ بنانے کا ذکر ہے' مثلاً اموالِ یتامی کی واپسی کے سلسلے میں فرمایا:

﴿ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ ﴾ (النساء ٤/ ٦)

وصیت کے سلسلے میں فرمایا:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ إِنْ أَنتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَأَصَابَتْكُم مُّصِيبَةُ الْمَوْتِ تَحْبِسُونَهُمَا مِن بَعْدِ الصَّلَاةِ فَيُقْسِمَانِ بِاللَّهِ إِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِي بِهِ ثَمَنًا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللَّهِ إِنَّا إِذًا لَّمِنَ الْآثِمِينَ ﴿١٠٦﴾ ﴾ (المائدة ٥/ ١٠٦)

قرآن کریم نے ان تمام مقامات میں گواہوں کا ذکر مذکر کے صیغوں میں کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم عورت کو عدالتی شہادت کے چکر میں پھنسانا پسند نہیں کرتا۔ ورنہ وہ آیت مداینت کی طرح عورت کی گواہی کا ذکر بھی کر دیتا' کیونکہ عدالتی شہادت عورت کے مزاج' فطرت اور اس کے دائرۂ کار کے فرائض سے مناسبت نہیں رکھتی۔ اس کا تحمل صرف مرد ہی کر سکتے ہیں جن کے قوائے عملی و ذہنی بھی مضبوط تر ہیں اور وہ بیرونی معاملات کے ذمے دار بھی ہیں اور اموال و دیون میں ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی گواہی کی اجازت کی وجہ یہ ہے کہ معاشرے میں اس کی عام ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ جو عام پیش آنے والی چیز ہو' اس میں شریعت کی طرف سے سہولت کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ امام قرطبی لکھتے ہیں:

«فَجَعَلَ تَعَالَى شَهَادَةَ الْمَرْأَتَيْنِ مَعَ الرَّجُلِ جَائِزَةً مَعَ وُجُودِ الرَّجُلَيْنِ فِي هٰذِهِ الآيَةِ، وَلَمْ يَذْكُرْهَا فِي غَيْرِهَا، فَأُجِيزَتْ فِي الأَمْوَالِ خَاصَّةً فِي قَوْلِ الْجُمْهُورِ، بِشَرْطِ أَنْ يَكُونَ مَعَهُمَا رَجُلٌ وَإِنَّمَا كَانَ ذٰلِكَ فِي الأَمْوَالِ دُونَ غَيْرِهَا، لأَنَّ الأَمْوَالَ كَثَّرَ اللّٰهُ أَسْبَابَ تَوْثِيقِهَا لِكَثْرَةِ جِهَاتِ تَحْصِيلِهَا وَعُمُومِ الْبَلْوٰى بِهَا وَتَكَرُّرِهَا، فَجَعَلَ فِيهَا التَّوَثُّقَ تَارَةً بِالْكَتْبَةِ وَتَارَةً بِالإِشْهَادِ وَتَارَةً بِالرَّهْنِ وَتَارَةً بِالضَّمَانِ، وَأَدْخَلَ فِي جَمِيعِ ذٰلِكَ شَهَادَةَ النِّسَاءِ مَعَ الرِّجَالِ»(تفسیر آیت: ۲۸۲، ۳/ ۳۹۱)

"یعنی اللہ تعالیٰ نے اس آیت ﴿ اِنْ لَّمْ یَکُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ ﴾ میں دو عورتوں کی شہادت کو ایک مرد کے ساتھ جائز رکھا ہے۔ اس آیت کے علاوہ کہیں اور عورت کی گواہی کا اللہ نے ذکر نہیں کیا۔ اس لیے جمہور نے اموال میں عورت کی شہادت کو اس شرط کے ساتھ جائز رکھا ہے کہ اس کے ساتھ ایک مرد بھی ہو اور یہ جواز صرف اموال میں ہے' کسی اور میں نہیں' اس لیے کہ اموال میں عموم بلویٰ کی صورت پائی جاتی ہے اور بار بار اس کی ضرورت پیش آتی ہے' بنابریں شریعت نے اس کی توثیق کے اسباب بھی متعدد بیان کیے ہیں۔ کبھی یہ توثیق ضبط تحریر و کتابت کی صورت میں ہوتی ہے' کبھی گواہ بنا لینے کی صورت میں' کبھی گروی اور کبھی ضمانت کے ذریعے سے اور ان تمام صورتوں میں عورت کی شہادت کو مردوں کے ساتھ جائز رکھا ہے۔"

حدود و قصاص کے معاملات اسلامی معاشرے میں اتنی کثرت اور تکرار کے ساتھ پیش نہیں آتے کہ وہاں مردوں کی گواہی ناکافی ہو اور عورتوں کی دخل اندازی بھی اس میں ضروری ہو۔ اس لیے اسلوب قرآن اسی بات کا متقاضی ہے کہ حدود و قصاص میں عورت کو گواہی سے مستثنیٰ ہی رکھا جائے۔

۲۔ دوسرا استدلال فقہاء نے اس طرح کیا ہے کہ عربی زبان کے قواعد کی رو سے ایک

اور دو افراد کی تعداد کے لیے جو اسم عدد استعمال ہوتا ہے وہ معدود کی تذکیر و تانیث کے مطابق ہوتا ہے' مگر تین سے دس تک معدود افراد کے لیے جو عدد استعمال کیا جاتا ہے وہ مذکر معدود کے لیے مؤنث اور مؤنث معدود کے لیے مذکر ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں اَرْبَعَة شُهَدَآء کی ترکیب میں عدد (اربعۃ) مؤنث ہے جو معدود (شُهَدَآء) کی تذکیر پر دلالت کرتا ہے۔ اس طرح مونث عدد (اَرْبَعَة) کے ساتھ مذکر معدود (شُهَدَاء) نے مل کر اس آیت کو مردوں کے لیے خاص کر دیا ہے۔ چنانچہ امام ابن قدامہ مقدسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

(الشرط الثاني) أَنْ يَكُونُوا رِجَالاً كُلُّهُمْ وَلاَ تُقْبَلُ فِيهِ شَهَادَةُ النِّسَاءِ بِحَالٍ، وَلاَ نَعْلَمُ فِيهِ خِلاَفًا إِلاَّ شَيْئًا يُرْوٰى عَنْ عَطَاءٍ وَحَمَّادٍ أَنَّهُ يُقْبَلُ فِيهِ ثَلاَثَةُ رِجَالٍ وَامْرَأَتَانِ، وَهُوَ شُذُوذٌ لاَ يُعَوَّلُ عَلَيْهِ، لأَنَّ لَفْظَ الأَرْبَعَةِ اِسْمٌ لِعَدَدِ الْمَذْكُورِينَ وَيَقْتَضِي أَنْ يَكْتَفٰى فِيهِ بِأَرْبَعَةٍ، وَلاَ خِلاَفَ فِي أَنَّ الأَرْبَعَةَ إِذَا كَانَ بَعْضُهُمْ نِسَاءً لاَ يَكْتَفٰى بِهِمْ، وَإِنَّ أَقَلَّ مَا يُجْزِىءُ خَمْسَةٌ وَهٰذَا خِلاَفُ النَّصِّ، وَلأَنَّ فِي شَهَادَتِهِنَّ شُبْهَةٌ لِتَطَرُّقِ الضَّلاَلِ إِلَيْهِنَّ، قَالَ اللهُ تَعَالٰى ﴿أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الأُخْرٰى﴾ وَالْحُدُودُ تُدْرَأُ بِالشُّبُهَاتِ»(المغني والشرح الكبير: ١٠/ ١٧٠، ١٧١)

"دوسری شرط یہ ہے کہ چاروں گواہ مرد ہوں' اس میں عورت کی گواہی کسی حال میں قبول نہیں۔ اس میں سوائے حماد اور عطاء رحمہما اللہ کے کسی کا اختلاف نہیں۔ ان کے خیال میں تین مرد اور دو عورتیں بھی قبول ہیں' لیکن یہ شاذ مسلک ہے جو قابل اعتبار نہیں۔ اس لیے کہ "اربعۃ" کا لفظ عدد مذکورین کا اسم ہے جو اس بات کا مقتضی ہے کہ وہ چار ہی ہوں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ چار گواہوں میں اگر کوئی عورت بھی گواہ ہو گی (تو ایک مرد کے مقابلے میں دو ہونے کی وجہ سے) گواہوں کی تعداد چار سے متجاوز اور کم از کم بھی پانچ ہو جائے گی اور یہ چیز نص کے خلاف ہو گی۔ علاوہ ازیں عورت کی گواہی میں اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا کے پیش نظر

شبہ کے امکانات ہیں اور حدود شبہات سے ساقط ہو جاتے ہیں۔ اس لیے بھی حدود میں عورت کی گواہی قابل قبول نہیں۔" امام ابن ہمام لکھتے ہیں۔ (بسلسلہ شہودِ زنا)

«لأَنَّ النَّصَّ أَوْجَبَ أَرْبَعَةَ رِجَالٍ بِقَوْلِهِ تَعَالٰى ﴿أَرْبَعَةً مِّنْكُمْ﴾ فَقُبُولُ امْرَأَتَيْنِ مَعَ ثَلاثَةٍ مُخَالِفٌ لِمَا نَصَّ عَلَيْهِ مِنَ الْعَدَدِ وَالْمَعْدُودِ . . . »(فتح القدير: ۷/ ۳۷۰)

"یعنی زنا کے ثبوت کے لیے چار مرد گواہ ضروری ہیں' کیونکہ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ کی نص قرآنی نے مردوں کو متعین کر دیا ہے۔ اس لیے تین مردوں کے ساتھ دو عورتوں کی گواہی کو قبول کرنا یہ اس نص کے خلاف ہے جو قرآن میں عدد معدود کے بارے میں وارد ہے۔"

۳۔ تیسرا استدلال فقہاء نے یہ کیا ہے کہ چونکہ عورت عدالتی شہادت میں فطری طور پر کمزور ہے اس کی اس فطری کمزوری سے کیس میں شبہ پیدا ہو سکتا ہے اور نبی ﷺ نے تاکید کی ہے کہ حدود میں شبہات کا لحاظ کرو اور شبہ کی وجہ سے حد کا نفاذ معطل کر دو۔ اس لیے اگر حدود و قصاص میں عورت کی گواہی کو جائز رکھا جائے گا' تو ان خطرناک کیسوں میں شبہات پیدا ہونے کا زیادہ امکان رہے گا' جس کا فائدہ معاشرے کے ان خطرناک مجرموں کو ملے گا۔

ابن قدامہ مقدسی کی مذکورہ عبارت میں بھی یہ استدلال موجود ہے۔ ان کے علاوہ ملاحظہ ہو۔ صاحب ہدایہ زنا کی سزا پر بحث کرتے ہوئے کہ اس میں عورت کی گواہی قبول نہیں' لکھتے ہیں:

«وَلأَنَّ فِيهَا شُبْهَةَ الْبَدَلِيَّةِ لِقِيَامِهَا مَقَامَ شَهَادَةِ الرِّجَالِ فَلاَ تُقْبَلُ فِيمَا يَنْدَرِىءُ بِالشُّبُهَاتِ»(الهداية، كتاب الشهادات: ۳/ ۱۳۹۔

اسی طرح زنا کے علاوہ دیگر حدود کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

«وَمِنْهَا الشَّهَادَةُ بِبَقِيَّةِ الْحُدُودِ وَالْقِصَاصِ تُقْبَلُ فِيهَا شَهَادَةُ رَجُلَيْنِ لِقَوْلِهِ تَعَالٰى ﴿وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ﴾ وَلاَ تُقْبَلُ فِيهَا شَهَادَةُ النِّسَاءِ لِمَا ذَكَرْنَا»(حواله مذكور)

(امام کاسانی لکھتے ہیں):

«إِنَّ الْحُدُودَ وَالْقِصَاصَ مِمَّا تُدْرَأُ بِالشُّبُهَاتِ . . . وَلِهٰذَا لاَ تُقْبَلُ

فِيهَا شَهَادَةُ النِّسَاءِ لِتَمَكُّنِ الشُّبْهَةِ فِي شَهَادَتِهِنَّ بِسَبَبِ السَّهْوِ وَالْغَفْلَةِ»(بدائع الصنائع: ۲/ ۲۸۱)

”حدود و قصاص شبہات سے ساقط ہو جاتے ہیں..... یہی وجہ ہے کہ ان میں عورتوں کی شہادت قبول نہیں' کیونکہ سہو اور غفلت کی وجہ سے عورتوں کی شہادت میں شبہات راہ پالیتے ہیں۔“

اور حدود و قصاص کے علاوہ دیگر معاملات و حقوق شبہات کے ساتھ بھی ثابت ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ان میں ان کی گواہی سے زیادہ اندیشہ نہیں۔ ہدایہ میں ہے:

«وَهٰذِهِ الْحُقُوقُ تَثْبُتُ مَعَ الشُّبُهَاتِ»(الهداية مع فتح القدير: ۷/ ۳۷۱)

۴۔ چوتھا استدلال امام زہری کی مرسل روایت سے ہے:

«مَضَتِ السُّنَّةُ مِنْ لَّدُنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَالْخَلِيفَتَيْنِ مِنْ بَعْدِهِ أَنْ لاَّ شَهَادَةَ لِلنِّسَاءِ فِي الْحُدُودِ وَالْقِصَاصِ»(الهداية مع فتح القدير: ۷/ ۳۶۹)

المدونۃ الکبریٰ میں یہ روایت بایں الفاظ ہے۔

«مَضَتِ السُّنَّةُ مِنْ رَّسُولِ اللهِ ﷺ وَالْخَلِيفَتَيْنِ مِنْ بَعْدِهِ أَنَّهُ لاَ تَجُوزُ شَهَادَةُ النِّسَاءِ فِي النِّكَاحِ وَلاَ فِي الطَّلاَقِ وَلاَ فِي الْحُدُودِ»

(۴/ ۸۴)

ایک روایت میں یہ الفاظ اس طرح ہیں:

«قَالَ ابْنُ شِهَابٍ مَضَتِ السُّنَّةُ بِذٰلِكَ، بِأَنْ لاَّ تَجُوزَ شَهَادَةُ امْرَأَتَيْنِ مَعَ الرَّجُلِ فِي الْقَتْلِ وَالنِّكَاحِ وَالطَّلاَقِ وَالْحُدُودِ»(حوالہ مذکور)

”یعنی ابن شہاب زہری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد دونوں خلیفوں (ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) سے یہ سنت چلی آ رہی ہے کہ عورتوں کی گواہی (یا ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی گواہی) حدود و قصاص اور نکاح و طلاق میں جائز نہیں۔“

۵۔ بعض فقہاء نے ایک وجہ استدلال یہ بھی لکھی ہے کہ عورت کو شہادت سے مستثنیٰ رکھنے

کی وجہ یہ بھی ہے' تاکہ اس کا اصل دائرۂ کار -- گھریلو امور اور ذمے داریاں -- متأثر نہ ہوں اور گھر سے اس کو زیادہ نہ نکلنا پڑے۔ کیلا یکثر خروجھن (الهداية مع فتح القدير: ۷/ ۳۷۲)

بعض علماء نے اس پر تنقید کی ہے کہ یہ بڑی کمزور وجہ ہے' لیکن اسلام نے عورت کے زیادہ باہر نکلنے کو جس طرح ناپسند کیا ہے اور گھر میں رہنے کی تاکید اور پردے کا حکم دیا ہے' اسے دیکھتے ہوئے یہ وجہ بھی بڑی معقول نظر آتی ہے۔ اسے کمزور نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال فقہائے اسلام کے متفقہ مسلک کی یہ پانچ بنیادیں ہیں۔

مرجوح اور شاذ مسلک: اس متفقہ مسلک کے مقابلے میں ایک رائے یہ ہے کہ عورت کی گواہی ہر معاملے میں قابل قبول ہے' اموال و حقوق میں بھی اور حدود و قصاص میں بھی۔ البتہ اس کی گواہی مرد کی گواہی سے نصف ہے۔ اس لیے اس کا نصاب شہادت مرد سے دگنا ہو گا' مثلاً زنا کے جرم کے ثبوت میں ۴ مردوں کی جگہ آٹھ عورتیں' یا تین مرد اور دو عورتیں' یا دو مرد' چار عورتیں یا ایک مرد اور چھ عورتیں گواہ ہوں گی وعلی هذا القياس۔

یہ رائے عطاء' حماد اور امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ یہ مسلک شاذ ہے۔ اس کی بنیاد اس حدیث پر ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«أَلَيْسَ شَهَادَةُ الْمَرْأَةِ مِثْلَ نِصْفِ شَهَادَةِ الرَّجُلِ؟ . . . الحديث»(صحيح البخاري، الشهادات، باب شهادة النساء، ح:۲٦٥٨)

اس حدیث کو ان حضرات نے عام رکھا ہے۔ جب کہ جمہور فقہاء کے نزدیک یہ حدیث آیت مداینت کی تفسیر ہے کہ اموال میں ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی گواہی قبول ہو گی۔ تاہم ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مرجوح مسلک بھی مغربی نظریۂ مساواتِ مرد و زن کے حامیوں کے لیے چنداں مفید نہیں کہ اس میں بھی مرد کے مقابلے میں عورت کی نصف گواہی ہی کا اثبات ہے' جو ان کو کسی صورت قبول نہیں۔

مرد و زن کی مساوات کے قائلین کے دلائل کا جائزہ: اب ان دلائل کا جائزہ لیا جاتا ہے جو جمہور امت کے مسلک کے خلاف پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۔ ان میں سے بڑی دلیل ان کی یہ ہے کہ "قرآن میں شہادت کے سلسلے میں مذکر کے

صیغوں سے جن لوگوں کو خطاب کیا گیا ہے' اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم میں عموماً مذکر ہی کے صیغوں سے مردوں اور عورتوں دونوں کو خطاب کیا گیا ہے' ورنہ عورتوں کو تمام مسائل سے سبکدوش ہونا پڑے گا۔ ﴿ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ آتُوْا الزَّکٰوۃَ --- ﴾ مذکر ہی کے صیغے ہیں تو کیا صرف یہ کہہ دیا جائے کہ صلوٰۃ اور زکوٰۃ صرف مردوں پر فرض ہے اور عورتیں اس خطاب میں داخل نہیں ہیں۔"

یہ بظاہر بہت وزنی دلیل ہے' لیکن حقیقت میں پائے چوبیں کی طرح سخت بے تمکین ہے۔ اس میں مغالطہ انگیزی یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ نے مرد اور عورت دونوں کے جو الگ الگ دائرۂ کار متعین کیے ہیں' انہیں نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ اگر یہ تسلیم ہے کہ فی الواقع اسلام کی رو سے عورت کا دائرہ کار گھریلو امور' خانہ داری' حمل و رضاعت اور بچوں کی نگرانی و حفاظت' تک محدود ہے اور مرد کا دائرۂ کار معاشی جدوجہد اور تمام بیرونی معاملات تک وسیع ہے' تو پھر یہ ماننے میں بھی تامل نہیں ہونا چاہیے کہ شریعت اسلامیہ نے مرد و عورت دونوں کو ان کی الگ الگ ذمے داریوں اور طبعی اوصاف کا لحاظ کرتے ہوئے ایک دوسرے سے مختلف احکام بھی دیے ہیں' لیکن اس کے ساتھ ساتھ بعض خصوصیات اور صلاحیتیں ایسی بھی ہیں جو مرد اور عورت دونوں میں مشترک ہیں۔ قرآن جب مذکر کے صیغوں سے دونوں کو خطاب کرتا ہے تو وہ اسی مشترک دائرۂ عمل سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے آپ یوں سمجھ سکتے ہیں۔ مرد و عورت کی فطری خصوصیات اور اعمال و وظائف کے اعتبار سے تین میدان عمل ہیں۔

1. مرد کا دائرۂ عمل۔ جس میں مرد کی منفرد خصوصیات کے مطابق اس کے خاص فرائض و واجبات ہیں۔
2. عورت کا دائرۂ عمل۔ جس میں اسے اس کی صنفی خصوصیات کے لحاظ سے مرد سے مختلف امور و فرائض سونپے گئے ہیں۔
3. مشترک دائرۂ عمل۔ جس میں دونوں کی فطری صلاحیتیں بھی یکساں ہیں اور تعلیمات و ہدایات میں بھی خاص اختلاف نہیں۔ ایمان و اعتقاد' عبادات اور اخلاقیات کی جملہ

تعلیمات اسی مشترک دائرۂ عمل سے متعلق ہیں۔

اس بنیادی حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد' یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ مذکر کے صیغوں میں عورتیں صرف اسی وقت مردوں کے ساتھ شامل ہوں گی جب ان صیغوں میں دیا جانے والا حکم' مرد اور عورت کے مشترک دائرۂ عمل سے تعلق رکھتا ہو گا' ورنہ جہاں حکم کا تعلق صرف مرد کے دائرۂ عمل سے ہو گا' وہاں عورتیں یقیناً اس حکم سے خارج ہوں گی' مثلاً قرآن مجید ان حاجیوں سے کہتا ہے جو کسی وجہ سے حرم کعبہ تک نہ پہنچ سکیں اور انہیں راستے ہی میں رک جانا پڑے۔

﴿ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا ٱسْتَيْسَرَ مِنَ ٱلْهَدْيِ ۖ وَلَا تَحْلِقُوا۟ رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ ٱلْهَدْىُ مَحِلَّهُۥ ﴾

(البقرۃ۲/ ۱۹۶)

"اگر تم کہیں گھر جاؤ تو جو قربانی میسر آئے (وہ اللہ کی جناب میں پیش کرو) اور اپنے سر نہ مونڈو یہاں تک کہ قربانی اپنی جگہ پہنچ جائے۔"

اپنی جگہ پہنچنے سے کیا مراد ہے؟ فقہائے حنفیہ کے نزدیک اس سے مراد حرم ہے' یعنی اگر آدمی راستے میں رک جانے پر مجبور ہو' تو اپنی قربانی کا جانور یا اس کی قیمت بھیج دے' تاکہ اس کی طرف سے حدودِ حرم میں قربانی کی جائے اور امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک جہاں آدمی گھر گیا ہو' وہیں قربانی کر دینا مراد ہے۔

بہرحال اس آیت میں یہ کہا جا رہا ہے کہ اپنے سر جائے محاصرہ پر منڈوا لو' آیت میں اگرچہ صیغہ مذکر ہی استعمال کیا گیا ہے لیکن مراد مرد اور عورت دونوں نہیں ہوں گے' بلکہ صرف مرد ہوں گے کیونکہ حلق رأس کا تعلق مردوں ہی سے ہے عورتوں سے نہیں۔ عورتیں سر نہیں منڈواتی ہیں۔ کیا یہاں یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اَقِیمُوا الصَّلٰوۃَ وَ آتُوا الزَّکٰوۃَ کی طرح حلق رأس کے اس حکم میں مردوں کی طرح عورتیں بھی شامل ہوں گی؟

اسی طرح قرآن مجید نے اہل ایمان کو خطاب کر کے جگہ جگہ جمع مذکر کے صیغے میں کفار و مشرکین سے قتال کا حکم دیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ میدانِ کارزار میں سیف و سنان کے جوہر دکھانا مردوں کے دائرۂ عمل سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے ہر دور میں مسلمان مجاہدین

ہی کفار سے برسرپیکار رہے ہیں۔ مسلمان خواتین کو اس کا مخاطب نہیں سمجھا گیا۔ کیا اقیموا الصلٰوۃ و آتوا الزکاۃ سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہنا صحیح ہو گا کہ امت مسلمہ نے چودہ سو سال سے اب تک قرآن کا مطلب ہی نہیں سمجھا؟ اس میں تو مرد و عورت دونوں ہی شامل ہیں۔ عورتوں کو میدان جہاد و قتال سے الگ رکھ کر ان کی توہین کی گئی ہے۔ اگر جہاد ان پر فرض نہیں تو نماز و زکوٰۃ ان پر کیوں فرض ہے؟

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَوٰةِ مِن يَوۡمِ ٱلۡجُمُعَةِ فَٱسۡعَوۡاْ إِلَىٰ ذِكۡرِ ٱللَّهِ﴾ (الجمعة ٦٢/ ٩)

میں اہل ایمان کو کہا جا رہا ہے کہ نمازِ جمعہ کے لیے اذان ہو جائے تو اسی وقت سب کچھ چھوڑ کر اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو۔ مذکورہ استدلال کی رو سے مردوں کی طرح عورتوں کو بھی اس حکم کا مخاطب سمجھنا چاہیے' لیکن نبی ﷺ سے لے کر آج تک کسی نے یہ مطلب نہیں سمجھا اور مردوں کی طرح عورتوں پر جمعہ کو فرض و واجب قرار نہیں دیا' جب کہ آیت سے اہل ایمان کے لیے وجوب ثابت ہو رہا ہے۔ قرآن کریم سے اس طرح اور بھی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

ایک مثال حدیث رسول ﷺ سے بھی سن لیجیے! حضرت براء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

«أَمَرَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ بِسَبْعٍ وَنَهَانَا عَنْ سَبْعٍ أَمَرَنَا بِاتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ، وَعِيَادَةِ الْمَرِيضِ، وَإِجَابَةِ الدَّاعِي، وَنَصْرِ الْمَظْلُومِ، وَإِبْرَارِ الْقَسَمِ، وَرَدِّ السَّلَامِ، وَتَشْمِيتِ الْعَاطِسِ، وَنَهَانَا عَنْ آنِيَةِ الْفِضَّةِ، وَخَاتَمِ الذَّهَبِ، وَالْحَرِيرِ، وَالدِّيبَاجِ، وَالْقَسِّيِّ، وَالإِسْتَبْرَقِ» (صحيح البخاري، الجنائز، باب الأمر باتباع الجنائز، ح: ١٢٣٩)

"ہم کو رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا" میں "ہم کو" سے مراد تمام مسلمان مرد اور عورتیں ہیں' سیاق کلام اور بیان کردہ باتوں سے واضح ہے' لیکن اس کے باوجود اس میں بعض باتیں مردوں کے ساتھ خاص یا ان کے لیے ضروری ہیں' عورتوں کے لیے ضروری نہیں۔ جیسے جنازے میں شرکت۔ اسی طرح بعض باتیں مردوں کے لیے ممنوع ہیں' مگر

عورتوں کے لیے ممنوع نہیں۔ جیسے سونے اور ریشم کا استعمال لیکن یہاں صیغہ اَمَرْنَا اور نَھَانَا مشترکہ استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں اگر ہمارے بیان کردہ اصول کو ملحوظ نہیں رکھا جائے گا' تو بہت گڑ بڑ ہو گی۔ اس حدیث میں بیک وقت تینوں چیزیں موجود ہیں۔

1 کئی چیزیں اس میں مشترک ہیں۔ مرد و عورت دونوں اس کے مخاطب سمجھے جائیں گے۔
2 بعض حکم صرف مردوں کے لیے ضروری ہیں' عورتیں اس کی مکلف نہیں۔ جیسے اتباع الجنائز۔ (جنازوں میں شرکت)
3 اسی طرح بعض ممنوع چیزوں کا تعلق صرف مردوں سے ہے' عورتوں سے نہیں۔ عورت کے لیے ان کا استعمال جائز ہے' جیسے سونے اور ریشم کا استعمال۔

ان مثالوں سے واضح ہے کہ مذکر کے صیغوں میں دیے جانے والے حکم میں عورتیں صرف اسی وقت شامل ہوں گی جب کہ وہ حکم مرد اور عورت کے مشترکہ دائرۂ عمل سے متعلق ہو' یا دیگر دلائل شرعیہ سے کسی ایک صنف کا استثناء ثابت نہ ہو۔ اسی اقیموا الصلٰوۃ کے حکم پر ذرا غور کیجیے (جس کی مثال دی گئی ہے) اس کا تعلق عبادت سے ہے جس میں مرد و عورت دونوں بلاشبہ شامل ہیں' کیونکہ یہ مشترکہ دائرۂ عمل ہے۔ اس کے باوجود دیگر دلائل شرعیہ کی رو سے عورتوں کو ایک استثناء حاصل ہے کہ حیض و نفاس کے ایام میں نماز ان کے لیے معاف ہے' جب کہ مرد کے لیے نماز کسی حالت میں بھی معاف نہیں۔

بنابریں عدالتی شہادت کا تعلق بھی مرد کے بیرونی معاملات سے ہے' جو عورت کے دائرۂ عمل سے خارج ہے۔ شریعت نے اس کی صنفی خصوصیات' طبعی عوارض اور مخصوص گھریلو ذمے داریوں کی وجہ سے اس کو ہر معاملے میں گواہ بنانا پسند نہیں کیا ہے۔ اس لیے ناگزیر مواقع کے سوا' اس کو ہر معاملے میں مردوں کی طرح گواہ بنانے پر اس بنیاد پر اصرار کرنا کہ مذکر کے صیغوں کی وجہ سے مرد و عورت کے درمیان تفریق کرنا صحیح نہیں۔ اپنے اندر کوئی معقولیت نہیں رکھتا۔

حامیانِ مساوات سے ایک بنیادی سوال: علاوہ ازیں جمع مذکر کے صیغے سے استدلال کرتے ہوئے ہر معاملے میں مرد و عورت کی گواہی کو یکساں قرار دینا اس نص قرآنی کے بھی

خلاف ہے جس میں دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کے برابر کہا گیا ہے۔ اگر کہا جائے کہ وہاں تو اس کی وجہ --ان تضل-- یعنی نسیان و ذہول ہے' اس لیے ایک مرد کے ساتھ دو عورتیں ضروری ہیں۔ تو سوال یہ ہے کہ اس فرق کی بنیاد کیا ہے؟ کہ مالی معاملات میں تو بہ نص قرآنی تنہا عورت کی گواہی قبول نہیں' البتہ ایک مرد کے ساتھ دو عورتیں مل کر ایک مرد کے قائمقام بن سکتی ہیں' لیکن حدود و قصاص اور دیگر تمام معاملات میں عورت کی گواہی کو مرد کے مساوی قرار دیا جائے۔ کیا اَنْ تَضِلَّ والی صورت حال مالی معاملات ہی میں عورت کو لاحق ہوتی ہے' حدود و قصاص کے معاملات میں لاحق نہیں ہو سکتی؟ دلائل کی رو سے تو وہ علت' جس کی بنیاد پر دو عورتوں کو ضروری قرار دیا گیا ہے' عورت کی فطری کمزوری پر مبنی ہے جو ہر جگہ اور ہر کیس میں اس کے ساتھ رہے گی اور اس کے ہوتے ہوئے اسے عام حالات میں مرد کے مساوی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ پھر آخر مالی معاملات میں اور غیر مالی معاملات میں عورت کی شہادت میں فرق کیوں؟ یہ ایک ایسا بنیادی سوال ہے کہ جس کو حل کیے بغیر عورت کو عدالتی شہادت میں مرد کے برابر قرار نہیں دیا جا سکتا' وَلَو کَرِہَ الْکَارِھُون۔

<u>مرد کی ذہنی برتری کا تصور اور اس کا مفہوم</u>: ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ مرد کی ذہنی برتری کا تصور غلط ہے بالخصوص موجودہ دور میں عورت نے اس پر خط تنسیخ پھیر دیا ہے۔ اس لیے مرد و عورت کے درمیان فرق کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

۱۔ لیکن عرض ہے کہ ذہنی برتری کا یہ تصور کسی انسان کا تراشیدہ نہیں ہے' بلکہ شہادت میں دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر یہ کہہ کر ﴿ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰھُمَا فَتُذَکِّرَ اِحْدٰھُمَا الْاُخْرٰی ﴾ خالق کائنات نے اس کا اعلان کیا ہے۔ حالانکہ نسیان' ذہول اور گھبراہٹ کا شکار مرد بھی ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے' لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس کی گواہی کو تو مستقل حیثیت دی ہے' لیکن عورت کی گواہی کو ایک تو مستقل قرار نہیں دیا (یعنی محض عورتوں کی گواہی پر فیصلے کا حکم نہیں دیا) دوسرے ایک مرد کے مقابلے میں اس کا نصاب دگنا رکھا۔ آخر یہ ذہنی برتری نہیں ہے تو کیا ہے؟

۲۔ اس حقیقت کو قرآن مجید میں ثبت فرما کر یہ واضح کر دیا کہ مرد و عورت کے درمیان یہ فطری فرق جو ہے' یہ عارضی نہیں' جب تک یہ سلسلہ جہان رنگ و بو قائم ہے' یہ فرق بھی موجود رہے گا۔ عورت کتنی بھی ترقی کر لے' مرد کے مقام کو وہ کبھی نہیں پہنچ سکتی' کیونکہ یہ فرق جبلی اور پیدائشی ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی۔ وَلَوْكَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيراً۔

۳۔ یہ دعویٰ پروپیگنڈے کی پوری قوت کے باوجود تشنۂ ثبوت ہے۔ ہم کسی اسلامی ملک کی مثال نہیں دیتے' امریکہ اور یورپ کو بطور مثال پیش کرتے ہیں' جہاں عورت زیادہ نہیں تو کم از کم ایک صدی سے ضرور ہر محاذ پر مردوں کے دوش بدوش سرگرم عمل ہے۔ اس کے نتیجے میں وہاں ہر جگہ مرد کے ساتھ عورت تو ضرور نظر آئے گی' لیکن اس کے باوجود ہر شعبۂ کمال میں' چاہے سیاست و قیادت کا شعبہ ہو یا صنعت و حرفت کا' سائنسی علوم کا ہو یا بادیہ پیمائی و خلا نوردی کا' نہ صرف مردوں کا تناسب ہی زیادہ ملے گا' بلکہ عالمی سطح پر صرف مرد ہی نظر آئیں گے۔ آج بھی یورپ میں وزراء کی اکثریت' بلکہ بہت بڑی اکثریت مردوں ہی کی ہے۔ عورتیں بالکل قلیل بلکہ اقل قلیل وزارت کے منصب پر فائز ہیں۔ مغرب میں عورتیں بلاشبہ بڑے افسروں کی سٹینو یا سیکرٹری تو ہیں' لیکن ہر محکمے میں بڑے افسروں کی تعداد زیادہ تر مردوں ہی پر مشتمل ہے۔ حالانکہ تعلیمی لحاظ سے مرد و عورت کے تناسب میں زیادہ فرق نہیں ہو گا' اس کے باوجود ایسے کلیدی مناصب پر' جن کا تعلق ولایت یعنی ملک چلانے سے ہے' زیادہ تر مرد ہی فائز ہیں اور عورتوں کو چند کھلونے دے کر بہلا دیا گیا ہے' بلکہ اس کی مٹی پلید کی گئی ہے۔ اس کے لیے چند مخصوص شعبے مختص کر دیے گئے ہیں۔ نرسنگ کا پیشہ' ائیر ہوسٹس کا پیشہ یا پھر سیلز مینی اور ماڈلنگ کا۔ کیا یہ پیشے واقعی ایسے ہیں کہ ان سے عورت کی عزت و احترام میں اضافہ ہوا ہے؟

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مغرب چاہے زبان سے عورت کی فطری طور پر ذہنی فروتری کا اقرار نہ کرے' لیکن اس کا عمل آج بھی ببانگ دہل اس حقیقت کا اعلان کر رہا ہے۔ سچ ہے قدرت کے فطری نظام کو کوئی تبدیل کرنے پر قادر نہیں۔

۴۔ خود وہ حضرات بھی جو عدالتی شہادت میں مرد و عورت کے درمیان فرق کو عورت کی (نعوذ باللہ) توہین قرار دیتے ہیں۔ بیرونی معاملات میں مرد و عورت کے ذہنی تفاوت کو تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں دو کتابوں کے اقتباسات پیش خدمت ہیں۔ ایک مولانا عمر احمد عثمانی مصنف "فقہ القرآن" اور دوسرے ان کے پیشرو جناب غلام احمد پرویز۔

مولانا عثمانی صاحب آیت ﴿ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتَانِ ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس آیت کریمہ میں واقعی دو عورتوں کو ایک مرد کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے اور ایک عورت کی گواہی ایک مرد کے نصف کے برابر قرار دی گئی ہے۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اسلام نے مردوں اور عورتوں کے دائرۂ ہائے کار کا تعین کر دیا ہے۔ مردوں کا کام بیرون خانہ اکتساب رزق کی تگ و دَو اور جدوجہد قرار دیا گیا ہے اور عورتوں کا کام اندرون خانہ افزائش نسل' اولاد کی پرورش' غور و پرداخت' ان کی تربیت اور امور خانہ داری کی دیکھ بھال قرار دیا گیا ہے۔ اس کے ذمے نہ کسی کا نان و نفقہ ہے اور نہ اخراجات زندگی کا حصول ہے۔ یہ کام مردوں کا ہے۔ قرض کا لین دین ظاہر ہے وہی کرے گا جسے نقد رقم کی ضرورت ہو گی۔ عورتوں کو اس کی ضرورت عموماً لاحق نہیں ہوتی' انہیں تو بیٹھے بٹھائے گھر میں اس کا باپ یا شوہر رقم مہیا کر کے دے دیتا ہے اور وہ اس رقم سے گھر کا سارا نظام چلاتی ہے۔ اس کا باپ یا شوہر خود کما کر لائے یا کسی سے قرض' ادھار لے کر لائے۔ بہرحال قرض کا لین دین عموماً عورت کے دائرۂ کار میں آتا ہی نہیں۔

یہ اصول بالکل فطری ہے کہ آدمی کو اپنے دائرۂ کار ہی میں دلچسپی ہوتی ہے اور اسی میں اس کا ذہن چلتا ہے۔ ایک آرٹس کے طالب علم سے جو بی۔ اے کی کلاس میں پڑھ رہا ہے۔ آپ یہ توقع قائم نہیں کر سکتے کہ وہ بی۔ ایس۔ سی کے فزکس یا کیمسٹری کا کوئی فارمولا آپ کو سمجھا سکے گا' یا ایک بی۔ ایس۔ سی کے سٹوڈنٹس سے آپ دیوانِ غالب سبقاً سبقاً سمجھنا چاہیں یہ توقع محض بے جا ہو گی۔ ایک لاء گریجویٹ سے آپ کسی عمارت کا نقشہ نہیں بنوا سکتے اور ایک کوالیفائیڈ انجینئر سے آپ قانونی موشگافیوں کی توقع نہیں کر سکتے۔ ہر آدمی کا

ذہن اپنے دائرۂ کار ہی میں چلتا ہے اس سے باہر وہ اور ایک جاہل اجڈ برابر ہی ہوتے ہیں۔ لہٰذا عورتوں کا ذہن مالی لین دین اور قرض و ادھار کے معاملات میں ظاہر ہے مردوں کی طرح نہیں چل سکتا۔ جیسا کہ آپ مردوں سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ گھریلو معاملات کو بہتر طور پر حل کر سکیں گے۔ اسی طرح عورتوں سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ بیرون خانہ اقتصادی معاملات کو بھی بہتر طور پر سمجھ سکتی' سمجھا سکتی اور حل کر سکتی ہیں۔

عدالتوں کے چکر میں پھنسنا جہاں بال کی کھال نکالی جاتی ہے اور وکیل صاحبان اپنی جرح قدح سے اچھے اچھوں کے اوسان خطا کر دیتے ہیں۔ قرض لین دین کے سلسلہ میں جو عورتوں کے دائرۂ کار سے تعلق بھی نہیں رکھتا ایک عورت کے لیے درد سر ہے۔ وہ تفصیلات کے بیان میں الجھ سکتی ہے جس سے پورا مقدمہ ہی خراب ہو سکتا ہے۔ اسی الجھاؤ اور اضطراب (Confusion) کو قرآن کریم نے ﴿ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ﴾ سے تعبیر فرمایا ہے کہ اگر ایک عورت اپنے بیان میں الجھ جائے' تو دوسری عورت اسے یاد دلا دے۔ تَضِلَّ کے معنی بھول جانے کے نہیں ہیں جو ہمارے عام مترجمین نے بیان کر دیے ہیں' بلکہ اس کے معنی الجھاؤ اور اضطراب کے ہوتے ہیں۔ اَلضَلَّةُ کے بنیادی معنی' تحیر' حیرانی' سرگردانی' اضطراب (Confused - Perplexed) کسی چیز کا پوشیدہ اور غائب ہو جانا۔ مختلف چیزوں کا باہم خلط ملط ہو جانا کہ پھر انہیں جدا نہ کیا جا سکے' ہوتے ہیں (تاج العروس) لہٰذا اس کے معنی یہ ہیں کہ واقعہ کے مختلف پہلو خلط ملط ہو جانے کی وجہ سے عورتیں الجھ سکتی ہیں اور بات کو واضح نہیں کر پاتیں اور واقعہ کے بیان میں الجھاؤ سے پورا مقدمہ خراب ہو سکتا ہے۔ لہٰذا دو عورتیں ہونی چاہیں کہ ایک عورت کو کوئی الجھاؤ ہو تو دوسری اسے صاف کر دے۔ یہ عورتوں کا کوئی نقص نہیں ہے' بلکہ ان کے طبعی اور خلقی ساخت کا لازمی نتیجہ ہے۔" (فقہ القرآن: ۹۵/۳-۹۷)

جناب غلام احمد پرویز مرد و عورت کے درمیان اس فرق کو تسلیم کرتے ہیں' جو زیر بحث ہے۔ چنانچہ وہ بھی مذکورہ آیت مداینت کی تفسیر و توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اب سوال دوسرا باقی رہ جاتا ہے کہ قرآن نے بالخصوص عورتوں کے متعلق کیوں کہا

ہے کہ اگر ان میں سے ایک کو کچھ اشتباہ لاحق ہو جائے، کچھ گھبراہٹ سی ہو جائے تو دوسری عورت بات صاف کر دے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس تقسیم فرائض کی رو سے (جس کا ذکر میں نے اپنے خط میں کیا ہے یعنی عورتوں کے لیے اولاد کی پرورش و تربیت کا فریضہ اور مردوں کے ذمے اکتساب رزق کی ذمے داری) یہ ضروری تھا کہ مردوں اور عورتوں کی طبعی ساخت (Biological Constitution) میں فرق ہوتا۔ ان دونوں میں یہ فرق بدیہی ہے۔

مرد اور عورت میں نفسیاتی فرق: پھر چونکہ انسان کی طبعی ساخت کا اثر انسان کی نفسیات (Psychology) پر بھی پڑتا ہے اس لیے مردوں اور عورتوں میں اس حد تک نفسیاتی اثر بھی ضروری تھا، اسی نفسیاتی فرق کا ایک نتیجہ تو بالکل واضح ہے کہ مرد اکتساب رزق کے بعد مطمئن ہو جاتا ہے کہ وہ اولاد کی پرورش سے متعلق اپنے فرائض سے سبکدوش ہو گیا ہے، لیکن عورت اولاد کی پرورش کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہے اور اس پر مطمئن نہیں ہوتی، اس کا جی چاہتا ہے کہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک بھی بچے کے اندر انڈیل دے، یا اگر اس کا بس ہو تو اپنا سینہ چیر کر بچے کو دل کے اندر سمو لے۔ وہ بچے کو چھاتی سے لگا کر جس زور سے کھینچتی ہے وہ لاشعوری طور پر اسی جذبہ کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ دنیا کی ہر عورت بچے کو بائیں طرف گود میں اٹھاتی ہے۔ یہ بھلا کیوں؟ وہ اسے اپنے دل کے ساتھ چپکائے رکھنا چاہتی ہے جو بائیں طرف ہوتا ہے۔ مردوں اور عورتوں کی اس طبعی ساخت اور نفسیاتی اختلاف کے اثرات یا نتائج کیا ہوتے ہیں، اس کے متعلق مغرب کے علمائے نفسیات بہت کچھ تحقیق کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ہارڈنگ (M. Esther Harddins) نے ایک دلچسپ کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (The Way of All Women) جہاں تک اس نکتہ کا تعلق ہے جو اس وقت ہمارے زیر نظر ہے۔ وہ اس میں لکھتا ہے کہ اگر مردوں کو انسان کے باہمی تعلقات (Human Relation Ship) کے مسائل سے متعلق کام پر لگایا جائے تو یہ کام ان کے لیے کبھی خوش آئند نہیں ہوتا، لیکن عورتیں ایسے کام بہت پسند کرتی ہیں۔

عورتوں کے لیے مشکل مقام وہ ہوتا ہے جہاں ان سے کہا جائے کہ وہ کسی مسئلہ کی جزئیات کو پوری پوری صحت کے ساتھ (Accurately) بیان (Define) کر دیں۔ (ص:۱۳۱)

یہ کیوں ہوتا ہے؟ اس کے متعلق تو شاید ابھی حتمی طور پر کچھ نہ کہا جاسکے۔ لیکن ڈاکٹر ہارڈنگ کا بیان ہے کہ یہ وہ خصوصیت ہے جسے اس نے متعدد عملی مثالوں کے بعد عام طور پر عورتوں میں مشترک پایا..... ہے۔

اگر یہ تحقیق صحیح ہے تو آپ دیکھئے کہ قرآن نے اس کی کس قدر رعایت رکھی ہے۔ مقدمات میں ہمیشہ جزئیات پر بحث و تنقید اور جرح و تنقیح ہوتی ہے مقدمہ کی جزئیات کو پوری پوری صحت کے ساتھ بیان (Accurately Define) نہ کرنے ہی سے شہادت خراب ہوتی ہے اور شہادت کی توثیق کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس قسم کے باریک اختلافات کی صحت ہو جائے۔ عورتوں میں ایک تو وہ نفسیاتی کمی ہوگی جس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان فرائض کی سرانجام دہی میں مصروفیت کے باعث جو عورتوں سے مخصوص ہیں ان کے لیے مردوں کے مقابلے میں معاملات میں حصہ لینے کے مواقع بھی کم ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ متنازعہ فیہ معاملات (مقدمات وغیرہ) میں ''جہاں بال کی کھال نکالی جائے گی' عورت بالعموم جزئیات کی صراحت میں غیرواضح رہ جائے گی۔ اسی چیز کو قرآن نے دوسرے مقام پر ایک اور انداز سے بیان کیا ہے۔ سورۂ زخرف میں بات یوں چلی آتی ہے کہ عرب کے مشرکین یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ خدا کی بیٹیاں ہوتی ہیں۔ (وہ اپنی دیویوں کو اور فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیا کرتے تھے۔) اس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ (علاوہ اس کے کہ یہ عقیدہ کس قدر باطل ہے کہ خدا اولاد بھی رکھتا ہے) ان کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اولاد میں سے بھی بیٹوں کو تو یہ اپنے لیے مخصوص کرتے ہیں اور خدا کے لیے بیٹیاں مقرر کرتے ہیں جن کی ان کے اپنے دل میں اتنی وقعت ہے کہ اگر کسی کو بیٹی کی پیدائش کی ''خوش خبری'' دی جائے تو اس کے چہرے کی رنگت سیاہ پڑ جاتی ہے۔ اس کے بعد ہے کہ یہ اسے خدا کی اولاد قرار دیتے ہیں۔

﴿ أَوَمَن يُنَشَّؤُا۟ فِى ٱلْحِلْيَةِ وَهُوَ فِى ٱلْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ ﴿١٨﴾ ﴾

(الزخرف۴۳/ ۱۸)

"جو زیورات میں پرورش پاتی [1] ہے اور جھگڑے کے وقت اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی میں غیر مبین (غیر واضح) رہتی ہے۔"

متنازعہ فیہ امور (مقدمات وغیرہ) میں "غیر مبین" رہنا وہی چیز ہے جسے اوپر بیان کیا گیا ہے اور جسے سورۂ بقرۃ میں تَضِلَّ (ذہنی گھبراہٹ) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (طاہرہ کے نام خطوط' ص:۶۳-۶۶)

الفاظ اور تعبیرات کا کچھ فرق ضرور ہے' لیکن ذرا غور فرمایئے کہ مولانا عثمانی اور جناب پرویز نے جو کچھ عورت کی نفسیات' اس کی طبعی ساخت کے بارے میں کہا ہے اور عدالتی شہادت اور بیرونی معاملات میں مرد کے مقابلے میں اس کی کمزوری کا اعتراف کیا ہے۔ کیا فقہائے اسلام کے اس موقف سے مختلف ہے یا عین اس کے موافق' جس کی توضیح پچھلے صفحات میں کی گئی ہے؟

جب لین دین اور ادھار کے معاملات میں (بقول مولانا عثمانی صاحب) عورت کی شہادت مرد کی شہادت کے نصف ہے اور پرویز صاحب کے بقول عورت متنازعہ امور (مقدمات وغیرہ) میں غیر مبین یا گھبراہٹ کا شکار ہو جانے والی ہے تو پھر حدود و قصاص کے معاملات میں اس بنیاد پر اگر عدالتی شہادت سے عورت کو مستثنیٰ رکھا گیا ہے تو اس میں آخر عورت کی توہین کیوں؟ اور علماء' حدیث کے حوالے سے عورت کے نقصان عقل کا اعتراف کریں تو توہین لیکن یہی بات پرویز صاحب ڈاکٹر ہارڈنگ کے حوالے سے تسلیم کریں تو ایک حقیقت واقعہ اور سر آنکھوں پر۔ کیا خوب ہے ؎

تمہاری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی　　　وہ تیرگی جو مرے نامۂ سیاہ میں ہے

---

[1] عورت کے کے ذوق آرائش کا موضوع الگ ہے۔

❀ ❀ ❀

-- ۱۳ --

عورت اور قتل خطا کی دیت؟

قتل خطا کی دیت میں بھی مرد اور عورت کے درمیان فرق ہے' لیکن اس پر بحث کرنے سے قبل قتل خطا سے متعلقہ ضروری مسائل ملاحظہ فرمالیں۔ اس کے بعد اصل مسئلے پر گفتگو ہوگی۔

تفسیر آیت متعلقہ قتل خطا:

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَن يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَن قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰٓ أَهْلِهِۦٓ إِلَّآ أَن يَصَّدَّقُوا۟ ۚ فَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۖ وَإِن كَانَ مِن قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَـٰقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰٓ أَهْلِهِۦ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۖ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ ٱللَّهِ ۗ وَكَانَ ٱللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿٩٢﴾ ﴾

(النساء ٤/ ٩٢)

''کسی مومن کا یہ کام نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے' مگر غلطی سے اور جو قتل کرے کسی مومن کو غلطی سے آزاد کرے ایک مسلمان کی گردن اور دِیت (خون بہا) ادا کرے اس کے گھر والوں کو' مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں۔ پھر اگر (مقتول) ایسی قوم میں سے ہو کہ وہ تمہارے دشمن ہوں (کافر ہوں) لیکن مقتول خود مسلمان ہو تو (صرف) ایک مومن گردن آزاد کرنا ہے اور اگر وہ ایسی قوم میں سے ہو کہ تمہارے اور ان کے درمیان عہد ہو تو خون بہا (دِیت) ادا کرنا ہے اس کے گھر والوں کو اور آزاد کرنا ہے ایک مسلمان گردان کو اور جس کو (غلام) میسر نہ ہو تو وہ

متواتر (بلاناغہ) دو مہینے کے روزے رکھے۔ اللہ سے اپنے گناہ بخشوانے کے لیے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا، حکمت والا ہے۔"

اس آیت میں قتل خطا کے بارے میں دو باتوں کا حکم دیا گیا ہے۔

1. ایک مسلمان غلام (مرد یا عورت) آزاد کرنا۔ اس کی طاقت نہ ہو تو دو مہینے کے متواتر روزے رکھنا۔

2. مقتول کے وارثوں کو دِیت (خون بہا) ادا کرنا۔ دِیت مقتول کے وارث اگر معاف کر دیں تو معاف ہو سکتی ہے لیکن پہلی سزا جو ہے وہ معاف نہیں ہو سکتی۔ اس کی پہلی شکل پر تو عمل اب ممکن نہیں کہ غلامی کا رواج ختم ہو گیا ہے۔ البتہ دوسری شکل دو مہینے کے روزے رکھنا۔ اس کفارے کی اب یہی واحد شکل ہے۔

بعض لوگ ﴿ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ ﴾ "پس جو نہ پائے" سے یہ مراد لے رہے ہیں کہ قتل خطا کے مرتکب کے پاس اگر دیت کی ادائیگی کے لیے رقم نہیں ہے تو وہ صرف دو مہینے کے روزے رکھ لے۔ اس صورت میں ان کے نزدیک قاتل دیت کی ادائیگی کا مکلف ہی نہیں ہے، لیکن یہ مفہوم و مراد غلط ہے۔ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ کا تعلق صرف غلام کے آزاد کرنے سے ہے اور اس کی متبادل سزا دو مہینے کے روزے ہیں نہ کہ یہ روزے دِیت کے متبادل ہیں۔

علاوہ ازیں آیت مبارکہ میں مقتول کی تین حیثیتیں بیان کی گئی ہیں کہ جس مسلمان کو قتل کیا گیا، اس کے وارث مسلمان ہوں گے یا کافر۔ اگر کافر ہیں تو وہ معاہد (ذمی) ہے یا غیر معاہد (حربی)

① وارث مسلمان ہوں تب بھی غلام آزاد کرنے کے ساتھ دیت کی ادائیگی ضروری ہے۔

② وارث ایسے کافر ہوں جن سے مسلمانوں کی مصالحت ہے اور ان سے معاہدہ ہے تب بھی دیت کی ادائیگی ضروری ہے۔

③ وارث ایسے کافر ہوں کہ جن سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ نہیں ہے اور یہ مقتول مسلمان انہی حربی کافروں میں رہائش پذیر ہو تو اس صورت میں صرف غلام آزاد کرنا ضروری ہے۔ دیت کی ادائیگی نہیں کی جائے گی۔

اس کی کئی وجہیں علماء نے بیان کی ہیں۔

- ایک یہ کہ اس کے وارث سب کافر ہیں اور کافر مسلمان کے وارث نہیں ہو سکتے۔
- دوسرے' یہ کہ مسلمانوں سے برسرپیکار کافروں کو رقم دینا ان کی تقویت کا باعث ہو گا۔
- تیسرے' مقتول مسلمان کی بھی یہ غلطی تھی کہ مسلمان ہو جانے کے باوجود اس نے دارالحرب سے ہجرت نہیں کی' جب کہ ایسے مسلمانوں کو ہجرت کا عام حکم دے دیا گیا تھا۔ قرآن کریم نے ایک اور مقام پر ایسے مسلمانوں کو بایں الفاظ تنبیہ و تہدید کی۔

﴿ وَالَّذِينَ ءَامَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن وَلَٰيَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا ﴾

(الأنفال۸/ ۷۲)

"اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت نہیں کی' تم کو ان کی رفاقت سے کچھ کام نہیں جب تک ہجرت نہ کریں۔"

اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ہو جانے کے باوجود جو مسلمان ہجرت نہ کرے اور دارالحرب ہی میں مسلمانوں کے دشمنوں کے درمیان رہے تو اللہ تعالیٰ کو یہ رویہ پسند نہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس صورت میں اس کے قتل خطا کو وہ اہمیت نہیں دی جو دوسرے مقتول مسلمانوں کو دی۔ احادیث میں بھی بعض واقعات ملتے ہیں جن سے اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ دارالحرب میں مقیم مسلمانوں کو غلطی سے قتل کر دیے جانے کی صورت میں دیت نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے واقعات میں قصاص کا حکم دیا نہ دیت کا۔ (تفسیر القرطبی' ۵/ ۳۲۴)

ایک ضروری وضاحت: بعض قدیم و جدید مفسرین نے مذکورہ ہماری بیان کردہ دوسری صورت کے مقتول کو کافر قرار دیا ہے اور یوں وہ کافر اور مسلمان کی دیت میں (قتل خطا میں) برابری تسلیم کرتے ہیں' لیکن ہمارے خیال میں یہ رائے صحیح نہیں۔ قرآن کے سیاق سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ تینوں صورتیں مسلمان مقتول کی بیان کی جا رہی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر مذکورہ صورت میں مقتول کافر مراد ہوتا پھر تو مسلمان اور کافر کی دیت میں مساوات کے لیے یہ نص قطعی ہوتی اور اس میں فقہاء وائمہ کے درمیان اختلاف ہی نہ

ہوتا جب کہ واقعہ یہ ہے کہ کافر کی دیت میں اختلاف ہے اور اس کی بابت تین آراء ہیں۔

① مسلمان اور کافر کی دیت برابر ہے۔

② کافر کی دیت مسلمان کی دیت سے نصف ہے۔

③ کافر کی دیت مسلمان کی دیت سے تہائی (۱/۳) ہے۔

بہرحال زیادہ صحیح اور راجح بات یہی ہے کہ آیت مذکورہ میں قتل خطا کی جو تین صورتیں بیان ہوئی ہیں وہ تینوں مسلمان مقتول کی ہیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو' احکام القرآن' لابن العربی ۱/۷۷۴-۴۷۸)

اور یہ آیت چونکہ اس موقعے پر نازل ہوئی تھی جب کہ مسلمانوں کو ہجرت کا عام حکم مل چکا تھا' علاوہ ازیں مرحلہ بہ مرحلہ کفر و اسلام کے درمیان معرکے جاری تھے اور ان معرکوں میں بعض واقعات ایسے بھی پیش آئے کہ مسلمان کافروں سے لڑنے کے لیے گئے تو وہاں مقیم بعض مسلمان بھی کفار کے دھوکے میں غلطی سے مارے گئے۔ چنانچہ آیت زیر بحث میں ان تمام صورتوں کو بیان کر دیا گیا جو اس وقت پیش آ رہی تھیں۔ یہ صورتیں اب بھی بعض ان علاقوں میں پیش آ سکتی ہیں جہاں ابتدائے اسلام کے سے حالات ہوں۔

قتل کی قسمیں: قتل کی دو صورتیں ہیں' عمداً (جان بوجھ کر) اور خَطَأً (غلطی سے)' قتل عمد میں قصاص (جان کے بدلے' جان) ہے۔ اِلا یہ کہ اولیائے مقتول دیت لے کر یا بغیر دیت لیے قاتل کو معاف کر دیں اور قتل خطا میں قصاص نہیں ہے صرف دیت ہے۔ قتل خطا کا مطلب ہے کہ ایک شخص نے ہرن یا کسی اور پرندے کا شکار کرنا چاہا' لیکن گولی پرندے یا جانور کی بجائے کسی انسان کو لگ گئی اور وہ مر گیا یا کسی کو حربی کافر سمجھ کر گولی ماری اور وہ مر گیا۔ درآں حالیکہ وہ مسلمان تھا۔

ایک تیسری صورت قتل شبہ عمد کی بھی ہے لیکن بعض ائمہ کے نزدیک یہ بھی قتل خطا ہی ہے' اس لیے وہ صرف دو ہی صورتیں مانتے ہیں۔

قتل خطا کی دیت بھی قتل عمد کی دیت کی طرح سو اونٹ ہیں جو پانچ قسم کے ہوں گے یا پھر بارہ ہزار درہم (چاندی) کی قیمت۔ اب اونٹ کی تعداد تو اتنی گھٹ گئی ہے کہ اس کے

دینے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا' لہٰذا اب صرف چاندی کی وہ قیمت ہی ہے جو اس کے متبادل بعض احادیث ہی میں بتلائی گئی ہے اور جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں اونٹ کے مہنگے ہونے کی وجہ سے بڑھا کر ۱۲ ہزار درہم کر دی تھی۔ (سنن ابی داود' الدیات' باب الدیة کم ھی' حدیث: 4542)

جو آرڈیننس پاکستان میں نافذ کیا گیا ہے اس میں دیت کی قیمت غالباً ۱۰ ہزار درہم کے حساب سے دی گئی ہے۔ حالانکہ زیادہ صحیح ۱۲ ہزار درہم کے مساوی چاندی کی قیمت کے برابر دیت ہے' بلکہ اس میں اونٹوں کی قیمت کے اعتبار سے مزید اضافے کی شرعاً گنجائش معلوم ہوتی ہے' کیونکہ اصل دیت سو اونٹ ہیں۔ علمائے اہل حدیث کو اس پر مزید غور و فکر کرنا چاہیے۔

موجودہ آرڈی نینس کی رو سے دیت کی رقم ایک لاکھ ستر ہزار چھ سو دس روپے ہیں جو تیس ہزار چھ سو تیس گرام چاندی کی مالیت ہے۔ حالانکہ اونٹوں کی قیمت کی لحاظ سے یہ رقم تقریباً دگنی ہونی چاہیے۔

قتل خطا میں چونکہ قاتل کی نیت قتل کرنے کی نہیں ہوتی' اس لیے شریعت نے اس کے ساتھ خاص رعایت برتی ہے اور کہا ہے کہ کفارہ تو وہ خود ادا کرے (غلام آزاد کرنا یا دو مہینے کے متواتر روزے رکھنا) اور دیت کی ادائیگی میں عاقلہ' اس کی مدد کرے۔

«قَضٰی رَسُوْلُ اللهِ ﷺ بِالدِّيَـةِ عَلَى الْعَاقِلَةِ»(سنن ابن ماجه، الديات، باب الدية على العاقلة فإن لم يكن . . . ، ح: ٢٦٣٣)

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ دو عورتیں لڑ پڑیں۔ ایک نے دوسری عورت کو پتھر مارا جس سے وہ مر گئی' نیز اس کے پیٹ کا بچہ بھی مر گیا۔ (یہ بھی چونکہ قتل خطا تھا اس لیے) رسول اللہ ﷺ نے اس مقتول عورت کی دیت کا ذمہ دار اس کی عاقلہ (مددگار برادری) کو قرار دیا۔ (صحیح بخاری' الدیات' باب جنین المرأة --- حدیث: 2910 صحیح مسلم' القسامة' باب دية الجنين --- حديث: 1681)

"عاقلہ" کا مطلب: "عاقلہ" عقل سے ہے جس کے لغوی معنی "روکنے" کے ہیں۔ دیت مزید خونریزی سے روکتی ہے۔ اس لیے دیت کو بھی "عقل" کہتے ہیں اور "عقل"

(دیت) کی ادائیگی کرنے والے قبیلے کو "عاقلہ" کہا جاتا ہے۔ "عقل" کو بھی اس لیے "عقل" کہا جاتا ہے کہ عقل انسان کو برے کاموں سے روکتی ہے۔ اونٹ کو جس رسی سے باندھا جاتا ہے اس کو بھی "عقال" کہا جاتا ہے' کیونکہ رسی بھی اونٹ کو باندھے اور روکے رکھتی ہے۔

بہر حال "عاقلہ" کا اصل مفہوم وہ قبیلہ ہے جو قاتل کی طرف سے بطور تعاون دیت کی ادائیگی کا ذمہ دار ہے۔ جتنی ادائیگی قاتل کر سکتا ہو وہ کرے باقی ادائیگی اس کے اہل قبیلہ مل کر کریں۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں یہی طریقہ رائج رہا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں دفتری نظام قائم کیا اور الگ الگ محکمے قائم کیے۔ ایک محکمہ میں کام کرنے والوں کے نام ایک رجسٹر میں درج ہوتے' جس کو دیوان کہا جاتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے ساتھ یہ تبدیلی بھی کی کہ عاقلہ اہل قبیلہ کی بجائے اہل دیوان کو قرار دے دیا۔ (فقه السنة' ۲/۴۷۰-۴۷۱)

یوں نسبی تعلق کی بجائے ایک دیوان سے تعلق باہمی تعاون و تناصر کی بنیاد بن گیا اور ایک دیوان سے تعلق رکھنے والے آپس میں ایک دوسرے کے عاقلہ قرار پائے۔

عاقلہ کی جدید تعبیر: آج کل بھی خاندانی و نسبی تعلقات شکست و ریخت کا شکار ہو چکے ہیں' اس لیے ایک پیشے سے تعلق رکھنے والے اپنی اپنی یونینیں اور فیڈریشنیں اس انداز سے بنا سکتے ہیں کہ وہ بوقت ضرورت ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ بالخصوص ڈرائیوروں کے لیے یہ تنظیمیں عاقلہ کا کردار ادا کر سکتی ہیں' کیونکہ یہی طبقہ عام طور پر غریب ہے اور ان کے اہل خاندان اور برادری کے افراد بھی بالعموم غریب ہی ہیں۔ اس پس منظر میں عاقلہ کے مفہوم میں جو وسعت اسلامی نظریاتی کونسل نے پیدا کی ہے۔ اس کی شرعاً گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے مسودے کے اصل الفاظ حسب ذیل ہیں۔

۲۹۔ عاقلہ۔ اس آرڈیننس میں عاقلہ سے مراد کسی گروہ' افراد کی جماعت' انجمن' ادارہ' تنظیم' کمیٹی' کارپوریشن' اسٹیبلشمنٹ' محکمے' ٹریڈ یونین' منظم قبیلے' یا برادری کے تمام مرد بالغ اور عاقل ارکان ہیں۔ جن سے مجرم یا سزا یافتہ شخص مدد اور حمایت حاصل کرتا ہو یا

حاصل کرنے کی امید رکھتا ہو۔

تشریح: عاقلہ کا تعین' عدالت ہر مقدمے کے حقائق اور حالات کا لحاظ رکھتے ہوئے کرے گی۔ اور اس سے پہلے سزا کے بیان میں درج ہے۔

"۲۴۔ جلد بازی یا لاپروائی سے گاڑی چلا کر ارتکاب قتل خطا کی سزا:۔

جو کوئی جلد بازی یا لاپروائی سے گاڑی چلا کر قتل خطا کا مرتکب ہو گا' اسے قید محض یا قید بامشقت جس کی میعاد دس سال تک ہو سکتی ہے یا جرمانے کی سزا دی جائے گی یا دونوں سزائیں دی جائیں گی اور وہ دیت کا مستوجب ہو گا جو اس کی عاقلہ ادا کرے گی۔"

اس کے برعکس موجودہ آرڈیننس میں قتل خطا کی سزا کے ضمن میں صرف اتنا کہا گیا ہے۔ "جو کوئی قتل خطا کا ارتکاب کرے' دیت کا مستوجب ہو گا۔"

اور ڈرائیوروں کے لیے بالخصوص یہ کہا گیا ہے: "جو کوئی تیز یا غفلت سے گاڑی چلانے کے باعث قتل خطا کا مرتکب ہوا' اسے مقدمہ کے حقائق اور حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ دیت کے علاوہ کسی بھی قسم کی سزائے قید اتنی مدت کے لیے دی جائے گی جو دس سال تک ہو سکتی ہے۔"

جن اہل ثروت نے پرائیویٹ گاڑیاں اور کاریں وغیرہ رکھی ہوئی ہیں' ان کے اور ان کے اہل خاندان کی طرف سے قتل خطا کی صورت میں دیت کی ادائیگی کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے' وہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک کی طرح عاقلہ کے اصل مفہوم پر عمل کرنے کی قدرت رکھتے ہیں' اس لیے ان کے لیے بہتر ہے کہ وہ اس کے مطابق عمل کریں۔ بصورت دیگر وہ بھی مذکورہ انداز کی تنظیم قائم کر سکتے ہیں جو بوقت ضرورت ان کے لیے عاقلہ کا کام انجام دے۔

اسی طرح جس قاتل کا کوئی عاقلہ نہ ہو' نہ خاندان نہ کوئی یونین و تنظیم وغیرہ' اس کی عاقلہ حکومت ہو گی اور حکومت کی طرف سے مقتول کے ورثاء کو دیت کی ادائیگی کا اہتمام کرنا چاہیے۔ غرض مقتول کے خاندان کی دادرسی کا اہتمام بہرصورت ہونا چاہیے' اس میں تغافل و تساہل قطعاً نہیں ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں بعض صورتیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں کہ

حادثے میں ڈرائیور کا قطعاً کوئی قصور ہی نہ ہو اور اسے قتل خطا کا مجرم قرار دینا بھی مشکل ہو' تو ایسی صورت میں بھی مقتول یا مقتولین کی دیت حکومت ہی کو ادا کرنی چاہیے۔

دیت کی ادائیگی' انشورنس کمپنیوں کی ذمہ داری نہیں: بعض اخباری بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت شاید دیت کی ادائیگی کا انشورنس کمپنیوں کو ذمہ دار بنانا چاہتی ہے۔ لیکن یہ سوچ صحیح نہیں۔

① انشورنس کا سارا نظام سود پر مبنی ہے' اس لیے سودی کمپنیوں کے اسے سپرد کر دینا بالکل غلط ہو گا اور یہ مخمل میں ٹاٹ کی پیوند کاری کے مترادف ہے۔

② اس طرح عاقلہ کا تصور بھی ختم ہو جائے گا۔ عاقلہ کے قدیم مفہوم کی رو سے تو قاتل سمیت پورا خاندان ذمہ دار ہے اور اس میں حکمت یہی ہے کہ پورا خاندان اور قبیلہ مجرم کو جرائم سے باز رکھنے کی کوشش کرے' تاکہ وہ ناگہانی آفت کی زد سے محفوظ رہے اور عاقلہ کے جدید مفہوم (یونین وغیرہ) کی رو سے بھی قاتل خود بھی اس تنظیم کا ممبر ہے جو اس کی عاقلہ ہے اور اس لحاظ سے وہ بھی اس بوجھ میں شریک ہو گا جو اس کی پوری یونین پر (بطور عاقلہ) پڑے گا۔ یوں عاقلہ کے قدیم اور جدید دونوں مفہوموں میں ڈرائیور کو عاقلہ سے خارج نہیں کیا گیا' بلکہ وہ اس میں شامل رہتا ہے اور شامل رہنا چاہیے۔ جب کہ انشورنس کی صورت میں شاید ڈرائیور ہر طرح سے ہر قسم کے بوجھ سے فارغ ہو گا اور پریمیم کی ادائیگی بس مالکان کے ذمے ہو گی اور جب ڈرائیور کسی لحاظ سے بھی اس بوجھ میں شریک نہیں ہو گا تو وہ تیز رفتاری اور اوور ٹیکنگ (Over Taking) سے کب باز آئے گا جو حادثات کا سب سے زیادہ باعث ہے۔

دیت کی ادائیگی فی الفور کی جائے: فقہاء نے قتل خطا میں دیت کی ادائیگی کے لیے تین سال کی مہلت دی ہے' بلکہ فقہائے احناف نے تو قتل عمد تک میں بھی دیت پر مصالحت ہو جانے کی صورت میں تین سال کی مہلت دی ہے۔ تاہم رسول اللہ ﷺ کے عمل سے اس مہلت کی تائید نہیں ملتی۔ نبی ﷺ نے فوراً ادائیگی کا اہتمام کرایا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ دیت کی ادائیگی میں بلاوجہ تاخیر نہ کی جائے اور اس کی فوری ادائیگی ہونی چاہیے۔ بعض استثنائی صورتوں

میں اس کی گنجائش نکالی جاسکتی ہے' لیکن عام اصول فوری ادائیگی ہی کا ہونا چاہیے۔

عورت کی دیت کا مسئلہ: دیت کے احکام و مسائل میں عورت کی دیت کا مسئلہ' جو شرعی دلائل کی رو سے قتل خطا میں مرد کی دیت سے نصف ہے' اس پر بھی شکوک و شبہات پیدا کیے جاتے ہیں۔ اس لیے ان کے ازالے کے لیے قدرے تفصیل ضروری ہے۔ چند سال قبل ایک محترم بزرگ نے بھی اس پر خامہ فرسائی کی تھی اور عورت کی نصف دیت پر اپنے شبہات کا اظہار فرمایا تھا۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس کا جائزہ لیں' اس ضمن میں نصف دیت کے دلائل اور اس کی حکمت و مصلحت کا بیان ازخود آ جائے گا۔

عورت کی نصف دیت اور اس کی حکمت و مصلحت

محولہ مضمون ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۴ء کے "نوائے وقت" لاہور میں شائع ہوا تھا۔ تاہم قبل اس کے کہ مرحوم کے بیان پر کچھ عرض کیا جائے مسئلے کی نوعیت بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مسئلے کی نوعیت: مختصراً مسئلے کی نوعیت یہ ہے کہ بطور غلطی اگر کوئی عورت قتل ہو جائے تو اس کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہو گی۔ قتل عمد کا حکم اس سے مختلف ہے اور اس میں مرد و عورت کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے۔ یعنی صرف ایک صورت (قتل خطا) میں عورت کی دیت مرد کی دیت سے آدھی ہو گی۔

شرعی دلائل: قتل خطا کی دیت میں مرد و عورت کے درمیان یہ تفریق کیوں ہے؟ اس کی وجہ حسب ذیل ہے:

1. اس سلسلے میں سب سے بڑی دلیل تو وہ حدیث ہے جو سنن نسائی وغیرہ میں آتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ثلث تک مرد و عورت کی دیت برابر ہے اور اس کے بعد عورت کی دیت نصف ہے۔ سنداً یہ روایت اکثر محدثین کے نزدیک بالکل صحیح ہے۔
(دیکھیے سنن نسائی' کتاب القود' باب عقل المرأة)

شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے' تاہم دوسرے آثار صحابہ کی وجہ سے' جو صحیح سند سے ثابت ہیں' عورت کی نصف دیت کا اثبات کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ارواء الغلیل ۷۔۳۰۷)

2. سنن کبریٰ بیہقی کی دوسری روایت ہے جس میں آتا ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف ہے۔ (کتاب الدیات' باب دیة المرأة' ص:۹۵' ج:۸)

اس روایت میں قدرے ضعف ہے۔ لیکن دو وجوہ سے ضعف کے باوجود یہ حدیث

قابل استدلال ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ مسئلے کی بنیاد صرف یہ حدیث ہی نہیں ہے' بلکہ اصل بنیاد تو وہ حدیث ہے جو سنن نسائی میں آتی ہے۔ اسی طرح حضرت عمرو بن حزم کی روایت میں بھی بقول بعض فقہاء اس کا ذکر ہے اور عمرو بن حزم کی اس روایت کو ماہرین فن حدیث نے صحیح قرار دیا ہے۔ (التعلیقات السلفیه علی سنن النسائی' ۲/۲۴۷)

اور اُصولِ حدیث کے مطابق وہ ضعیف روایت قابل قبول ہوتی ہے جس سے کسی صحیح حدیث کی تائید ہوتی ہو۔ محدثین ایسی روایت کو بطور توابع اور شواہد کے ذکر کرتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جس روایت کو امت کے علماء و فقہاء کا تلقی بالقبول حاصل ہو جائے وہ روایت بھی قابل استدلال ہوتی ہے اس کے ضعف کا جبر تلقی بالقبول کی وجہ سے ہو جاتا ہے۔

3 تیسرے' آثار صحابہ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے فیصلے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

4 چوتھے' اس مسئلے پر امت مسلمہ کے علماء و فقہاء کا اجماع چلا آ رہا ہے اور اجماع امت بھی دین میں حجت ہے۔ صرف دو شخصوں (ابوبکر الاصم اور ابن علیہ) کا اختلاف منقول ہے۔ جسے فقہاء نے شاذ قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: المغنی لابن قدامہ' ۹/۵۳۲)

یہ دو شخص کون ہیں؟ امام ابن قدامہ مقدسی نے المغنی میں صرف الاصم اور ابن علیہ نام لکھا ہے۔ الاصم سے اگر مراد ابوبکر الاصم ہے جیسا کہ زیادہ صحیح یہی نام معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ الاصم کے نام سے یہی معروف ہیں۔ جیسا کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے "سیر اعلام النبلاء" میں "الاصم" کے عنوان کے تحت ابوبکر الاصم ہی کا ترجمہ درج کیا ہے اور اسے "شیخ المعتزلہ" کہا ہے۔ (۹/۴۰۲) اور لسان المیزان میں اس کا نام عبدالرحمٰن بن کیسان بتلایا گیا ہے اور اسے معتزلی اور ایک عجیب و غریب تفسیر کا مصنف کہا ہے۔ (۳/۴۲۷)

ابن علیہ کے نام سے دو شخص معروف ہیں۔ اسماعیل بن علیہ اور ابراہیم بن علیہ۔ بالترتیب یہ دونوں باپ بیٹے ہیں۔ تاہم باپ (اوّل الذکر) کا شمار محدثین میں ہوتا ہے۔ البتہ ان کے بیٹے ابراہیم بن علیہ کا اصحابِ تراجم نے اچھے انداز میں ذکر نہیں کیا ہے۔ علاوہ ازیں اسے ابوبکر الاصم کے غلمان (غلام اور شاگرد) میں سے قرار دیا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے

اس کے بارے میں یہاں تک کہا ہے کہ ضَالٌّ یُضِلُّ النَّاسَ "خود بھی گمراہ اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے والا۔" (ملاحظہ ہو: تاریخ بغداد للخطیب ۲۰/۶-۴۲)

ایسے دو شخصوں کی رائے سے جن کی امت میں کوئی علمی اہمیت نہیں۔ اجماع کا دعویٰ کیوں کر مجروح ہو سکتا ہے؟

حکمت و مصلحت: یہ تو ہیں مسئلہ زیر بحث کے شرعی دلائل۔ اب اس کی حکمت و مصلحت بھی ملاحظہ فرمالی جائے۔

جہاں تک انسانی شرف و تکریم کا معاملہ ہے۔ اسلام میں مرد و عورت کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے۔ اسلام ہی وہ پہلا مذہب ہے جس نے انسانی معاشرے میں عورت کی عزت اور اس کے مقام و منصب کا تحفظ اور اس کی قدر و منزلت کا اعتراف کیا ہے۔ (جس کی تفصیل مقدمہ' کتاب میں گزر چکی ہے) لیکن اس کے ساتھ یہ واقعہ بھی ہے کہ اسلام اس مساواتِ مرد و زن کا قائل نہیں ہے۔ جو اس وقت مغرب میں عام ہے۔ اسی لیے تکریم نسوانیت کا مفہوم دونوں جگہ یکساں نہیں ہے۔ مغرب کے نزدیک جو چیز بھی عین تکریم نسوانیت ہے اسلام کے نزدیک وہ عین تذلیل نسوانیت ہے۔ اسی طرح اسلام میں تکریم نسوانیت کے لیے جو حدود و ضوابط تجویز کیے گئے ہیں' ہو سکتا ہے وہ مغرب کے نزدیک استخفاف نسوانیت کا باعث ہوں۔

اسلام میں عورت کے لیے پردہ انتہائی ضروری ہے۔ مرد و زن کے بے محابا اختلاط کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ مغربی ذہن اسلام کی اس ہدایت پر ناک بھوں چڑھاتا ہے اور اسے (نعوذ باللہ) عورت کی تذلیل قرار دیتا ہے' لیکن اسلام کی نظر میں یہ عورت کی تذلیل نہیں' اس کی عین عزت ہے اور بے پردگی میں' جسے مغربی ذہن عورت کی عزت قرار دیتا ہے' عورت کی تذلیل و تحقیر ہے۔

اسی طرح اسلام نے مرد و عورت کی مختلف فطری صلاحیتوں کی بنا پر دونوں کا دائرۂ کار بھی مختلف رکھا ہے۔ مرد کو معاشی ذمہ داریوں کا کفیل بنایا ہے اور عورت کو اس معاشی کفالت سے آزاد رکھا ہے۔ یہ صرف مرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ گھر سے باہر محنت مزدوری

کرے، کارخانوں اور دفتروں میں ملازمت کرے اور معاشی تگ و دَو میں حصہ لے اور عورت گھر کی چار دیواری کے اندر امور خانہ داری کے فرائض انجام دے۔ یہ الگ الگ دائرہ کار اُن فطری صلاحیتوں کے مطابق ہے جن کی وجہ سے مرد و عورت کی تخلیق ہوئی ہے اور اسی میں ان کی عزت و تکریم ہے۔

اسی بنیاد پر میراث میں عورت کا حصہ مرد کے مقابلے میں نصف ہے، کیونکہ معاشی کفالت کے لیے مرد کو مال و دولت کی جتنی ضرورت ہے عورت کو نہیں۔ اسلام کا یہ اصول قیامت تک کے لیے ہے۔ اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اب چاہے معاملہ کتنا ہی برعکس ہو جائے اور عورتیں مَردوں کے دوش بدوش دوڑ میں خواہ کتنی ہی سرگرمی سے حصہ لیں اور کارخانے اور دفاتر چاہے عورتوں کے دم قدم سے کتنے ہی پُررونق ہو جائیں، لیکن میراث میں عورت کا حصہ پھر بھی مرد کے حصے سے نصف ہی رہے گا، کیونکہ معاشی سرگرمیوں میں عورتوں کی (بطور اصول) شرکت ہی سرے سے غلط ہے اور اسلام کے خلاف ہے (بعض انفرادی صورتوں میں بطور مجبوری عورتوں کی ملازمت الگ بات ہے جس کی گنجائش محدود دائرے میں موجود ہے)

عورت کی نصف دیت میں بھی وہی علت ہے جو میراث کے نصف حصے میں ہے یعنی چونکہ مرد کے قتل کیے جانے کی صورت میں ایک پورا خاندان اپنے کفیل سے محروم ہو جاتا ہے، اس لیے خاندان کی کفالت کے نقطۂ نظر سے اس کی پوری دیت ضروری ہے جب کہ عورت کے قتل کیے جانے کی صورت میں ایسی مالی مشکل پیش نہیں آتی۔ اس لیے اس کی نصف دیت قطعاً غیر معقول نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں نصف دیت کے پیچھے قطعاً یہ جذبہ کارفرما نہیں ہے کہ نعوذ باللہ عورت حقیر ہے یا وہ نصف انسان ہے۔ اس لیے اس کی دیت بھی نصف ہے، بلکہ اس میں مضمر وہی علت یا حکمت و مصلحت ہے جو میراث میں پائی جاتی ہے جس میں عورت کی تحقیر کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

مرحوم بزرگ کے دلائل کا تجزیہ: مرحوم بزرگ نے فرمایا ہے کہ عورت بھی پورا انسان ہے۔ اس لیے اس کی دیت بھی پوری ہونی چاہیے۔ نصف نہیں ہو سکتی، لیکن مسئلہ

پورے انسان یا نصف انسان کا سرے سے ہے ہی نہیں، کیونکہ یہ "جان" کا بدلہ تو ہے نہیں، بلکہ اس معاوضہ کا ہے جو عاقلہ نے ورثاء کو ادا کرنا ہے۔ نصف دیت کے ڈانڈے عورت کی انسانیت سے ملانا ایک تو خلط مبحث ہے۔ دوسرے، جذباتی اندازِ فکر ہے جس سے مقصود عورتوں کی حمایت حاصل کرنا ہے اور تیسرے، اگر "پورا انسان" والی دلیل دیت کے مسئلے میں کوئی معقولیت رکھتی ہے تو اس "دلیل" کی رُو سے تو عورت کا حصۂ میراث بھی مرد کے برابر ہی ہونا چاہیے نہ کہ نصف۔ کیا اس "دلیل" کو صحیح تسلیم کر لینے کے بعد عورت کی نصف میراث کا کوئی جواز باقی رہ سکتا ہے؟

۲۔ دوسری بات مولانائے محترم نے یہ فرمائی ہے کہ عمرو بن حزم کی وساطت سے محدثین تک پہنچنے والی حدیث صحیح نہیں ہے۔ یہ بھی محل نظر ہے، علماء محققین نے اس سند کی تحقیق کر کے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو مصری فاضل احمد شاکر کی تحقیق برحاشیہ "المحلّٰی" ۸۲/۱، ۵، ۲۱۴ - ۳۶/۲، ۶۱)

تاہم یہ بات ضرور ہے کہ بعض شافعی اور حنبلی فقہاء نے عمرو بن حزم کی روایت کے حوالے سے جو یہ لکھا ہے کہ "عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے" حدیث کی متداول کتب میں حضرت عمرو بن حزم کی روایت کے کسی طریقے میں یہ الفاظ موجود نہیں ہیں۔ لیکن نصف دیت کے قائلین کی بنائے استدلال یہ ٹکڑا نہیں، بلکہ سنن نسائی کی وہ صحیح روایت ہے جو مضمون کے آغاز میں نقل کی جا چکی ہے۔ دوسری سنن کبریٰ بیہقی میں، حضرت معاذ بن جبل سے مروی حدیث ہے۔ تیسرے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے فیصلے اور آثارِ صحابہ اور چوتھے نمبر پر فقہائے امت کا اجماع ہے۔ اس لیے عمرو بن حزم کی روایت میں نصف دیت والا ٹکڑا اگر موجودہ کتب حدیث میں نہیں ملتا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۳۔ تیسری بات مرحوم نے یہ فرمائی ہے کہ حدیث رسول سے قرآن کے عموم میں تخصیص اس وقت جائز ہے جب کہ خاص حکم میں اس عام آیت سے بڑھ کر زیادہ حکمت، زیادہ مصلحت اور زیادہ دانائی پائی جائے۔ لیکن اس سلسلے میں پہلا سوال تو یہ ہے کہ یہ اصول کس نے بیان کیا ہے؟ اور اس کی بنیاد کیا ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ خود ساختہ

حکمت و مصلحت کی بنیاد پر اگر عموماتِ قرآن میں تخصیص کو جائز تسلیم کر لیا گیا تو اس سے احکام قرآن میں تبدیلی کا لامتناہی سلسلہ شروع نہیں ہو جائے گا؟ اس لیے ہمارے خیال میں عمومِ قرآن کی تخصیص کے لیے مولانائے محترم نے جو اصول بیان فرمایا ہے وہ صحیح نہیں۔ عمومِ قرآن کی تخصیص کے لیے شرعی دلائل ضروری ہیں۔ اگر شرعی دلائل سے قرآن کے کسی عموم کی تخصیص، کسی اجمال کی تفصیل اور کسی اطلاق کی تقیید ہوتی ہے تو وہ قابل تسلیم ہے۔ وہاں حکمت و مصلحت کی کمی بیشی کا موازنہ تو کجا، سرے سے حکمت و مصلحت ہی سمجھ میں نہ آئے، تب بھی دلائل شرعیہ پر مبنی تخصیص کے انکار کی گنجائش نہیں ہے اور دلائل شرعیہ میں سب سے اہم دلیل شرعی حدیث نبوی ﷺ ہے۔ حدیث نبوی سے بالخصوص جبکہ اس کے ساتھ آثارِ صحابہ اور اجماع امت بھی ہو۔ عموم قرآن کی تخصیص بالکل صحیح ہے۔

دراصل عموم قرآن کی تخصیص کا مسئلہ صدیوں سے مزلة الاقدام (قدموں کے ڈگمگانے کا باعث) چلا آ رہا ہے اور ہمیشہ لوگوں نے اسے اپنے ذہنی مفروضات یا فقہی تعصّبات کی روشنی میں دیکھا ہے اور اس سارے اصول کو ہمیشہ نظرانداز کیا ہے جو فکر محدثین پر مبنی ہے۔ جس کی وضاحت ابھی کی گئی ہے۔ کسی نے اپنے فقہی جمود کو برقرار رکھنے کے لیے کہا کہ خبر واحد سے عمومِ قرآن کی تخصیص جائز نہیں، لیکن کوئی اپنی ہی فقہی ضرورت پیش آئی تو حدیث ضعیف تک سے قرآنی عموم کی تخصیص کر ڈالی۔ کسی نے اپنے ذہنی مفروضات کے جوش اثبات میں خبر متواتر کو بھی خبر واحد باور کرانا چاہا، تاکہ خبر متواتر سے ثابت شدہ اس تخصیص قرآنی کا انکار کیا جا سکے۔ جو اس کے ذہنی مفروضے کے خلاف ہے۔ جیسا کہ حد رجم کے ضمن میں بعض "تدبر پسند" مفسرین نے کیا ہے۔ اسی طرح نصف دیت کی تخصیص سے جان چھڑانے کے لیے اب ایک نیا فلسفہ یہ تراشا گیا ہے کہ پہلے حکمت و مصلحت کی پیمائش کی جائے اور پھر دیکھا جائے کہ حکمت و مصلحت تخصیص میں زیادہ ہے یا تعمیم میں؟ لیکن اگر اس اصول کی صداقت تسلیم کر لی گئی، تو پھر بات نصف دیت تک ہی محدود نہیں رہے گی بلکہ اس کی زد میں بہت سے نصوص قرآنی بھی آ جائیں گے۔

۴۔ آخر میں مولانائے محترم نے علمائے کرام سے اپیل کی ہے کہ وہ عورتوں کے بارے میں "حرفیت پسندی" سے الگ ہو کر عورتوں کے حقوق و فرائض کے مسئلے کو وسیع تر انسانی بنیادوں پر حل کریں۔ ورنہ خطرہ ہے کہ ان کے طرز عمل سے عورتوں کے دلوں میں اسلام کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں۔ مولانا کا یہ بیان غلطی ہائے مضامین کا آئینہ دار ہے۔ اس میں:

اولاً: علمائے کرام کو علم و فہم سے عاری اور حکمت و دانش سے بے بہرہ باور کرایا گیا ہے۔

ثانیًا: عورتوں کے حقوق و فرائض کو حل طلب بتلایا گیا ہے۔

ثالثًا: حرفیت پسندی سے الگ ہو کر سوچنے کی دعوت دے کر نصوص شریعت میں تبدیلی کی گنجائش نکالی گئی ہے۔

رابعًا: عورتوں کے اندر غلط جذبات کی آبیاری کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہمارے خیال میں یہ سب باتیں مولانا کے علمی مقام سے فروتر ہیں۔ کاش وہ ایسی باتیں کرنے سے پہلے سوچ لیتے۔ چند علماء کے علم و فہم کو تو متہم کیا جا سکتا ہے' انہیں حکمت و دانش سے بے بہرہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے لیکن جہاں مسئلہ اجماع امت کا ہو یعنی اقلیت و اکثریت سے قطع نظر پوری امت کے علماء و فقہاء کا ہو' وہاں یہ بحث جچتی نہیں۔ یہاں پوری امت کے فقہاء کو بے دانش سمجھنے کی بجائے اگر آج کل کے چند متجددین کی دانش افرنگی ہی کو درخورِ اعتناء نہ سمجھا جائے تو زیادہ بہتر اور احوط و اسلم ہے' کیونکہ نبی ﷺ کی حدیث ہے:

«إِنَّ اللهَ لاَ يَجْمَعُ أُمَّتِي عَلٰى ضَلاَلَةٍ»(جامع الترمذي، الفتن، باب ماجاء في لزوم الجماعة، ح:٢١٦٧)

"میری امت کو اللہ تعالیٰ کسی گمراہی پر جمع نہیں کرے گا۔"

عورتوں کے حقوق و فرائض بھی آج سے چودہ سو سال پہلے متعین کر دیے گئے ہیں اور آج بھی جب تک عورت کو ان حقوق و فرائض کا پابند نہیں بنایا جائے گا' اصلاحِ احوال کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ اس لیے مسئلہ عورت کے حقوق و فرائض کا حل کرنا نہیں ہے

بلکہ اسے اس کے فرائض کا پابند بنانا اور اس کے مطابق عمل درآمد کرانا ہے۔

۳۔ حرفیت پسندی سے الگ ہو کر سوچنے کی دعوت دینا انتہائی گمراہی کا راستہ ہے۔ ایسے ہی لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ عورت کو نصف میراث کی بجائے مرد کے مساوی حصہ ملنا چاہیے۔ ایسے "اجتہاد" کے مقابلے وہ "حرفیت پسندی" قابل تعریف ہے جس میں نصوص شریعت سے انحراف نہ ہو۔

۴۔ جہاں تک اس اندیشے کا تعلق ہے کہ عورت کی نصف دیت پر اصرار کرنے کی وجہ سے عورتوں کے اندر اسلام کے خلاف شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں گے' تو یہ بات بھی غلط ہے کیونکہ چودہ سو سال سے اسلام میں عورت کا حصۂ میراث مرد کے حصۂ میراث سے نصف چلا آ رہا ہے۔ نصف دیت میں تو سرے سے عورت کی کوئی حق تلفی ہی نہیں ہے۔ خطأً عورت کے قتل کر دیے جانے کی صورت میں جو دیت ورثاء کو ملے گی' وہ اس کے والدین' بھائی یا خاوند وغیرہ ہی ہوں گے۔ عورت کا اس میں کیا نقصان ہے؟ یا اس کی بے حرمتی کا اس میں کیا پہلو ہے؟ اگر عورتوں کے اندر شکوک و شبہات پیدا ہو سکتے ہیں' تو مسئلہ میراث کی وجہ سے ہو سکتے ہیں۔ مسئلہ دیت کی وجہ سے نہیں۔ اور الحمد للہ مسلمان عورت کے اندر مسئلہ میراث کی وجہ سے آج تک اسلام کے خلاف شکوک و شبہات پیدا نہیں ہوئے۔ کیونکہ وہ سمجھتی ہے کہ اس میں جو حکمت و مصلحت ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ اب اگر کسی "انگریزی خواں" عورت کے اندر ایسے شبہات پیدا ہوتے ہیں' تو جو جواب مسئلہ میراث کے سلسلے میں دیا جائے گا نصف دیت کے سلسلے میں پیدا ہونے والے شبہے کا جواب بھی وہی ہو گا۔

ایک اشکال کا حل: مولانا کے خیالات پر ہم نے ضروری نقد کر دیا ہے تاہم گزشتہ بحث سے یہ اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ ہم نے نصف دیت کی حکمت و مصلحت یہ بیان کی ہے کہ چونکہ معاشی کفالت مرد کی ذمے داری ہے' عورت کی نہیں' اس لیے عورت کے قتل کیے جانے کی صورت میں خاندان اپنے کفیل سے محروم نہیں ہوتا' لیکن آج کل عورتیں بھی مردوں کی طرح معاشی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں۔ اس لیے نصف دیت

والی حکمت میں کوئی وزن باقی نہیں رہتا' لہٰذا اب عورت کی دیت بھی مرد کی دیت کے برابر ہونی چاہیے۔

اولاً : اس سلسلے میں پہلی گزارش تو یہ ہے کہ عورتوں کا مردوں کے دوش بدوش معاشی تگ و دو میں شریک ہونا صریحاً اسلام کے خلاف ہے۔ اسلام اس کو قطعاً پسند نہیں کرتا۔ اس لیے اس ایک خلاف اسلام اقدام کی وجہ سے اسلام' اپنے ایک مسلمہ اصول میں تبدیلی کیونکر گوارا کر سکتا ہے؟

ثانیًا : عورتوں کی اکثریت ملازمت شوق کے طور پر کرتی ہے۔ وہ اپنی معاشی ذمے داریوں کی وجہ سے ملازمت کرنے پر مجبور نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملازمت پیشہ خواتین کی اکثریت اونچی سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہے۔ جس کے پاس دولت کی پہلے ہی ریل پیل ہے اور وسائل زندگی کی فراوانی ہے۔ ان عورتوں کی آمدنیاں خاندان کی کفالت نہیں کرتیں' بلکہ ان کی آمدنی کا بیشتر حصہ ان کے نت نئے فیشنوں' بیش قیمت ملبوسات' سامانِ آرائش و زیبائش اور اسی قسم کے اللوں تللوں پر خرچ ہوتا ہے اور یہ ساری چیزیں معاشرے میں فساد اور بگاڑ کا باعث ہیں۔ اسلام اس کی حوصلہ افزائی کیونکر کر سکتا ہے؟

ثالثًا : عورتوں کا ایک حصہ ضرور ایسا ہے کہ فی الواقع وہ معاشی مجبوریوں کی وجہ سے ملازمت کرتا ہے اور وہ عورتیں اپنے خاندان کی کفیل ہیں۔ ایسی عورتوں کے بارے میں قاضی کو یہ اختیار دیا جا سکتا ہے کہ وہ نصف دیت کے علاوہ (حالات و ضروریات کے مطابق) مزید رقم بطور جرمانہ قاتل سے وصول کر کے اس خاندان کی دادرسی کرے جو اپنے کفیل سے محروم ہو گیا ہے' لیکن اسلام کا یہ اصول اپنی جگہ ناقابل تغیر ہے کہ چونکہ عورت معاشی ذمہ داریوں سے آزاد ہے اس لیے میراث اور دیت میں وہ مرد کے مساوی نہیں اور اسلام کا یہ اصول عورت کی تحقیر پر مبنی نہیں' بلکہ اس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے جس کی وضاحت گزشتہ سطور میں کی گئی ہے۔

<u>علمائے کرام کے بارے میں ایک غلط تاثر</u> : علاوہ ازیں علمائے کرام کو عورتوں سے کوئی کد نہیں ہے کہ ان کے بارے میں یہ تاثر صحیح ہو کہ وہ عورتوں کے معاشرتی رتبے کو گھٹانا

چاہتے ہیں' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش لانا چاہتے ہیں اور کامل مساوات مرد و زن کے قائل ہیں۔ اس کی بابت علمائے کرام پورے اخلاص اور دردمندی سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ راستہ سراسر اسلام کے خلاف ہی نہیں' بلکہ عورت کی اس عظمت و شرافت کے بھی منافی ہے جو اسلام کی رو سے اسے حاصل ہے۔ اسلام نے عورت کو گھر کی ملکہ بنایا ہے۔ مغربی ذہن نے اسے معاش کا کل پرزہ بنا دیا ہے۔ اسلام نے عورت کو چراغ خانہ بنایا ہے۔ مغرب نے اسے شمع محفل بنا دیا ہے۔ اسلام نے عورت کو صرف خاوند کا خدمت گزار بنایا ہے' لیکن مغرب نے اسے "ائر ہوسٹس" کی صورت میں "ریسپشن گرل" کی صورت میں "ماڈل گرل" کی صورت میں اور "ایکٹرس" کی صورت میں ہر ہوس ران کا خدمت گزار بنا دیا ہے۔

بہ بیں تفاوتِ راہ از کجا است تا بہ کجا

علماء کے نزدیک عورت کی عزت گھر کی ملکہ' چراغ خانہ اور صرف خاوند کی خدمت گزار ہونے کی صورت ہی میں ہے اور عورت معاشی دوڑ میں جس راہ پر چل نکلی ہے' وہ قطعاً اس کی عزت کا راستہ نہیں' بلکہ اس میں اس کی تحقیر ہی نہیں اسلام سے ایک گونہ بغاوت بھی ہے۔ علمائے کرام عورتوں کے اس باغیانہ رجحان اور غیر فطری طرز عمل کی حمایت کیونکر کر سکتے ہیں؟

-- ۱۴ --

عورت اور مسئلہ وراثت؟

مسلمان ممالک میں جب تک اسلام کی علمبرداری قائم رہی وہاں کبھی حقوق نسواں کا مسئلہ نہیں اٹھا' کیونکہ مسلمان اسلام کی ابدی تعلیمات اور ان کی حقانیت پر یقین کامل رکھتے تھے اور مملکت کا نظام اسلامی اصولوں پر استوار تھا۔ جس میں مرد و عورت کے الگ الگ دائرہ کار کا تعین تھا۔ جیسا کہ اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے چنانچہ اسلامی مملکتوں میں عورتوں کا دائرۂ عمل گھر کی چار دیواری تھا' وہ اس دائرے میں رہ کر امور خانہ داری سرانجام دیتیں' بچوں کی دیکھ بھال اور ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرتیں اور خاوند کی خدمت و اطاعت بجالاتیں۔ مرد گھر کی ان ذمے داریوں سے سبکدوش ہوتا اور پوری یکسوئی اور فراغ خاطر کے ساتھ بیرونی سرگرمیوں میں مصروف عمل رہتا۔ کسب معاش' امور جہانبانی' جہاد' سفارت کاری وغیرہ تمام معاملات مرد کے سپرد تھے۔ یوں زندگی کی گاڑی ان دونوں پہیوں سے بحسن و خوبی چل رہی تھی' کیونکہ دونوں کا وجود انسانی زندگی کے لیے' لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ دونوں کی مساعی اور تگ و تاز کا انسانیت کے ارتقاء میں برابر کا حصہ ہے۔ اس معاملے میں کوئی بھی کسی سے کمتر نہیں ہے۔ نہ انسانی و شہری حقوق میں اور نہ مملکت کے ارتقاء و عروج میں۔ تاہم دونوں کے مابین فطری صلاحیتوں میں جو فرق و تفاوت ہے' جو ایک مسلمہ امر ہے' اس کے پیش نظر تقسیم کار تھی' جس کو دونوں نے قبول کیا ہوا اور اپنایا ہوا تھا۔ یوں مرد و عورت ایک دوسرے کے حلیف تھے' حریف نہیں ایک دوسرے کے معاون تھے' رقیب نہیں' ایک دوسرے کے ہمدرد و غم گسار تھے' باہم دشمن نہیں۔

یہ تقسیم کار چونکہ فطری اور امر الٰہی کے مطابق تھی' اس لیے اس کی وجہ سے اندرونی طور پر بھی امن و استحکام تھا اور معاشرہ معاشرتی بگاڑ سے بہت حد تک محفوظ بھی۔ علاوہ ازیں بیرونی طور پر بھی مسلمانوں کا رعب اور دبدبہ قائم تھا' دشمن کو مسلمانوں کی طرف

آنکھ اٹھا کر دیکھنے کا حوصلہ اور یارا نہ تھا گویا اس تقسیم کار یعنی عورت کا اپنے دائرہ کار گھر تک محدود رہنے سے ملک کی داخلی پالیسیوں میں کوئی خرابی پیدا ہوئی ' نہ بین الاقوامی سطح پر کسی کمزوری کا مظاہرہ ہوا ' جس سے عملی طور پر یہ واضح ہو گیا کہ انسانی معاشروں کے لیے یہی پالیسی مفید ہے جو خود خالق کائنات نے انسانوں کے لیے پسند فرمائی ہے اسی سے ہی امن و استحکام مل سکتا ہے اور قومیں عروج و ترقی سے بھی اسی طرح ہم کنار ہو سکتی ہیں نہ کہ اس سے انحراف کر کے اور اس کے برعکس پالیسی اختیار کر کے۔

چنانچہ دیکھ لیجیے ' مغربی ملکوں نے اس فطری پالیسی سے انحراف کر کے عورت کو بھی گھر کی چاردیواری سے نکال کر دفتروں اور منڈیوں میں اور کارخانوں اور فیکٹریوں میں مردوں کے دوش بدوش لا کر کھڑا کر دیا ' تو ان کی صنعتی ترقی میں تو یقیناً کچھ تیزی آ گئی لیکن دو بڑے نقصان سے انہیں دو چار ہونا پڑا۔ ایک معاشرہ قلب و نظر کی پاکیزگی سے محروم ہو گیا اور جنسی ہوس اور شہوت رانی عام ہو گئی ۔ دوسرا ان کا خاندانی نظام تباہ ہو گیا اور یوں ان کی ساری ترقی و خوش حالی بے معنی ہو کر رہ گئی کیونکہ انسان ساری محنت اور تگ و دو صرف اس لیے کرتا ہے کہ اسے راحت و تسکین حاصل ہو اور یہ راحت اسے اس کی ماں کی آغوش فراہم کرتی ہے یا پھر جوان ہونے کے بعد وفاشعار اور اطاعت گزار بیوی کی محبت و الفت۔ صنعتی ترقی نے مغربی ملکوں میں آسائش و راحت کے اسباب و وسائل کی تو فراوانی کر دی ' لیکن گھروں سے تسکین و راحت کو ختم کر دیا ' کیونکہ محض اسباب راحت سے تو راحت اور وسائل آسائش سے تو آسائش حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان مغربی ملکوں میں ' جہاں وسائل آسائش کی فراوانی ہے ' خودکشی کی وارداتیں بھی عام ہیں اور خواب آور گولیوں کا استعمال بھی روزافزوں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ محض دولت کی ریل پیل اور وسائل کی فراوانی ہی سب کچھ نہیں۔ نہ اس سے امن و راحت ہی نصیب ہو سکتا ہے۔ امن و راحت اس اسلامی نظام ہی میں ہے جو اللہ نے انسانوں کے لیے تجویز کیا ہے۔ ﴿ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴾ (الرعد : ۲۸/۱۳) ”دلوں کو اطمینان اللہ کے ذکر ہی سے ملتا ہے۔“

مغربی ملکوں نے چونکہ اپنے آپ کو اس نظام سے محروم کر لیا ہے تو ہر طرح کی مادی و سائنسی ترقی کے باوجود وہ گھریلو امن و سکون سے محروم ہیں۔ اس لیے کہ اس نے گھر کی ملکہ کو ہر ایرے غیرے کی کنیز اور خادمہ بنا دیا ہے' شمع حرم کو شمع انجمن بنا دیا ہے اور تقدیس و عظمت کی اس چادر کو تار تار کر دیا ہے جو اللہ نے اسکے قامت زیبا کے لیے تجویز کی تھی۔ اب وہ گھر میں صرف خاوند کی مہر و محبت کا مرکز نہیں' بلکہ کلبوں میں' دفتروں میں اور بازاروں میں ہر بو الہوس کی ہوس ناک نگاہوں کا محور ہے۔ اب وہ صرف خاوند کے راحت کدے کے لیے مخصوص نہیں ہے' بلکہ اس کی آغوش محبت ہر شہوت ران کے لیے وا ہے۔ اب وہ صرف گھر کی زینت نہیں ہے' بلکہ اس کے جلوۂ حسن آراء سے ملک کے تمام بام و در روشن ہیں۔ یوں ایک نہایت بیش قیمت متاع کو' جسے پردے میں چھپا کر اور غیروں کی نظروں سے بچا کر رکھنے کی تاکید کی گئی تھی' مغرب نے اسے ایک شو پیس اور جنس بازار بنا کر رکھ دیا ہے۔ تقدیس و عصمت کے پیکر کو بے حیائی کا چلتا پھرتا اشتہار اور وفا کے پتلے کو جفا کا خوگر اور ہرجائی صفت بنا دیا گیا ہے۔ ﴿ فَاِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ﴾

بد قسمتی سے اسلامی ملکوں میں بھی' جب سے وہاں سے اسلام کی علمبرداری ختم ہوئی ہے' مغرب کی نقالی میں عورت کو گھروں سے باہر نکالنے کی اور مردوں کے دوش بدوش کھڑا کرنے کی مذموم مساعی کی جا رہی ہیں۔ ایک آدھ ملک کو چھوڑ کر تقریباً ہر اسلامی ملک میں مغرب زدگی کا یہ فتنہ عام ہے' کیونکہ ان پر مسلط حکمران طبقہ اور ان کے اعوان و انصار کے قلب و نظر کارگہ مغرب ہی کے ڈھلے ہوئے ہیں اس لیے انہیں اسلامی تہذیب و تمدن کے مقابلے میں مغرب کی حیا باختہ تہذیب زیادہ اچھی لگتی ہے اور اسلام کے عادلانہ نظام و قوانین کے مقابلے میں مغرب کے خود ساختہ قوانین زیادہ بھلے لگتے ہیں۔ سب سے پہلے اس شوخ چشمانہ جسارت کا ارتکاب ترکی کے آمر مطلق مصطفےٰ کمال پاشا نے کیا' اس شخص نے ۱۹۲۴ء میں نہ صرف اسلامی خلافت کا خاتمہ کیا' بلکہ اسلامی قوانین کی جگہ مغربی قوانین کو بہ زور نافذ کر دیا۔ جب سے وہاں آج تک اسی کافرانہ نظام کا غلبہ ہے اور اسے اس طرح تحفظ حاصل ہے کہ کسی حکومت کو اس سے انحراف کرنے کی اجازت نہیں ہے' بلکہ کوئی بھی

ذمے دار فرد کسی اسلامی شعار کو اختیار نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ اس کی ایک تازہ مثال مروہ نامی عورت ہے۔ یہ خاتونِ محترم ترکی پارلیمنٹ کی ممبر ہے۔ یہ سر پر سکارف باندھ کر پارلیمنٹ میں گئی' تو وہاں اس کے خلاف ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور اسے ترکی قانون سے غداری قرار دے کر اس خاتون کی نہ صرف رکنیت ختم کر دی گئی بلکہ اس کو وہاں کے شہری حقوق سے بھی محروم کر دیا گیا۔ مغرب کی نقالی میں یہ اس ترکی کا حال ہے جو کبھی اسلامی خلافت کا امین اور عالم اسلام کا محافظ اور پشتیبان تھا۔ آج وہ اپنے اس اسلامی اعزاز اور عالمی کردار سے محروم ہو کر اپنے ہی مسائل میں اس طرح الجھا ہوا ہے کہ کسی لحاظ سے بھی اسے اطمینان بخش نہیں کہا جا سکتا۔

<u>اسلام سے انحراف' اجتہاد نہیں ارتداد ہے</u>: بلندی اور عروج کے مقابلے میں یہ پستی اور زبوں حالی اس کا مقدر کیوں بنی؟ اس کا جواب صرف ایک ہی ہے' اسلام سے انحراف کے نتیجے میں' لیکن عام لوگوں کے فکر و نظر کی کجی کا یہ حال ہے کہ وہ ترکی کے اس انحراف کو قابل تقلید سمجھتے ہوئے دوسرے اسلامی ملکوں کو بھی اسلام کے معاملے میں وہی رویہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں جو ترکی نے اختیار کیا۔ حتیٰ کہ علامہ اقبال جیسے شخص نے بھی اپنے خطبات' تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ' کے ایک خطبے' الجہاد فی الاسلام' میں ترکی کے بعض اقدامات کی تحسین کی ہے' جس سے مغرب زدہ افراد کو مزید حوصلہ ملتا ہے۔ علامہ مرحوم کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے اسلام سے انحراف کو ''اجتہاد'' سے تعبیر کیا ہے' حالانکہ اسلامی قوانین کی بجائے مغربی قوانین کا اختیار کرنا' یہ ترکی کا اجتہاد نہیں' بلکہ انحراف و ارتداد ہے۔

<u>سندھ ہائی کورٹ کے جج کا ایک نہایت غلط فیصلہ</u>: اسی غلطی کا اعادہ سندھ ہائی کورٹ کے ایک جج شائق عثمانی نے اپنے ایک فیصلے میں کیا ہے اور عورت کے حصۂ وراثت کو مرد کے برابر کرنے کے لیے ''اجتہاد'' کی دعوت دی ہے۔ ان کا یہ فیصلہ انگریزی میں ہے' لیکن اس کے کچھ حصے کا اردو ترجمہ ایک ریٹائرڈ جج جناب جسٹس شفیع محمدی صاحب نے ہفت روزہ ''تکبیر'' کراچی میں ۲۲ اپریل ۱۹۹۸ء میں شائع کروایا ہے۔ اس میں یہ جج صاحب

فرماتے ہیں:

"بلاشبہ بچی کے حصے کا بچے کے حصے کے مقابلے میں آدھا ہونے کے متعلق قوانین کا اطلاق اس دعوے کی غلط تشریح کا نتیجہ ہے کہ یہ (قانون) ناقابل تبدیل ہے اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔ اصل میں یہ دعویٰ نتیجہ ہے مرد پرستی کے اس مزاج کا جو ہمارے سماج میں سرایت کر چکا ہے۔ ہمارے مذہب میں عورتوں کو آدھے حصے کی جو بات کی گئی ہے وہ اس کی کم سے کم حد قائم کرنے کے لیے ہے' زیادہ سے زیادہ کے لیے نہیں۔ اس لیے یہ ممکن ہے کہ کوئی اسلامی مملکت اجتہاد سے کام لے کر عورت کے حصے کو بڑھا دے۔ کم از کم ایک مسلم ملک یعنی ترکی تو ایسا ملک ہے جہاں وراثت میں بچیوں اور بچوں کے حصے برابر ہیں....."

اس میں جج موصوف نے پہلے تو چند مفروضے قائم کیے ہیں۔

① اسلام کے قانون وراثت کو ابدی (ہمیشہ رہنے والا) اور ناقابل تبدیل سمجھنے کا دعویٰ غلط تشریح کا نتیجہ ہے۔

② یہ دعویٰ مرد پرستی کا نتیجہ ہے۔

③ اسلام میں عورت کے آدھے حصے کی جو بات کی گئی ہے' وہ اس کی کم سے کم حد قائم کرنے کے لیے ہے' زیادہ سے زیادہ کے لیے نہیں۔

یہ تین مفروضے قائم کر کے وہ اس شوخ چشمانہ جسارت کا ارتکاب کرنے کی دعوت دیتے ہیں کہ اجتہاد کے ذریعے سے اس قانون کو تبدیل کر دیا جائے اور بطور مثال ترکی کا نام لیا ہے کہ اس نے یہ کام کر دکھایا ہے۔ گویا ترکی کی تحسین کر کے دوسرے اسلامی ملکوں کو بھی اس کافرانہ حرکت کا ارتکاب کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

ہمیں تعجب ہے کہ فاضل جج نے یہ مفروضے کس بنیاد پر قائم کیے ہیں؟ کیا ان مفروضوں کے لیے ان کے پاس کوئی دلیل ہے؟

ان کا پہلا مفروضہ یا واہمہ یہ ہے کہ عورت کا نصف حصہ اس غلط تشریح کا نتیجہ ہے کہ یہ قانون ناقابل تبدیل اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا یہ قانون

تبدیل ہو سکتا ہے' بلکہ ہونا چاہیے' کیونکہ اسلام کی صحیح تشریح کا نتیجہ یہی ہے۔ موصوف نے اپنے اس دعوے کے مضمرات پر غور نہیں کیا' ورنہ وہ کبھی یہ کھوکھلا دعویٰ نہ کرتے۔ اس دعوے کا صاف مطلب یہ ہے کہ چودہ سو سال میں جو ہزاروں' بلکہ لاکھوں علماء و فقہاء گزرے ہیں اور وہ اسلام کے قانون وراثت کو بالکل صحیح اور یکسر ناقابل تبدیل سمجھتے رہے ہیں' ان کا فہم اسلام ناقص اور ان کی تفسیر و تشریح قرآنی غلط ہے۔ اس کے برعکس آج کل کے مغرب زدہ مستغربین' جو قرآن کریم کو شاید دیکھ کر بھی صحیح پڑھنے پر قادر نہیں' کجا کہ وہ اس کو سمجھنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں' ان کا فہم قرآن صحیح اور ان کی تفسیر و تشریح معتبر ہے۔ گویا ع

مستند ہے ان کا فرمایا ہوا

اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ چودہ سو سال کے مفسرین و محققین اور علماء و فقہاء ہی کا فہم قرآن صحیح اور ان ہی کی توضیح و تشریح معتبر ہے ان کے مقابلے میں آج کے یہ متفکرین اسلام' جو عربی زبان اور قرآنی و حدیثی علوم سے یکسر نا آشنا ہیں' ان کا دعوائے فہم قرآن' محض ایک ادعاء ہے۔ یہ اسلام کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔ چودہ سو سال کے علماء و فقہاء کے مقابلے میں آج کل کے متجددین و متفکرین کو جاہل اور اسلام سے ناآشنائے محض تسلیم کر لینا زیادہ آسان بھی ہے اور قرین صواب بھی۔

(۲) ان کا دوسرا مفروضہ بھی براہ راست اللہ تعالیٰ کی ذات پر حملہ ہے' عورت کا نصف حصۂ وراثت اگر واقعی مرد پرستی کا نتیجہ ہے تو اس قانون کے واضع علماء و فقہاء نہیں' خود اللہ تعالیٰ ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کا یہ حکم حکمت و مصلحت کی بجائے کسی ایک جنس یا صنف کی بے جا طرفداری پر مبنی ہے؟ جیسا کہ موصوف کے دعوائے مرد پرستی سے یہی لازم آتا ہے تو اس کے بعد اللہ حکیم و عادل قرار پائے گا' یا ظالم و غیر حکیم؟ امت کے تمام فقہاء' علماء اور مفسرین اللہ تعالیٰ کو حکیم و عادل ہی مانتے آئے ہیں اور اللہ پر ایمان رکھنے کا تقاضا اور مطلب بھی یہی ہے' اس لیے اس کے ہر حکم اور قانون کو وہ عدل و انصاف کا آئینہ دار بھی سمجھتے رہے ہیں اور حکمت و مصلحت سے پُر بھی۔ چاہے وہ حکمت و مصلحت

انسانوں کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ کا زیر بحث قانون وراثت بھی حکمت و مصلحت سے پر ہے۔ ذرا سوچیے! اسلام نے عورت کو کسب معاش کی ذمے داریوں سے فارغ رکھا ہے' جس کا واضح مطلب یہی ہے کہ عورت کو تجارت و کاروبار کرنے کی ضرورت ہے' نہ فیکٹریوں اور دفتروں میں مردوں کے دوش بدوش ملازمت کرنے کی۔ یہ اور اس قسم کے دیگر تمام بیرونی کاموں کے ذمے دار صرف اور صرف مرد ہیں۔

جب واقعہ یہ ہے تو سرمائے اور دولت کی زیادہ ضرورت مرد کو ہے یا عورت کو؟ جس کو زیادہ ضرورت ہے' تو اس کی ضروریات کے پیش نظر اس کا حصہ بھی زیادہ مقرر کرنا عدل و انصاف اور حکمت کے مطابق ہے یا اس کے منافی؟ مرد و عورت کے درمیان جب نکاح کا سلسلہ قائم ہوتا ہے تو شادی کے اخراجات بھی اصل میں مرد ہی کی طرف سے ہوتے ہیں' ولیمہ کرنا بھی اس کی ذمے داری ہے' مہر کی ادائیگی بھی مرد ہی کا فریضہ ہے۔ علاوہ ازیں اور بھی جتنے اخراجات ہیں' ان سب کا کفیل صرف مرد ہی ہے' عورت نہیں۔ کسی بھی مرحلے میں عورت پر کوئی مالی ذمے داری نہیں۔ جب وہ بیٹی ہے تو والدین اس کے کفیل ہیں' والدین کی عدم موجودگی میں وہ بھائیوں کی بہن ہے' وہ بھائی ہی اس کے کفیل ہیں۔ میکے سے سسرال منتقل ہونے کے بعد وہ بیوی ہے' اب اس کا کفیل اس کا خاوند ہے۔ صاحب اولاد ہونے کے بعد وہ ماں کے درجے پر فائز ہو جاتی ہے اب خاوند کے ساتھ ساتھ جوان اولاد بھی اس کی کفیل ہے اور خاوند کی عدم موجودگی میں تو بالخصوص اولاد ہی ماں کے تمام اخراجات کی ذمے دار ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ اسلامی معاشرہ جس کی بنیاد اسلامی تعلیمات ہیں۔ اس میں دیکھ لیجیے' ہر مرحلے میں مالی ذمے داریوں کا تمام بوجھ صرف مرد پر ہے' عورت کسی بھی موقعے پر مال کمانے اور اسے خرچ کرنے کی مکلف نہیں ہے۔ جب ایسا ہے تو عورت کا نصف حصۂ میراث بھی دراصل اس کے احترام و وقار کو بحال کرنا ہے' کیونکہ اسلام سے قبل زمانہ جاہلیت میں عورت وراثت سے بالکل محروم تھی۔ اسلام ہی نے اسے وراثت میں حق دار قرار دے کر اس کی بے توقیری اور بے حیثیتی کو ختم کیا۔ اگر ذمے داریوں کے اعتبار سے وہ پوری وراثت کی حق دار ہوتی تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس کا حصۂ میراث بھی مرد کے برابر

ہی رکھتا' لیکن جب اللہ تعالیٰ نے خود ہی اسے تمام مالی ذمے داریوں سے اور بیرونی معاملات سے مستثنیٰ رکھا ہے تو یہ بات کس طرح عدل و انصاف کے مطابق ہوتی کہ اس کا حصہ میراث بھی اس مرد کے برابر ہوتا جس پر مالی ذمے داریوں کا تمام بوجھ ڈال دیا گیا ہے؟

(۳) موصوف کا تیسرا دعویٰ بھی یکسر بے بنیاد ہے' آخر قرآن کے کس لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ عورت کا آدھا حصہ کم از کم حد ہے؟ اگر یہ بات بالفرض صحیح تسلیم کر لی جائے' تو دوسرا سوال یہ ہے کہ پھر زیادہ سے زیادہ حد کیا ہو گی یا کیا ہونی چاہیے؟ اگر مرد کے برابر یا اس سے زیادہ مقرر کی جائے گی تو مرد بجاطور پر معترض ہوں گے کہ مالی معاملات کے تمام تر ذمے دار تو ہم ہیں پھر عورت کے لیے' جس پر سرے سے کوئی بوجھ ہی نہیں ہے' ہمارے برابر یا ہم سے بھی زیادہ حصہ کیوں رکھا گیا ہے؟ اس کا کوئی معقول جواب ان متجددین و متفکرین اسلام کے پاس ہے؟ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ اور اگر عورت کا حصہ مرد کے برابر یا اس سے زیادہ تو مقرر نہیں کیا جاتا' نصف سے تھوڑا بڑھا دیا جائے' تو کیا عورت پرستی کے مریض مطمئن ہو جائیں گے؟ ان کا اعتراض اور مطالبہ هَلْ مِنْ مَّزِيْد برقرار ہی رہے گا پھر اس کھکھیڑ سے' جس کو یہ متجددین اجتہاد کا نام دے رہے ہیں' کیا حاصل ہو گا؟

(۴) رہی بات اجتہاد کی اور اس کی دعوت کی' تو دراصل یہ لوگ اجتہاد کی حقیقت سے ہی بے خبر ہیں ورنہ اس دیدہ دلیری سے مسئلہ زیر بحث میں اجتہاد کی دعوت نہ دی جاتی۔ اجتہاد کا دروازہ یقیناً کھلا ہوا ہے۔ ہر دور میں اجتہاد ہوتا رہا ہے' آج بھی اجتہاد ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے۔ بہت سے مسائل آج بھی یقیناً دعوت اجتہاد دے رہے ہیں اور ان میں اجتہاد کی ضرورت ہے' لیکن یہ کون سے مسائل ہیں؟ منصوص مسائل نہیں' ان میں تو اجتہاد کی کوئی گنجائش ہی نہیں' کیونکہ منصوص مسائل میں بغیر چون و چرا کیے ایمان لانا اور ایمان رکھنا ضروری ہے۔ ان کی بابت اجتہاد کی دعوت دینا دراصل اسلام سے بغاوت اور کفر و ارتداد ہے۔ جسٹس موصوف نے بھی ایک منصوص اور متفق علیہ مسئلے میں اجتہاد کی دعوت دے کر کفر و ارتداد ہی کا ارتکاب کیا ہے' جس سے انہیں اگر وہ مسلمان رہنا اور اسلام ہی پر مرنا چاہتے ہیں' تو فوراً توبہ کرنی چاہیے۔

اجتہاد صرف ان مسائل میں ہوتا اور ہو سکتا ہے' جو غیر منصوص ہوں یا منصوص احکام کے انطباق و اطلاق کے بارے میں سوچ بچار ہو سکتا ہے۔ جس کی بابت کوئی صراحت قرآن و حدیث میں نہیں ہے' ماہرین شریعت اس کی بابت غور کریں گے کہ شریعت میں اس سے ملتا جلتا کوئی مسئلہ ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو علت و حکمت کے اعتبار سے اس کا انطباق اس پر ہو سکتا ہے یا نہیں؟ گویا شریعت کے دائرے اور اس کی حدود و قیود میں رہتے ہوئے نئے مسئلے کے حل کے لیے کوشش کرنے کا نام اجتہاد ہے' نہ کہ نص شریعت (کسی واضح حکم) کے بارے میں آزادانہ بحث یا نقد و نظر کی دعوت دینا۔ افسوس ہے کہ جسٹس موصوف نے اس دوسرے مفہوم کو ہی اجتہاد سمجھا ہے جو سرے سے اجتہاد ہی نہیں' بلکہ الحاد و ارتداد ہے۔

(۵) اسی طرح ترکی کے اقدام کو بطور مثال پیش کرنا بھی' ذہنی ارتداد ہی کا نتیجہ ہے' کیونکہ ترکی میں اگر عورت کا حصہ' وراثت مرد کے برابر ہے' تو انہوں نے یہ قانون اجتہاد کر کے نہیں بنایا ہے (کیونکہ اس میں اجتہاد ہو ہی نہیں سکتا) بلکہ اسلام سے انحراف و بغاوت کر کے بہ جبریہ قانون نافذ کیا ہے۔ اب جس کو اسلام سے انحراف و بغاوت محبوب ہے' وہ بصد شوق اسے مستحسن سمجھے' لیکن جسے اسلام عزیز ہے اور وہ مسلمان رہنا چاہتا ہے تو وہ کبھی ترکی کے اس اقدام بغاوت کو نظر تحسین سے نہیں دیکھے گا۔ چہ جائیکہ وہ اس کی تقلید کی دعوت عام دینے کی جسارت کرے۔

-- ۱۵ --

عورت اور مرد کی نماز کا فرق؟

مرد و عورت کی نماز میں تفریق اور امتیاز اگرچہ ہمارے نزدیک عورت کے امتیازی مسائل میں شامل نہیں۔ کیونکہ اس تفریق و امتیاز کی کوئی صحیح دلیل نہیں۔ لیکن چونکہ برادرانِ احناف نے مرد اور عورت کی نماز میں تفریق کر رکھی ہے' بنابریں اس کی اصل حیثیت کی وضاحت ہمارے نزدیک ضروری ہے' اس لیے ذیل میں اس کی بابت بھی چند گزارشات اور احناف کے دلائل پر کچھ تبصرہ درج ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے اس کے مطابق احناف نے تین مسئلوں میں عورتوں کا مردوں سے مختلف طریقۂ نماز بتلایا ہے۔

① رفع الیدین میں' کہ مرد کانوں تک تکبیر کے لیے ہاتھ اٹھائے اور عورت کاندھے تک۔

② عورت سینے پر ہاتھ باندھے اور مرد زیر ناف۔

③ عورت جب سجدہ کرے تو اپنا پیٹ رانوں سے چپکا لے جب کہ مرد کو حکم ہے کہ وہ اپنی رانیں پیٹ سے دور رکھے۔

امر اوّل کے متعلق ہماری نظر سے کوئی منقول دلیل نہیں گزری' جس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ احناف کے پاس اپنے اس موقف کے اثبات کے لیے سوائے قیاس کے کوئی دلیل نہیں ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

«لَمْ يَرِدْ مَا يَدُلُّ عَلَى التَّفْرِقَةِ فِي الرَّفْعِ بَيْنَ الرَّجُلِ وَالْمَرْأَةِ، وَعَنِ الْحَنَفِيَّةِ يَرْفَعُ الرَّجُلُ إِلَى الأُذُنَيْنِ وَالْمَرْأَةُ إِلَى الْمَنْكِبَيْنِ لأَنَّهُ أَسْتَرُلَهَا»(فتح الباري، الأذان: ٢/ ٢٨٧)

یعنی "حنفیہ جو کہتے ہیں کہ مرد ہاتھ کانوں تک اٹھائے اور عورت کندھوں تک' اس لیے کہ اس میں عورت کے لیے زیادہ ستر (پردہ) ہے۔ مرد و عورت کے درمیان فرق کرنے کا یہ حکم کسی حدیث میں وارد نہیں ہے۔"

اور امام شوکانی لکھتے ہیں:

«وَاعْلَمْ! أَنَّ هٰذِهِ الْسُّنَّةُ تَشْتَرِكُ فِيهَا الرِّجَالُ وَالنِّسَاءُ، وَلَمْ يَرِدْ مَا يَدُلُّ عَلَى الْفَرْقِ بَيْنَهُمَا فِيهَا، وَكَذَا لَمْ يَرِدْ مَا يَدُلُّ عَلَى الْفَرْقِ بَيْنَ الرَّجُلِ وَالْمَرْأَةِ فِي مِقْدَارِ الرَّفْعِ، وَرُوِيَ عَنِ الْحَنَفِيَّةِ أَنَّ الرَّجُلَ يَرْفَعُ إِلَى الأُذُنَيْنِ، وَالْمَرْأَةُ إِلَى الْمَنْكِبَيْنِ لأَنَّهُ أَسْتَرُلَهَا، وَلاَ دَلِيلَ عَلَى ذٰلِكَ كَمَا عَرَفْتَ»(نيل الأوطار، باب رفع اليدين وبيان صفته مواضعه: ۲/۲۰۶)

یعنی ''یہ رفع الیدین ایسی سنت ہے جو مرد و عورت دونوں کے لیے یکساں ہے' اس کی بابت دونوں کے درمیان فرق کرنے کا کوئی حکم نہیں ہے۔ اسی طرح مقدار رفع میں بھی فرق کرنے کی کوئی صراحت منقول نہیں ہے جیسا کہ حنفیہ کا مذہب ہے کہ مرد ہاتھ کانوں تک اٹھائے اور عورت کندھوں تک۔ حنفیہ کے اس مذہب کی کوئی دلیل نہیں ہے۔''

۲- ہاتھ باندھنے میں احناف مرد و عورت کے درمیان جو تفریق کرتے ہیں' اس کی بھی کوئی دلیل ہمارے علم میں نہیں۔ یہ بھی اس امر کی بین شہادت ہے کہ احناف کے پاس اپنے اس موقف کے اثبات کے لیے بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس لیے احادیث صحیحہ کی رُو سے مرد و عورت دونوں کے لیے یہی حکم ہے کہ وہ نماز میں سینے پر ہاتھ باندھیں۔

مولانا یوسف لدھیانوی مرحوم نے اپنی کتاب ''اختلاف امت اور صراط مستقیم'' میں سارا زور تیسرے فرق کے اثبات پر لگایا ہے۔ کیونکہ اس مسئلے میں ان کے پاس ایک مرسل روایت اور بعض ضعیف آثار ہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ مرسل روایت محدثین اور علمائے محققین کے نزدیک قابل حجت ہی نہیں۔ علاوہ ازیں یہ مرسل روایت بھی منقطع ہے اور اس میں ایک راوی (سالم) متروک ہے۔ (ملاحظہ ہو:الجوھر النقی' تحت السنن الکبریٰ' بیھقی' ج ۲)

اس مرسل و منقطع روایت کے علاوہ مدیر ''بینات'' نے کنزالعمال کی ایک روایت بیہقی اور ابن عدی کے حوالے سے بروایت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نقل کی ہے کہ ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کا ارشاد ہے' عورت جب سجدہ کرے تو اپنا پیٹ رانوں سے چپکا لے۔ ایسے طور پر کہ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ پردے کا موجب ہو۔" (ص: ۹۰-۹۱)

یہ روایت سنن بیہقی میں موجود ہے لیکن موصوف نے یہ روایت سنن بیہقی کی بجائے کنزالعمال کے حوالے سے نقل کی ہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ سنن بیہقی میں اس کی سند بھی موجود ہے اور اس کی بابت امام بیہقی کی یہ صراحت بھی ہے کہ "اس جیسی (ضعیف) روایت کے ساتھ استدلال نہیں کیا جاسکتا۔" (ملاحظہ ہو' سنن بیہقی' ج:۲' ص: ۲۲۲-۲۲۳)

بہرحال ارکانِ نماز میں مرد و عورت کے درمیان شریعت اسلامیہ نے کوئی فرق و امتیاز نہیں کیا۔ بلکہ ایک عام حکم دیا ہے ((صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ)) (صحیح بخاری) "تم نماز اس طرح پڑھو جیسے تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔" اس حکم میں مرد و عورت دونوں شامل ہیں جب تک کہ کسی واضح نص سے عورتوں کی بابت مختلف حکم ثابت نہ کر دیا جائے۔ جیسے عورت کے لیے ایک خاص حکم یہ ہے کہ وہ اوڑھنی (پردے) کے بغیر نماز نہ پڑھے' اسی طرح حکم ہے باجماعت نماز پڑھنے کی صورت میں اس کی صفیں مردوں سے آگے نہیں' بلکہ پیچھے ہوں۔ اگر نماز کی ہیئت اور ارکان کی ادائیگی میں بھی فرق ہوتا تو شریعت میں اس کی بھی وضاحت کر دی جاتی۔ اور جب ایسی صراحت نہیں ہے تو اس کا صاف مطلب ہے کہ مرد اور عورت کی نماز میں تفریق کا کوئی جواز نہیں۔

عورت کی امامت کا مسئلہ : اسی طرح ایک فرق آثارِ صحابہ سے یہ بھی ثابت ہے کہ عورت عورتوں کی امامت کرائے' تو وہ مرد امام کی طرح صفوں سے آگے کھڑی نہ ہو بلکہ اگلی صف میں درمیان میں کھڑی ہو' تاہم کسی حدیث میں اس کی بابت کوئی وضاحت نہیں۔ اسی لیے امام ابن حزم نے کہا کہ چونکہ عورت کے صف کے آگے کھڑے ہونے کی بابت ممانعت کی کوئی دلیل نہیں' اس لیے وہ آگے کھڑے ہو کر بھی نماز پڑھ سکتی ہے۔ (المحلّٰی)

لیکن ہمارے خیال میں زیادہ صحیح یہی ہے کہ جب صحابہ کے آثار اور بعض ازواج مطہرات کے عمل سے یہ ثابت ہے کہ امامت کے وقت عورت صف کے درمیان کھڑی ہو' تو اس کے مطابق عمل کرنا زیادہ بہتر ہے۔ بہرحال یہ آثار حسب ذیل ہیں۔

ریطہ حنفیہ رحمہا اللہ بیان کرتی ہیں:

«أَنَّ عَائِشَةَ أَمَّتْهُنَّ وَقَامَتْ بَيْنَهُنَّ فِي صَلَاةٍ مَكْتُوبَةٍ»(مصنف عبدالرزاق، الصلاة، باب المرأة تؤم النساء: ٣/ ١٤١)

"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرض نمازوں میں عورتوں کی امامت کے فرائض انجام دیے اور وہ ان کے درمیان کھڑی ہوئیں۔"

تمیمہ بنت سلمہ بیان فرماتی ہیں:

«أَنَّهَا أَمَّتِ النِّسَاءَ فِي صَلٰوةِ الْمَغْرِبِ، فَقَامَتْ وَسْطَهُنَّ، وَجَهَرَتْ بِالْقِرَاءَةِ» (المحلى لابن حزم: ٤/ ٢١٩)

"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے مغرب کی نماز میں عورتوں کی امامت کے فرائض انجام دیے' پس عورتوں کے درمیان کھڑی ہوئیں اور جہری (بلند آواز سے) قراءت فرمائی۔"

ام حسن سے مروی ہے:

«أَنَّهَا رَأَتْ أُمَّ سَلَمَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ تَؤُمُّ النِّسَاءَ، تَقُومُ مَعَهُنَّ فِي الصَّفِّ» (مصنف ابن أبي شيبة، الصلوات، باب المرأة تؤم النساء: ١/ ٤٣٠، ح: ٤٩٥٣)

"انہوں نے دیکھا کہ ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عورتوں کی امامت کے فرائض انجام دیے اور وہ ان کے ساتھ صف ہی میں کھڑی ہوئیں۔"

امام ابن حزم رحمہ اللہ اس روایت کے متعلق فرماتے ہیں:

«هِيَ خَيْرَةٌ، ثِقَةُ الثِّقَاتِ ـ وَهٰذَا إِسْنَادٌ كَالذَّهَبِ»(المحلى لابن حزم: ٤/ ٢٢٠)

"یہ بہترین سند ہے' اس کے سب راوی انتہائی ثقہ ہیں' یہ سند کیا ہے سونے کی ایک لڑی ہے۔" حجیرة بنت حصین فرماتی ہیں:

«أَمَّتْنَا أُمُّ سَلَمَةَ فِي صَلٰوةِ الْعَصْرِ قَامَتْ بَيْنَنَا»(مصنف عبدالرزاق، الصلاة، باب المرأة تؤم النساء: ٣/ ١٤٠، ح: ٥٠٨٢ ومصنف ابن أبي شيبة،

خواتینِ اسلام سے اسلام کا مطالبہ

اِسلام نے پہلی مرتبہ عورت کو وہ مقام' مرتبہ اور حقوق عطا کیے جن کا اس سے پہلے تصور بھی نہ تھا۔ نبی کریم ﷺ نے عورتوں کی تربیت کا ایک مکمل ضابطہ حیات پیش کیا جس کے مطابق وہ اگر شوہر کی خدمت' اس کے مال کی حفاظت اور اولاد کی صالح تربیت کریں تو جنت کے جس دروازے سے چاہیں داخل ہو سکتی ہیں۔ عورتوں کے لیے کتاب و سنت کی جامع تعلیمات کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔

- ہر دین کا ایک امتیازی وصف ہوتا ہے، اِسلام کا امتیازی وصف حیا ہے، اسے اختیار کیجیے۔ (مؤطا امام مالک ص ۹۰۵)
- نگاہوں کی پاکیزگی، شرمگاہوں کی حفاظت اور سامانِ زینت کے اظہار سے بچاؤ کا سلیقہ اختیار کیجیے۔ (النور ۳۱)
- غیر محرموں پر اپنی زیب و زینت کی چیزوں کا اظہار نہ ہونے دیں حتیٰ کہ زیورات کی جھنکار بھی اُن تک نہ پہنچے۔ (النور، ۳۱)
- عورت کا خوشبو لگا کر گھر سے باہر نکلنا بدکاری ہے اور باریک لباس پہن کر نکلنا عریانی اور دعوتِ گناہ ہے اس سے اجتناب کیجیے۔ (جامع ترمذی: ۲۷۸۶، صحیح مسلم، ۲۱۲۸)
- اجنبی اور غیر محرم مردوں سے گفتگو کے وقت اپنے لب و لہجہ میں نرمی اور نزاکت پیدا نہ کریں۔ (الاحزاب ۳۲)
- ایسے رستوں سے نہ گزریں جہاں مردوں کی ریل پیل ہو بلکہ کنارے کنارے چلتے ہوئے راستہ طے کریں۔ (سنن ابی داود، ۵۲۷۲)
- کسی غیر محرم مرد حتیٰ کہ جیٹھ اور دیور وغیرہ کے ساتھ بھی تنہائی میں میل جول اور سفر سے اجتناب کیجیے۔ (صحیح بخاری، ۵۲۳۲)
- نبی کریم ﷺ نے بازار کو بدترین جگہ قرار دیا ہے' اس لیے بلاضرورت ان کا رُخ کرنے کے بجائے اپنے گھروں کے محفوظ قلعے میں رہنا چاہیے۔ (موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان، ۳۲۴-۳۲۹)
- مخلوط محافل اور مخلوط تعلیم سے اجتناب کیجیے۔ (صحیح بخاری، ۹۷۹، ۹۸۰)
- کسی غیر عورت کی پوشیدہ صفت اپنے شوہر سے بیان نہ کریں۔ (صحیح بخاری، ۵۲۴۰)
- کسی غیر محرم کے ساتھ سفر نہ کریں، خواہ یہ سفرِ حج ہی کیوں نہ ہو۔ (صحیح بخاری، ۱۸۶۲)
- نماز ادا کریں، رمضان کے روزے رکھیں اور اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کریں۔ (مسند احمد ۱/۱۹۱)
- اپنے بچوں کو سات سال کی عمر میں نماز کی ترغیب دیں اور دس سال کی عمر میں سختی سے عمل کرائیں۔ (سنن ابی داود، ۴۹۵)
- ہر مرد کی طرح عورت کو بھی قیامت کے دن اپنا حساب خود پیش کرنا ہے لہٰذا اس کی تیاری کیجیے۔ (صحیح بخاری، ۲۷۵۳)

معزز خواتینِ اسلام: دین و شریعت کے یہ وہ کم سے کم مطالبات ہیں جو کتاب و سنت میں ملتے ہیں۔ ان پر عمل سے آپ جنت کی حقدار قرار پائیں گی۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے آپ ہر روز کچھ وقت قرآنِ مجید کی تلاوت' احادیثِ نبوی اور دینی لٹریچر کے مطالعہ پر صرف کریں تاکہ آپ کا گھریلو ماحول دینی رنگ سے ہم آہنگ ہو جائے۔ اتباعِ رسول کے تقاضے پورے ہوں اور آپ کا گھرانہ اسلامی معاشرت کا مکمل نمونہ بن جائے اور آپ کی زندگی حقیقی کامیابی سے ہمکنار ہو سکے۔

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (۱۸۵)

"پس جس شخص کو آگ سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا' یقیناً وہ کامیاب ہو گیا اور دُنیا کی زندگی تو صرف دھوکے کا سامان ہے"

دارالسلام کتاب و سنّت کی اشاعت کا عالمی ادارہ

حقوق نسواں اور عورتوں کی مظلومیت کی دہائی اکیسویں صدی کی دہلیز پر بھی نمایاں سنائی دے رہی ہے۔ ہر آنے والی صدی عورتوں کی عزت، وقار اور شرف کی کمی کا رونا روتی ہے مگر اس صورت حالات کا علاج کسی کے پاس نہیں ہے۔ تہذیب جدید عورت کو گھر کے آنگن سے نکال کر بازاروں میں گھسیٹ لائی ہے اور اس پر توقع رکھتی ہے کہ اس کی عزت اور شرف کو بحال کیا جائے۔

چودہ صدیاں پہلے خاتم النبیین ﷺ نے عورتوں کے حقوق اور شرف کے تحفظ کا جو چارٹر عطا کیا، اس کے بغیر ہم ان کے سماجی اور معاشرتی رتبے میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ شریعت نے عورتوں کی صنفی اور معاشرتی حیثیت کے لحاظ سے ان کے امتیازی مسائل کو بیان کیا ہے، جس میں بہت سی حکمتیں اور فوائد شامل ہیں۔ عبادت، وراثت، شہادت اور نکاح وطلاق کے علاوہ دیگر مسائل پر عورتوں کے امتیازی حقوق کے سلسلے میں ممتاز دینی مفکر حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ نے ایک تحقیقی کاوش پیش کی ہے جس کے مطالعہ و عمل سے ہم بنتِ حوا کو وہ آبرومندانہ مقام دلوا سکتے ہیں جس سے تہذیب مغرب کی کوکھ بانجھ ہو چکی ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ جہاں ایک طرف اسلام کے معاشرتی نظام میں عورت کی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے وہاں دوسری طرف ان مسائل پر شریعت کی حکمت وبصیرت کو بھی واضح کرتا ہے۔ دار السلام نے اس اہم موضوع پر ایک معیاری کتاب کو بہترین اسلوب طباعت سے آراستہ کیا ہے۔